

اپنے دل کی بھڑک دے کے دو

راجندرنگ ہبیدی

PDFBOOKSFREE.ORG

مکتبہ جامعہ دہلی  
کتاب جانئی دھلی

لپنے دکھ بھٹھے دے در

اپنے دکھ نہیں دے دو

راجندر سنگھ پری

کتابخانے دہلی  
مکتبہ معاشر میثلا

© راجندر سگھپیدی

صلوٰ فتر

مکتبہ جامعہ لمبیڈ  
جامعہ نگر، نئی دہلی

شاخ

مکتبہ جامعہ لمبیڈ  
پرنس بلنگ  
میٹی

شاخ

مکتبہ جامعہ لمبیڈ  
اُردو بازار  
دہلی

شاخ

مکتبہ جامعہ لمبیڈ  
یونیورسٹی مارکیٹ - علی گڑھ

مارچ ۱۹۷۴ء

بارہ سوم

جمال پرنگ پرنس دہلی

## فہرست

۹	لا جو نتی
۲۵	جو گیا
۳۷	بیبل
۸۵	لبی لڑکی
۱۲۱	اپنے دکھ بھئے دو
۱۵۷	ٹرمینس سے پرے
۱۸۶	حجام اللہ آباد کے
۲۱۳	دیوالہ
۲۳۹	یو کلپیں

# آل احمد سرور کے نام

# لا جونتی

"ہتھ لائیاں کمالان فی لا جونتی دے سے بو شے .....

(یہ چھٹی مولیٰ کے پردے سے ہیں ری ہاتھ بھی لگاؤ تکہ ملا جاتے ہیں،  
ایک پنجابی گیت)

بُو ارہ ہوا اور بے شمار زخمی و گوں نے آنکھ کر اپنے ہدن پر سے خون پوچھہ ڈالا اور پھر  
سب مل کمان کی طرف متوجہ ہو گئے جن کے پلن صحیح و سالم تھے، لیکن دل نہیں .....  
گھلی گھلی محلے محلے میں "پھر بساد" کیشیاں بن گئی تھیں اور شروع شروع میں بڑی مندی  
کے ساتھ "کار دبار میں بساد" "زمین پر بساد" اور "گھروں میں بساد" پر گرام شروع کر دیا  
گیا تھا لیکن ایک پر گرام ایسا تھا جس کی طرف کسی نے توجہ نہ دی تھی۔ وہ پر گرام مغورہ  
خور توں کے سلسلے میں تھا جس کا سلوگن تھا "دل میں بساد" اور اس پر گرام کی نمائش باوا  
کے مندر اور اس کے سپاس پاس بنتے والے قدامت پرند طبیقے کی طرف سے بڑی مخالفت  
ہوتی تھی —

اس پر گرام کو حرکت میں لانا نہ کہ لیے مندر کے سپاس محلے "ملہ شکور" میں ایک

کمیٹی قائم ہو گئی اور گیارہ دوڑوں کی اکثریت سے سندر لال بابو کو اس کا سکرٹری چن لیا گیا۔ دیل صاحب صدر چکی کلاں کا بڑھا محروم اور محتسب کے دوسرے معترضوں کا خیال تھا کہ سندر لال سے زیادہ جانفشنافی کے ساتھ اس کا مام کو کوئی افادہ نہ کر سکے گا۔ شاید اس ہے کہ سندر لال کی اپنی بیوی اغوا ہر چکی تھی اور اس کا نام تھا بھی لا جو — لاجونتی۔

چنانچہ پہ بھاٹ پھیری نکالتے ہوئے جب مندر لال پابو، اس کا ساتھی رسالواور  
نیکی رام دغیرہ مل کر گاتے —— ”ہتھ لا سیاں کھلانی لاجونتی دے بولے .....“  
تو مندے لال کی آغاز ایک دم بند ہو جاتی اور وہ خاموشی کے ساتھ چلتے چلتے لاجونتی کی بابت  
سوچتا —— جلنے والے کہاں ہو گئی، کس حال میں ہو گئی، ہماری باہت کیا صورج رہی ہو گئی،  
وہ کبھی آئے گی بھی یا نہیں؟ ..... اور تھیریلے فرش پر چلتے چلتے اس کے قدم لایا کھانے  
لگتے۔

ہوراب تو بہل تک نوبت آگئی تھی کہ اس نے لا جونتی کے بارے میں سوچنا ہی چھڑ دیا تھا۔ اس کا غم اب دنیا کا غم ہو چکا تھا۔ اس نے اپنے دکھ سنبھلنے کیلئے لک سیوا میں الجھنے آپ کو غرق کر دیا۔ اس کے باوجود دوسرے ساتھیوں کی آواز میں آداز ملا تے ہوئے اسے یہ خیال ضرور آتا — انسانی ملکتنا نازک ہوتا ہے۔ فنا سی ہات پر اسے ٹھیس گکھ سکتی ہے۔ وہ لا جونتی کے پودے کی طرح ہے، جس کی طرف ہاتھ بھی بڑھاو تو کہہ لا جاتا ہے لیکن اس نے اپنی لا جونتی کے ساتھ بدسلوکی کرنے میں کوئی بھی کسر نہ اٹھا کر تھی۔ وہ اسے جگہ بے جگہ اٹھنے مہجھنے، کھانے کی طرف ہے تو جوی برتنے اور ایسی ہی معاملہ مسمول بالوں پر سپٹ دیا کرتا تھا۔

اور لا جو ایک پہلی شہتوں کی ڈالی کی طرح نازک سی دیہلتی لڑکی تھی۔ زیادہ دھوپ دیکھنے کی وجہ سے اس کارنگ سنوا لچکا تھا۔ طبیعت میں ایک عجیب طرح کی بے قراری تھی مُس کا امندر ارشبیم کے اس قطرے کی طرح تھا جو پارہ کراس کے بڑے سے بڑے

اور یہ بھاٹ پھری کے سکے اسی ہی باتیں سنداں کو یاد آئیں اور وہ ہی سوچتا۔

ایک ہار، صرف ایک بار لا جو مل جائے تو میں اسے سچ مجھ ہی عمل میں بسالیں اور لوگوں

کو بتا دل — ان بیچاری عورتوں کے اغوا ہو جانے میں ان کا کوئی قصر نہیں۔ فسادوں کی ہوسنا کیوں کا خکار برو جانے میں ان کی کوئی غلطی نہیں۔ وہ سماج جو ان معصوم اور بے تصور عورتوں کو قبول نہیں کرتا، انھیں اپنا نہیں لیتا — ایک گھاٹر میں سماج ہے اور اسے ختم کر دینا چاہیے ..... وہ ان عورتوں کو گھوول میں آباد کرنے کی تلعثیں کرتا اور انھیں ایسا مرتبہ دینے کی پری ہاگر تا جو گھر میں کسی بھی عورت، کسی بھی ماں، بیٹی، بھی طابیوی کو دیا جاتا ہے۔ پھر وہ کہتا — انھیں اخراجے اور کنائے سے بھی ایسی باتوں کی یاد نہیں دلانی جسے ہے جو ان کے ساتھ ہو میں — کیوں کہ ان کے دل رحمی ہیں۔ وہ نازک ہیں، چھوٹی معلقی کی طرح — ہاتھ بھی لگاڑ کر کہدا جائیں گے ..... حکومی دل میں بساو! پر گرام کو عملی جامہ پہنانے کے لیے سختہ ملا شکور کی اس کمیٹی نے کتنی پر بھات پھیر لائیں۔ صحیح چار پاؤں بجھے کا وقت ان کے لیے موز دل ترین وقت ہوتا تھا۔ نہ لوگوں کا شوز نہ ٹریفک کی وجہ میں۔ رات بھر چوکیداری کرنے والے گتے تک بجھے ہو شے تو رو دل میں سردی کر پڑے کہ ہوتے تھے۔ اپنے اپنے بستروں میں دبکے ہو شے دوگ پر بھات پھیری والوں کی آوازیں کو صرف اتنا کہتے — اد اد ہی منڈلی بندھا! اور پھر بھی صبر اور کبھی تنک مزاجی سے وہ پیسوں۔ لال کا پر و پیگنڈا اتنا کرتے۔ وہ عورتیں بوبڑی محفوظ اس پار پہنچ گئی تھیں گو بھی کے بھولوں کی طرح پیسلی پڑی رہتیں اور ان کے خاوند ان کے بھلوں میں ڈھنھلوں کی طرح اکرے پڑے پڑے پر بھات پھیری کے شور پر احتیاج کرتے ہوئے سمجھ میں کچھ منہنے تے چلے جاتے۔ یا کہیں کوئی بچہ مٹھی دیر کے لئے آنکھیں کھولتا اور ”دل میں بساو“ کے فریادی اور اندر مگریں پر و پیگنڈے کے کو صرف ایک گانا سمجھو کے پھر سو جاتا۔

لیکن صحیح کے سے کان میں پڑا ہوا شبہ بکار نہیں جاتا۔ وہ سارا دن ایک تکرار کے ساتھ دلخیزی میں چل رکھتا رہتا ہے اور بعض وقت توانی اس کے معنی کو بھی نہیں سمجھتا۔

پر گنگنا آچلا جاتا ہے۔ اسی آواز کے گھر کر جنسکی بد دلت ہی تھا کہ انھیں دلوں جبکہ مس  
مر و لاسارا بھا اور ہند اور پاکستان کے درمیان انفو اشندہ عورتیں تباہی میں لا ایں تو محلہ  
ملائشکوں کے پہ آئی انھیں بھر سے بات کے لئے تیار ہو گئے۔ ان کے دریٹ شہر سے  
باہر چوڑا، ٹالا پر الحکیمیں ملنے کے لیے گئے۔ مغوریہ عورتیں اور ان کے لا اخفين کچھ دیرے  
اکہ مدرسے کو زمینتند ہے اور بھر رکھہ کا ہے اپنے اپنے برباد گھروں کو بھر سے آباد  
رہنے کے کام پر چل دیتے۔ رمالا اور نیکی رام اور سندھ لال باہر کجھی ہندو شنگھ زندہ باد اور  
کجھی سوہن لال نفعہ باد کے لعے سے لگاتے ..... اور وہ لعرے لگاتے رہتے  
 حتیٰ کہ ان کے گھر سے کہ گئے ..... .

لیکن مغوریہ عورتوں میں ایسی بھی نکتیں جن کے شوہر دل جتن کے ماں باپ بہن  
اور بھائیوں نے انھیں پہچانتے سے انکار کر دیا تھا۔ آخر دہ مرکیل نہ گئیں؟ اپنی عفست اور  
عذمت کو پہچانے کے لیے انھوں نے زیر کیں نہ کھالیا؟ کنڈیں میں حپلانگ کیوں نہ لکھا  
دی؟ دہ بزرگ تھیں جو اس طرح دنگ سے بھی ہوئی تھیں۔ سینکڑوں ہزاروں عورتوں نے  
پی صحت لئی جانے سے پہلے اپنی جان دی۔ لیکن انھیں کیا پتا کہ دہ زندہ رہ کر  
کس بہادری سے کام لے رہی ہیں۔ کیسے پھر اُنیں آنکھوں سے موت کو گھوڑہ بنی  
ہیں۔ ایسی دنیا میں جہاں ان کے شوہر تک انھیں نہیں پہچانتے۔ پھر ان میں سے کوئی  
جو بھی میں اپنا نام دہرائی — سہاگ و نتی — سہاگ سادایی .....  
اور اپنے بھائی کو اس قسم غیر میں دیکھ کر آخری بار اتنا کہتی ..... تو بھی مجھے نہیں پہچانتا  
بھاری؛ میں نے تجھے گوئی کھلایا تھا رے ..... اور بہادری چلادیا چاہتا۔  
پھر وہ ماں باپ کی طرف دیکھتا اور ماں باپ اپنے جگر پر اتھر کہ کے نارائن بابا کی طرف  
دیکھتے اور نہایت بے اسی کے عالم میں نارائن بابا آسمان کی طرف دیکھتا جو درصل کل  
حقیقت نہیں رکھتا اور جو صرف بھاری نظر کا دھر کا ہے۔ جو صرف ایک حد ہے جس کے

پارہ کاری نکالا ہیں کام نہیں کرتیں۔

لیکن فوجی ٹرک میں مس سارا بھائی تباہ لے میں جو عورتیں لا میں ان میں لا جو نہ تھیں۔ سند رلال نے امید دیجیں سے آخی لڑکی کو ٹرک سے بچانے اترتے دیکھا اور پھر اس نے ٹری خاموشی اور بڑے عزم سے اپنی کمیٹی کی نیکر میول کو درجند کر دیا۔ اب وہ صرف صحیح کے سے ہی پر بھاجات پھیری کے لیے نہیں نکلتے تھے بلکہ شام کو بھی جلوس نکالنے لگتے اور کبھی کبھی ایک آدھہ پھر ٹا اسٹر جلسہ بھی کرنے لگے جس میں کمیٹی کا بولٹھا صد و کیل کا لکا پر شاد صوفی کمنکاروں سے ملن جلی ایک تقریر کر دیا کرتا اور رسالو ایک پیکدان لے ڈیا۔ لیکن پہ سہیشہ موجود رہتا۔ لاڈو اسپیکر سے غمیب طرح کی آدازیں آتیں۔ پھر کہیں نیکی رام محرر جو کچھ کہنے کے لیے ہے۔ لیکن وہ جتنی بھی باتیں کہتے اور جتنے بھی شاستریں اور پرانوں کا حالت دیتے تھے اتنا ہی اپنے مقصد کے خلاف باتیں کرتے اور یوں میدان ہاتھ سے جاتے دیکھو کر سند رلال بایو ٹھٹھتا لیکن وہ وونقریں کے علاوہ کچھ بھی نہ کہہ پاتا۔ اس کا ٹھلاڑک جاتا۔ اس کی آنھوں سے آنسو بہنے لگتے اور وہ انسا ہونے کے کارن وہ تقریر نہ کر پاتا۔ آخر بیٹھ جاتا۔ لیکن مجمع پر ایک غمیب طرح کی خاموشی چھا جاتی اور سند رلال بایو کی ان دو باقیں کا اثر جو کہ اس کے مل کی گہرا ٹوپیں سے چلی آتیں دکیل کا لکا پر شاد صوفی کی سدی نامحنا فضاحت پر بھاری ہوتا۔ لیکن لوگ وہیں اور دیتے۔ اپنے جذبہ بات کو آسمانہ کر لیتے اور پھر خلی اللہ ہن گھر رٹ جاتے —————

ایک روز کمیٹی والے سانچے کے سے بھی پر چاکرنے چلے آئے اور ہوتے ہوتے قدامت پسندوں کے گڑھ میں بھوپنگ گئے۔ مندوں کے ہاہر دکیل کے ایک پیڑ کے اردوگر دیکھنے کے قدر سے پر کمی مشرد حالوں میں ہے تھے اور راما مائن کی کھفا ہو رہی تھی۔ ناراٹھ بادا راما مائن کا وہ حصہ ناہر ہے تھے جہاں ایک دھوپی نے اپنی دھوبیں کو گھر سے نکال دیا تھا اور اس سے کہہ دیا ————— میں راجا رام چند نہیں جو اتنے سال راون کے ساتھ رہ آئے

پر بھی سیتا کو بسا لے گا اور رام چند رجی نے ہہا ستو نتی سیتا کو گھر سے نکال دیا۔  
ایسی حالت میں جبکہ وہ گرد بھوئی تھی کہ اس سے بھی بڑھ کر رام راج کا کوئی ثبوت مل سکتا  
ہے؟ نارائی بادا نے کہا یہ ہے رام راج ا جس میں ایک دھنی  
کی بات کو بھی احتی ہی تقدیک نکاہ سے دیکھا جاتا ہے:

لکمیشی کا جلوس مندر کے پاس رُک چکا تھا اور لوگ راماٹن کی کتحا اونہ شلوک کا درن  
سننے کے لیے نہر چکے تھے۔ مندر لال آخري فقرے سے سنتے ہوئے کہہ اٹھا۔

”ہمیں ایسا رام راج نہیں چاہیے بابا!

”چُپ رہو جی“ تم کون ہوتے ہو؟ ”خاموش!“ مجھ سے آدانیں  
آئیں اور مندر لال نے بڑھ کر کہا ”مجھے بولنے سے کوئی نہیں روک سکتا۔“  
پھر می خلی آدانیں آئیں ”خاموش!“ ہم نہیں بولنے میں گے“  
ہر دیکھ کونے میں سے یہ بھی آواز آئی ”ما دیں گے؟“  
نارائی بابا نے بڑی میٹھی آواز میں کہا ”تم شاستر دل کی ماں مر جادا کو  
نہیں سمجھتے مندر لال!“

مندر لال نے کہا ”میں ایک بات تو سمجھتا ہوں بابا — رام راج میں  
دھوپی کی آواز تو سنی جاتی ہے لیکن مندر لال کی نہیں：“

اہنی دگل نے جوا بھی مارنے پتے تھے اپنے نیچے سیپل کی گواریں ہشادیں۔  
اور پھر سے بھیستے ہوئے بول اُٹھئے ”شُنو، شُنو، شُنو...“

رسالو اونیکی رام نے مندر لال کو کوہرو کا دیا اور مندر لال ہر لے ”شری رام  
نیتا تھے ہمارے۔ پر یہ کیا بات ہے بابا جی؟“ انھوں نے دھوپی کی بات کو تیہ سمجھ دیا  
مگر اتنی بڑی مہارانی کے ستیہ پر دھناس شکر پائے؟“  
نارائی بابا نے اپنی ماڈھی کی کھڑی پکارتے ہوئے کہا ”اس لئے کہ

سیتا ان کی ابھی بتی نہ تھی۔ سند لال! تم اس بات کی مہا سماں کرنہ ہیں جانتے۔“

”ہاں بابا“ سند لال با بونے کہا — ”اس سنوار میں بہت سی باتیں ہیں جو میری سمجھ میں نہیں آتیں۔ پر میں سچارا مرام راج اُسے سمجھتا ہوں جس میں انسان اپنے آپ پر بھی ظلم نہیں کر سکتا۔ اسے آپ سے بے انصافی کرنا اتنا بھی بٹھا پاپ ہے جو اتنا کبھی درستہ سے بے انصافی کرتا۔ آج بھی بھگوان رام نے سیتا کو گھر سے نکال دیا ہے۔ اس لیے کہ وہ راون کے پاس رہ آئی ہے۔ اس میں کیا قصور تھا سیتا کا؟ کیا وہ بھی ہماری بہت سی ماں بہنوں کی طرح ایک حبیل اور کپڑ کی شکار نہ تھی؟ اس میں سیتا سے سترے اور اسٹرے کی بات ہے یا راکشش نافن کے دشمنوں کی جس کے دس سو انسان کے بیٹھے تھے لیکن ایک اور سب سے بٹھا سرگرد تھے کہا؟“

— آج ہماری سیتا ندوش گھر سے نکل دی گئی ہے۔ سیتا۔ لا جنتی۔ اور سند لال با بونے روشن شروع کر دیا۔ رسالو اور شکی رام نے تمام وہ نشرخ جھنڈے اٹھا لیے جو پر آج تھی اسکوں کے جھپوکرے مل نے بڑی صفائی سے فرے کاٹ کر چپکا دیے۔ تھے اور پھر وہ سب سے سند لال با بیو زندہ باد“ کے فرے لگاتے ہوئے چل دیے جلوس میں سے ایک نے کہا — ”مہاستی سیتا زندہ ہا۔“ ایک طرف سے آواز آئی — ”شری رام چند ر۔“

اور بھر بہت سی آوازیں آئیں۔ ”خاموش! خاموش!“ اور زندگانی با دل کی ہیں کی تھا اکارت چلی گئی۔ بہت سے لوگ جلوس میں شامل ہو گئے جس کے آگے آگے دیل کا نکاپر خادا و حکم نکلے محترم چوکر، کھلان جا رہے تھے، اپنی بوڑھی چھپڑیوں کو زمین پر مارتے اور ایک فاتحاد سی آواز پیدا کرتے ہوئے۔ اور ان کے دمہان کہیں سند لال جا رہا تھا۔ اس کی ہنگسوں سے اچھی تکمیل افسوس ہے رہے تھے۔ آج اس کے دل کو بڑی ٹھیس لگی تھی اور لوگ بڑے جوش کے ساتھ ایک دسرے کے ساتھ مل کر گوارہ ہے

”ہتھ لائیاں کملان نی لاجونتی دے بُوٹے ... !“  
 ابھی گیت کی آواز لوگوں کے کاؤن میں گونج رہی تھی۔ ابھی صبح بھی نہیں  
 ہو پائی تھی اور محلہ ملائشکور کے مکان ۲۱م کی بدھوا ابھی تک اپنے بستریں کرناک  
 سی انگڑا شیل لے رہی تھی کہ سندر لال کا ”گرائیں“ لال چند جسے اپنا اثر درست  
 استعمال کر کے سندر لال اور خلیفہ کالکا پرشاد نے راشن ڈپو لے دیا تھا، دوڑا دوڑا  
 آیا اور اپنی گاڑھے کی چادر سے باہتہ پھیلانے ہوتے بولا —

”بدھائی ہو سندر لال“

سندر لال نے میٹھا گڑ چلم میں رکھتے ہوتے کہا — ”کس بات کی بدھائی  
 لال چند ؟“

”میں نے لا جو بھابی کو دیکھا ہے۔“

سندر لال کے باہتے چلم گرگئی اور میٹھا تباکو فرش پر گھیا — ”کہاں  
 دیکھا ہے ؟“ اس نے لال چند کو کندھوں سے پیٹتے ہوئے پوچھا اور جلد جواب نہ  
 پانے پر چھینچ چوڑ دیا۔

”دالہ کی سرحد پر۔“

سندر لال نے لال چند کو چھوڑ دیا اور اتنا سالو لا ہی کوئی اور ہو گئی۔

للال چند نے یقین دلاتے ہوئے کہا — ”نہیں بھیا وہ لا جو رہی تھی لا جو...“

”تم اسے پہچانتے بھی ہو ؟“ سندر لال نے پھرتے میٹھے تباکو کو فرش پر بھے  
 اٹھاتے اور سمجھی پر مسلتے ہوئے پوچھا اور ایسا کرتے ہوئے اس نے رسالو کی  
 چلم مُختے پر سے اٹھا لی اور بولا — ”بخلاف کیا پہچان ہے اس کی ؟“

”ایک قیند ولہ مٹھوڑی پر ہے، دوسرا گال پر —“

”ہاں ہاں“ اور سندر لال نے خود ہی کہہ دیا ”تیرا ما تھے پر“ وہ نہیں

چاہتا تھا۔ اب کوئی خدشہ رہ جائے اور ایک دم اسے لا جو نتی کے جلنے پہنچانے جنم کے  
سماں کے تین دے یا دو گئے جو اس نے بھی بنے میں اپنے جسم پر بنوایے تھے جو ان ہلکے ہلکے  
سبز داؤں کی مانند تھے جو چھپنی موٹی کے پودے کے بدن پر ہوتے ہیں اور جس کی طرف  
اشارہ کرتے ہی وہ کہلانے لگتا ہے۔ بالکل اسی طرح ان تین دلوں کی طرف انگلی کرتے  
ہی لا جو نتی شرم جاتی تھی۔ اور گم ہو جاتی تھی اپنے آپ میں سمت جاتی تھی۔ گویا  
اس کے سب راز کسی کو معلوم ہو گئے ہوں اور کسی نامعلوم خزانے کے لٹ جانے سے  
دہ مغلس ہو گئی ہے... سندھ لال کا سارا جسم ایک آن جانے خوت۔ ایک آن جانی محبت  
اور اس کی مقیدیں آگ بیٹھنکنے لگا۔ اس نے پھرست لال چند کو پکڑ دیا اور پرچھا۔

”لا جو داگ کیسے بہنج گئی؟“

لال چند نے کہا۔ ”ہند اور پاکستان میں عورتوں کا تبادلہ ہو رہا تھا نا۔“  
”پھر کیا ہوا۔؟“ سندھ لال نے اکڑوں بھیختے ہوئے کہا۔ ”کیا ہوا پھر؟“  
رسانو بھی اپنی چار پانی پڑ آٹھ بیٹھا اور تمباکو نوشول کی مخصوص کھانی کھانے  
ہوئے بولا۔ ”سچ چج ہے گئی ہے لا جو نتی بھابی؟“

لال چند نے اپنی بات جازی رکھتے ہوئے کہا ”داگہ پر سولہ عورتیں پاکستان نے  
دے دیں اور اس کے عوض سولہ عورتیں لے لیں۔ لیکن ایک جمیگڑا اکھڑا موگیا۔  
ہمارے دالنیڑا عذر امن کر رہے تھے کہ تم نے جو عورتیں دی ہیں ان میں ادھیر بڑھی  
اور بیکار عورتیں زیادہ ہیں۔ اس تنازع پر لوگ جمع ہو گئے۔ اس وقت ادھر کے  
دالنیڑوں نے لا جو بھابی کو دکھاتے ہوئے کہا۔ ”تم اسے بڑھی کہتے ہو؟  
دیکھو... دیکھو... جب تکی عورتیں تم نے دی ہیں ان میں سے ایک بھی برابری کرتی ہے  
اگر کی؟“ اور دہاں لا جو بھابی سب کی نظرؤں کے سامنے اپنے تین دلے چھپا رہی تھی۔  
پھر جبڑا بڑھ گیا۔ دلنوں نے اپنا اپنا ”مال“ داپس لے لینے کی ٹھان لی۔ میں

نے شور مچایا — ”لاجو — لا جو بھائی ...“ مگر ہماری فوج کے سپاہیوں نے ہمیں ہی مار مار کے بھگا دیا۔

اور لال چند اپنی کہنی دکھانے لگا، جہاں اسے لاٹھی پڑی تھی۔ رسالو اور نیکی رام چُپ چاپ بیٹھے رہے اور سندر لال کہیں درد کھینچنے لگا۔ شاید سوچنے لگا۔ لا جو آئی بھی پر نہ آئی ... اور سندر لال کی شکل ہی سے جان پڑتا تھا جیسے وہ بیکانیر کا صحراء پھانڈ کر آیا ہے اور اب کہیں درخت کی چھاؤں میں زبان نکالے ہاں پر رہا ہے۔ مٹھے سے اتنا بھی نہیں نکلتا — ”پانی دے دو“ اسے یوں محسوس ہوا، بٹوارے سے پہنچے اور بٹوارے کے بعد کا تشدد ابھی تک کافر ہے۔ صرف اس کی شکل بدل گئی ہے۔ اب لوگوں میں پہلا ساد ریغ بھی نہیں رہا۔ کسی سے پوچھو، سانپھر والا میں لہنا سنگھ رہا کرتا تھا اور اس کی بھائی بنتو — تو وہ جھٹ سے کہتا ”مر گئے“ اور اس کے بعد موت اور اس کے مفہوم سے بالکل بے خبر بالکل عاری آگے چلا جاتا۔ اس سے بھی ایک قدم آگے بڑھ کر بڑے ٹھنڈے دل سے تاجر، انسانی مال، انسانی گوشت اور پوست کی تجارت اور اس کا تبادلہ کرنے لگے۔ مولیشی خریدنے والے کسی بھیں یا گائے کا جبرا ہٹا کر دانتوں سے اس کی عمر کا اندازہ کرتے تھے۔

اب وہ جوان عورت کے روپ، اس کے نکھار، اس کے عزیز ترین رازوں، اس کے تیندوں کی شارع عام میں ناٹش کرنے لگے۔ تشدد اب تاجر وں کی نس نس میں بس چکا ہے پہلے منڈی میں مال بکتا تھا اور بھاؤ تاؤ کرنے والے ہاتھ ملا کر اس پر ایک روپ مال ڈال لیتے اور یوں گپتی کر لیتے۔ گویا روپ مال کے نیچے انگلیوں کے اشاروں سے سودا ہو جاتا تھا۔ اب گپتی مکار روپ مال بھی ہٹ چکا تھا اور سامنے سودے ہو رہے تھے اور لوگ تجارت کے آواب بھی بھول گئے تھے۔ یہ سارا لیعن دین، یہ سارا کار و بار پڑانے زمانے کی داستان معلوم ہر رہا تھا جس میں عورتوں کی

آزادانہ خرید و فروخت کا قصہ بیان کیا جاتا ہے۔ ازبیک ان گھنٹت عربیاں عورتوں کے سامنے کھڑا اُن کے جسموں کو ٹوہ ٹوہ کے دیکھ رہا ہے اور جب وہ کسی عورت کے جسم کو انگلی لگاتا ہے تو اس پر ایک گلابی سنجھڑھا پڑ جاتا ہے اور اس کے ارد گرد ایک زرد ساحلچہ اور پھر زردیاں اور مُرخیباں ایک دوسرے کی جگہ لینے کے لیے دوڑتی ہیں ... ازبیک آگے گزر باتا ہے اور ناقابل قبول عورت ایک اعتراف تسلیت، ایک انسانیت کے عالم میں ایک ہاتھ سے ازار بند تھامے اور دوسرے سے اپنے چہرے کو عوام کی نظر دل سے چھپائے سیسکیاں لیتی ہے ...

سندر لال امر تسر (سرحد) جانے کی تیاری کر ہی رہا تھا کہ اسے لا جو کے آنے کی خبر ملی۔ ایک دہائی خبر مل جانے سے سندر لال گھبرا گیا۔ اس کا ایک قدم فوراً دروازے کی طرف بڑھا لیکن وہ پیچھے لوٹ آیا۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ وہ روٹھ جائے اور کہیٹی کے تمام پلے کارڈوں، اور جھنڈیوں کو بچھا کر بیٹھ جائے اور پھر روٹے لیکن وہاں جذبات کا یوں منظاہرہ ممکن نہ تھا۔ اُس نے مردانہ وال اس اندر دنی کشاکش کا مقابلہ کیا اور اپنے قدموں کو نماپتے ہوئے چوکی کلاں کی طرف چل دیا کیونکہ وہی جگہ تھی جہاں مفویہ عورتوں کی ڈیوری دی جاتی تھی۔

اب لا جو سامنے کھڑی تھی اور ایک سخوف کے جذبے سے کانپ رہی تھی۔ دہی سندر لال کو جانتی تھی اس کے سوائے کوئی نہ جانتا تھا۔ وہ پہلے ہی اس کے سامنے ایسا سلوک کرتا تھا اور اب جیکہ وہ ایک غیر مرد کے ساتھ زندگی کے دن بتا کر آئی تھی نہ جانے کیا کرے گا؟ سندر لال نے لا جو کی طرف دیکھا۔ وہ خالص اسلامی طرز کا لال دوپٹہ اور ڈھنے تھی اور بائیس بیتل مارے ہوئے تھی ... عادتاً مخفی عادتاً —

دوسری عورتوں میں گھل مل جانے اور بالآخر اپنے صیاد کے دام سے بھاگ جانے کی آسانی تھی اور وہ سندر لال کے بارے میں اتنا زیادہ سوچ رہی تھی کہ اسے کپڑے بدلتے یا دوپٹہ ٹھیک سے اور ٹھنے کا بھی خیال نہ رہا۔ وہ ہندو اور مسلمان کی تہذیب کے بنیادی فرق — دائیں بغل اور بائیں بغل میں اختیاز کرنے سے قاصر رہی تھی۔ اب وہ سندر لال کے سامنے کھڑی تھی اور کانپ رہی تھی ایک اُمید اور ایک ڈر کے جذبے کے ساتھ — سندر لال کو دھچکا سانگا۔ اس نے دیکھا لا جونتی کارنگ پکھنکھر گیا تھا اور وہ پہلے کی بُسبت کچھ تندست سی نظر آتی تھی۔ نہیں۔ وہ موٹی ہو گئی تھی — سندر لال نے بزر کچھ لا جو کے بارے میں سوچ رکھا تھا وہ سب غلط تھا۔ وہ سمجھتا تھا غم میں گھسل جانے کے بعد لا جونتی بالکل مریل ہو چکی ہوگی اور آواز اس کے مُسٹھ سے نکالے نہ تکلتی ہوگی۔ اس خیال سے کہ وہ پاکستان میں بڑی خوش رہی ہے، اسے بڑا صدمہ ہوا لیکن وہ چپ رہا کیونکہ اس نے چُپ رہنے کی قسم کھار کھی تھی۔ اگرچہ وہ نہ جان پایا کہ اتنی خوش تھی تو پھر چلی کیوں آئی؟ اس نے سوچا شاید ہندو سرکار کے دباؤ کی وجہ سے اسے اپنی مر منی کے خلاف یہاں آنا پڑا۔ لیکن ایک چیز وہ نہ سمجھ سکا کہ لا جونتی کا سنو لا یا ہوا چہرہ زردی یہے ہوئے تھا اور غم، محض غم سے اس کے بدن کے گوشت نے ہڈیوں کو چھوڑ دیا تھا۔ وہ غم کی کثرت سے موٹی ہو گئی تھی اور صحبت منڈ نظر آتی تھی لیکن یہ ایسی صحبت مندی تھی جس میں دو قدم چلنے پر آدمی کا سانس پھول جاتا ہے....

مغوریہ کے چہرے پر پہلی نگاہ ڈالنے کا تاثر کچھ عجیب سا ہوا۔ لیکن اسے سب خیالات کا ایک اشباتی مرد انگی سے مقابلہ کیا۔ اور بھی بہت سے لوگ موجود تھے کسی نے کہا — ”ہم نہیں لیتے مسلمان (مسلمان) کی جھوٹی عورت —“ اور یہ آواز رسالو، نیکی رام اور چوکی کلاں کے بوڑھے محرب کے نعروں میں گم ہو کر

رہ گئی۔ ان سب آوازوں سے الگ کالکا پرشاد کی بھٹی اور چلتی آواز آرہی تھی۔ وہ کھانس بھی لیتا اور بوتا بھی جاتا۔ وہ اس نئی حقیقت، اس نئی شدھی کاشتت سے قائل ہو چکا تھا یوں معلوم ہونا تھا آج اس نے کرنی نیا دید کرنی نیا پران اور شاستر پڑھ لیا ہے اور اپنے اس حصول میں دوسروں کو بھی حصے دار بنانا چاہتا ہے... ان سب لوگوں اور ان کی آوازوں میں گھرتے ہوئے لا جو اور سندر لال اپنے ڈیرے کو جارہے تھے اور ایسا جان پڑتا تھا جیسے ہزاروں سال پہلے کے رام چندر اور سیتا کسی بہت بے اخلاقی بن باسی کے بعد اجوہ حسیاوث رہے ہیں۔ ایک طرف تو لوگ خوشی کے انہیں میں دیپلا کر رہے ہیں اور دوسری طرف انہیں اتنی لمبی اذیت دیئے جانے پر تاسف بھی۔

لا جونتی کے پہلے آنے پر بھی سندر لال باپوں نے اسی شدود مدد سے 'دل میں بساؤ' پروگرام کو جاری رکھا۔ اس نے قول اور فعل دونوں اعتبار سے اسے بنا دیا تھا اور وہ لوگ جنہیں سندر لال کی باتوں میں خالی خولی جزو باستیت نظر آتی تھی، قائل ہونا شروع ہوئے۔ اکثر لوگوں کے دل میں خوشی تھی اور بیشتر کے دل میں افسوس۔ مکان ۱۴۳م کی بیوہ کے علاوہ محلہ ملاشکور کی بہت سی عورتیں سندر لال باپوں سو شل و در کر کے گھر آنے ہے گھبرا تی تھیں۔

لیکن سندر لال کو کسی کی اعتماد یا بے اعتمادی کی پرواہ نہ تھی۔ اس کے دل کی رانی آچکی تھی اور اس کے دل کا خلا پٹ چکا تھا۔ سندر لال نے لا جو کی سورن سورتی کو اپنے دل کے مندر میں استھا پت کر لیا تھا اور خود دروازے پر بیٹھا اس کی حفاظت کرنے لگا تھا۔ لا جو جو پہلے خوف سے ہمی رہتی تھی۔ سندر لال کے غیر متوقع زرم سلوک کو دیکھ کر آہستہ آہستہ کھلنے لگی۔

سندر لال، لا جونتی کو اب لا جو کے نام سے نہیں پکارتا تھا، وہ اسے کہتا تھا "دیوی!" اور لا جو ایک ان جانی خوشی سے پاگل ہوئی جاتی تھی۔ وہ کتنا چاہتی تھی کہ

سندر لال کو اپنی دار دات کہہ سنائے اور سناتے نہ لئے اس قدر روئے کہ اس کے سب  
گناہ دُصل جائیں لیکن سندر لال، لا جو کی وہ باتیں سننے سے گزیر کرتا تھا اور لا جو اپنے کھل  
جانے میں بھی ایک طرح سے سمجھی رہتی۔ البتہ جب سندر لال سوچتا تو اسے دیکھا کرتی  
اور اپنی اس چوری میں پکڑی جاتی۔ جب سندر لال اس کی وجہ پوچھتا تو وہ ”نہیں“  
”یونہیں“ ”ادھر ملے“ کے سوا اور کچھ نہ کہتی اور سارے دن کا تھکا ہارا سندر لال پھر  
اوٹکھے جاتا... البتہ شروع شروع میں ایک دفعہ سندر لال نے لا جو نتی کے بیان دونوں  
کے بارے میں صرف آنسا سا پوچھا تھا۔

”کون تھا وہ؟“

لا جو نتی نے نکالیں نجی کرتے ہوئے کہا — ”مجنہاں“ — پھر وہ اپنی نگاہیں  
سندر لال کے چہرے پر جاتے ہوئے کچھ کہنا چاہتی تھی لیکن سندر لال ایک بُیب سی نظر دیں  
سے لا جو نتی کے چہرے کی طرف دیکھ رہا تھا اور اس کے بالوں کو سہلدار باتھا۔ لا جو نتی  
نے پھر آنکھیں نیچی کر لیں اور سندر لال نے پوچھا —

”اچھا سلوک کرتا تھا وہ؟“

”ہاں“

”مارتا تو نہیں تھا؟“

لا جو نتی نے اپنا سر سندر لال کی چھاتی پر سرکلتے ہوئے کہا — ”نہیں“...  
اوہ پھر بولی ”وہ مارتا نہیں تھا، پر مجھے اس سے زیادہ ڈر آتا تھا۔ تم مجھے مارتے بھی  
تھے پر میں تم سے ڈرتی نہیں سکتی... اب تو نہ مارو سکے؟“

سندر لال کی آنکھوں میں آنسو آمد آئے اور اس نے بڑی ندامت اور بڑے  
تماسف سے کہا — ”نہیں دیوی! اب نہیں... نہیں ماروں گا...“  
”دیوی!“ لا جو نتی نے سوچا اور وہ بھی آنسو بہانے آگئی۔

اور اس کے بعد لا جو نتی سب کچھ کہہ دینا چاہتی تھی لیکن سند رلال نے کہا۔  
”جانے دو بیتی باتیں! اس میں تمہارا کیا قصور ہے؟ اس میں قصور ہے ہمارے  
سماج کا جو وجہ ایسی دیویں کو اپنے باش عزت کی جگہ نہیں دیتا۔ وہ تمہاری بانی نہیں  
کرتا اپنی کرتا ہے؟“

اور لا جو نتی کی من کی من ہی میں رہی۔ وہ کہہ نہ سکی ساری بات اور جیکی دبکی پڑی  
رہی اور اپنے بدن کی طرف دیکھتی رہی جو کہ ٹوارے کے بعد اب ”دیوی“ کا بدن ہو چکا تھا۔  
لا جو نتی کا نہ تھا۔ وہ خوش تھی بہت خوش۔ لیکن ایک ایسی خوشی میں سرشار جس میں ایک  
شک تھا اور وسو سے۔ وہ لیٹی لیٹی اچانک بیٹھ جاتی جیسے انتہائی خوشی کے لمحوں میں  
کوئی آہستہ پا کر ایکا ایکی اس کی طرف متوجہ ہو جائے ...

جب بہت لے سے دن بیت گئے تو خوشی کی جگہ پورے شک نے لکھی۔ اس  
لئے نہیں کہ سند رلال بالو نے پھر دہی پرانی بدسلوکی شروع کر دی تھی بلکہ اس لئے کہ  
وہ لا جو سے بہتھ بھی اچھا ملوک کرنے لگا تھا۔ ایسا سلوک جس کی لا جو متوقع نہ تھی  
... وہ سند رلال کی دہی پر الی لا جو ہو جانا چاہتی تھی جو گاہر سے نہ پڑتی اور مولی سے  
مان جاتی۔ لیکن اب لڑائی کا سوال ہی نہ تھا۔ سند رلال نے اسے یہ محسوس کرایا جیسے  
وہ لا جو نتی کا بخی کی کوئی چیز ہے جو چھوتے ہی ٹوٹ جائے گی ... اور لا جو اسے بینے  
میں اپنے سراپا کی طرف دیکھتی اور اخراں نیچے پر پہنچتی کہ وہ اور تو سب کچھ ہو سکتی ہے  
پر لا جو نہیں ہو سکتی۔ وہ بس گئی، پر اجر ڈھنی ... سند رلال کے پاس اس کے آنسو  
دیکھنے کے لیے آنکھیں نہیں اور نہ آپس سننے کے لیے کان! ... پر بھات پھیریاں  
نکلتی رہیں اور محلہ ملا شکور کا سدھارک رسالہ اور نیکی۔ ام کے ساتھ مل کر اسی آواز  
میں گاتا رہا —

”ہمکہ لا ایاں کملان فی“ لا جو نتی دے بے بوئے ...“

# جو گیا

نہادھوکر، بچے کے تین ساڑھے تین کپڑے پہنے، جو گیارہ ذکی طرح اس دن بھی الماری کے پاس آکھڑی ہوتی اور میں اپنے ہاں سے کھوڑا پچھے ہٹ کر دیکھنے لگا۔ ایسے میں دروازہ کو پانچھہ جو نگا تو 'چول' کی ایک بے صری آدا نہ پیدا ہوتی بڑے بھتیا جو کہیں پاس ہی بیٹھے شیو بنا رہے تھے، مڑا کر بولے —

"کیا ہے جگل؟"

"پچھہ ہنیں موئے بھیا" میں نے انھیں ڈالتے ہوئے کہا۔ "گری بہت ہے؟" اور میں پھر سامنے دیکھنے لگا۔ ساری کے سلسلے میں جو گیا آج کون سارنگ چنتی ہے؟ — میں بچے بچے اسکول آن آر اس میں پڑھتا تھا رنگ میرے حواس پر چھائے رہتے تھے۔ رنگ مجھے مرد عورتوں سے زیادہ ناطق معلوم ہوتے تھے اور آج بھی ہوتے ہیں۔ فرق صرف اتنے ہے کہ لوگ اکثر بے معنی باتیں کرتے ہیں لیکن رنگ کبھی معنی سے خلی بات ہنیں کرتے۔

ہمارا مکان کا بادیوی کی دادی شیٹ اگیا ری لین میں تھا۔ پارسیوں کی اگیاری تو کہیں درگلی کے موڑ پر تھی۔ یہاں پر صرف مکان تھے آئنے سامنے جو ایک دوسرے سے بغلیر ہو رہے تھے۔ ان مکاؤں کی ہم آغوشیاں کہیں تو ماں بچھے کے پیار کی طرح دیگی، ڈیگی، ملائم، ملائم اور صاف ستری تھیں اور کہیں مرد عورت کی محبت کی طرح مجنونانہ۔ سعینہ بہ سعینہ، لب بہ لب، غلیظ اور — مقدس ...

سامنے باپو گھر کی قسم کے کردار میں جو کچھ ہوتا تھا، وہ ہمارے ہاں گیاں بھروسے صاف دکھائی دیتا۔ ابھی بجور کی ماں زکاری حصیل رہی ہے اور چاقو سے اپنا، ہی ہاتھ کاٹ لیا ہے۔ ڈنگر بھائی نے احمد آباد سے گھمی اور تیل کے دوپیے منگوئے ہیں اور پنجاب سب کی نظر میں بچا کر انہوں کے چھلکے کوڑے کے ڈھیر میں کنپنیک کر بھاگ رہی ہے جیسے ہمارے گیاں بھوسن سے ان لوگوں کا کھایا پیا سب نظر آتا تھا ایسے ہی انہیں بھی ہمارا سب کچھ نظر آتا ہوگا۔

جو گیا کے گھر کا نام تو رنچھوڑ نواس تھا لیکن میں اسے باپو گھر کہتا تھا۔ اس لیے کہ اس میں عام طور پر بدھوائیں اور چھوڑی ہوئی عورتیں رہتی تھیں ان میں ایک جو گیا کی ماں تھی جو دن بھر کسی درزی گھر میں سلاٹی کی مشین چلاتی اور اس سے اتنا پیسہ پیدا کر لیتی جس سے اپنا اور اپنی بیٹی کا پیٹ پال سکے اور ساتھ ہی جو گیا کی نعمیم بھی بھسل کرے۔

جو گیا سترہ انھارہ برس کی ایک نولہورت لڑکی تھی۔ قدر کوئی ایسا چھوٹا نہ تھا لیکن بدن کے بھرے پڑے اور گھٹے ہونے کی وجہ سے اس پر چھوٹا ہونے کا گمان گزنا تھا۔ کسی کو تھیں بھی نہ آ سکتا تھا کہ جو گیا دال، رنگنا اور بہنے میں ایک آدھ بارکی شری کھڑے اتنی تند رست ہو سکتی تھی بہر حال ان لڑکیوں کا کچھ مت کیسے۔ جو بھی کھاتی ہیں سب اتم غلام ان کے بدن کو لگتا ہے اور بعض وقت تو غلط حصوں کو لگتا ہے جنھیں میں تو صحیح تھے۔

کہتا ہوں کیونکہ عورت کے جسم میں تپنے پلے پلے خود کی بہ نسبت مجھے گھرے گھرے اور بھر پور خدا پچھے لگتے ہیں جو گیا کا چہرہ سو منات مندر کے پیش رخ کی طرح چوڑا لھا جس میں قندیل جبی آنکھیں، رات کے اندر ہیرے میں بھگے ہرئے سافر دل کو روشنی دکھاتی تھیں۔ مورتی میں ناک اور ہونٹ زمرو اور یاقوت کی طرح دنگے ہوئے تھے سر کے بال کمر سے نیچے نکل کی پیمائش کرتے تھے جنھیں وہ بھی ڈھیلا ڈھیلا اور بھیگا بھیگا رکھتی اور کبھی اس قدر خشک بنادیتی کہ ان کی کچھ لیٹیں باقی ہالوں سے خواہ مخواہ الگ ہو کر چہرے اور گردن پر پھلتی رہتیں۔ اس کا چہرہ کیا تھا، پورا تارا منڈل تھا جس میں چاند خیالوں اور جذبوں کے ساتھ گھستا اور بڑھتا رہتا تھا۔ جو گیا یوں بڑی بھولی تھی لیکن اپنے آپ کو سجنے بنانے کے سلسلے میں پہت چالاک تھی۔ کب اور کس وقت کیا کرنا ہے وہ خوب جانتی تھی اور اس کے اس جاننے میں اس کی تعییم کا بڑا ہاتھ تھا جس نے اس کے حسن کو دو بالا کر دیا تھا۔ گرد بڑھتی تو صرف رنگ کی۔ کیونکہ جو گیا کارنگ صفر دت سے زیادہ گورا تھا جسے دیکھتے ہی زکام کا سا احساس ہونے لگتا۔ اگر باقی کی چیزیں اتنی قتنا سب نہ ہوتیں تو اس پچھلی ہو گئی تھی۔ میں نہیں جانتا محبت کس چڑیا کا نام ہے۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ جو گیا کو دیکھتے ہی میرے اندر دیواریں سی گزر نے لگتی تھیں اور جہاں تک مجھے یاد ہے جو گیا بھی مجھے دیکھ کر غیر متعلق تھیں کرنے لگتی ہو گیا میری بستی ہیما کی ہمیل تھی۔ عجیب ہمیل پنا تھا... ہیما صرف سات سال کی تھی اور جو گیا اٹھا رہ برس کی۔ ان کی دوستی کی کوئی وجہ تھی جسے صرف جو گیا جانتی تھی اور یا پھر میں جانتا تھا۔ موٹے بھتیا اور بہاں، صرف یہی سمجھتے تھے کہ وہ ہیما سے پیار کرتی ہے۔ اس لیے اسے پڑھنے آتی ہے۔ یوں ہمارے گھر میں آکر جو گیا سب کو سبق دے جاتی تھی۔ میں جو ایک آرٹسٹ بننے جا رہا تھا۔ ایسی رکھ رکھا دکی باقی کا قابل نہ تھا۔ لیکن میری بھجو یا تھیں۔ میں نے کمانا شروع نہیں کیا تھا اور میرے ہر قسم کے خرچ کا مدار موٹے بھتیا پر تھا۔ البتہ بیچ بیچ میں مجھے اس بات کا بھی خیال آتا تھا کہ اس مادگمات میں بھی ایک مزہ ہے۔

منزب میں رٹکے رڈ کیاں جو اتنی آسانی سے ایک دوسرے کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیتے ہیں، بنائی الہاب کے ایک دوسرے کی آغوش میں چلے آتے ہیں۔ خاک نطف اٹھاتے ہیں؟ اتفاقاً محبوبہ کے بدن سے چھو جانے پر ان کے انہد تو کوئی بجلی سہ دورتی ہوگی؟ شاید ان کو کوئی ایسا نطف ملتا ہو جو ہمارے نطف سے ارفع ہو۔ لیکن ہمارے ہاں صرف لمس اور ادھر ادھر کی باتوں ہی میں ایسے تلذذ کا احساس ہوتا ہے کہ ان کے صال میں بھی کیا ہو گا؟

یوں ہی دو چار بار میرا ہاتھ جو گیا کے پنڈ سے کوئی گیا ہو گا۔ ایک بار صرف ایک بار میں نہ اپنے ارادے سے اس کا منہ چوڑا تھا۔

ہم گھر سے تھہر سے تھوڑے کوئی اور فائصلے کے ساتھ نکلتے تھے اور پھر پارسیوں کی آگیاری کے پاس مل باتے ہمارے اس راز کو صرف وہ پارسی پچاری ہی جانتا تھا جو فرشتوں کے لباس میں آگیاری کے باہر بیٹھا ہوتا اور سخن میں زنداد سنتا پڑھتا رہتا تھا۔ دُھرف وہ ہمارے سر دش کو سمجھتا تھا۔ اس بیسے اس کے پاس سے گزرتے ہوئے ہم اُسے ضرور "صاحب جی" کہتے اور پھر اس راستے پر چل پڑتے جو دنیا کے ہو ولعب میر دسینا کی طرف جاتا تھا جہاں پہنچ کر جو گیا اپنے کام کی طرف چل دیتی اور میں اپنے اسکول کی طرف۔ راستے پھر ہم غیر منطق باتیں کرتے اور ان سے پورا حظ اٹھاتے۔ اگر پیار کی باتیں ہوتیں بھی تو کسی دوسرے کے پیار کی جن میں وہ مرد کو ہمیشہ بدمعاش کہتی اور پھر اس بات پر کر دھتی بھی کہ اس کے بغیر بھی گزارہ نہیں۔ ایک دن جہاں گھیر آرٹ گیلری میں کسی آرٹسٹ کی منفرد نمائش تھی اور پورے شہر بھی میں سے کوئی بھی اس بدفصیب کی تصویروں کو دیکھنے اور خریدنے نہ آیا تھا۔ صرف میں اور جو گیا پہنچنے لگتے اور وہ بھی تصویریں دیکھنے کی بجائے ایک دوسرے کو دیکھنے۔ محسوس کرنے کے لیے پورے ہاں میں ہمارے سوا کوئی نہ تھا اور تمیں طرف سے رنگ ہمیں گھور رہے تھے جو ہمیں ایک صبح کے نام کی ایک بڑی سی

تصویر تھی جس میں اوپر کے حصے پر بُرش سے گہرے تُرخ زنگ کو موٹے موٹے اور بجدتے  
مل ریتے سے لختا پا اور پچارا گیا تھا۔ اس نے ہماری ردحوں تک میں التہاب پیدا کر دیا تھی  
کے نیچے ایک اسٹول سا پڑا تھا جس پر جو گیا کسی اندر ورنی تکان کے احساس سے بیٹھ گئی۔  
اس کی سانس قدرے تیز تھی اور میں جانتا تھا مجحت میں ایک قدم بھی بعض اوقات سینکڑوں  
فرنگ ہوتا ہے... اور آدمی چلنے سے پہلے تھک جاتا ہے ...  
آڑٹھ رو ہنسا ہو کر باہر چلا گیا۔ دیکھنے کوئی آتا نہ تھا ہے یا نہیں۔ اپنی نفترت  
میں وہ ہماری مجحت کو نہ دیکھ سکا تھا۔

بھی ہم دونوں کے اکیلے پن نے سارے ہال کو بھردیا۔

اس دن میں نے جو گیا سے سب کہہ دینا چاہا۔ ہم دونوں ہی پیار کی ہبڑا پھر لوں سے  
زنگ آچکے تھے۔ چنانچہ میں نے ایک قدم آگے بڑھایا، ٹھٹھ کا اور بھر اسٹول کے پاس  
جو گیا کے پیچے کھڑا ہو گیا۔ میں کہہ بھی سکتا تو بس اتنا۔ "جو گیا! میر تمہیں ایک لطیفہ نہاد؟"  
"سلسلے آ کے نہاد" جو گیا بولی

میں نے کہا "لطیفہ ہی ابیا ہے۔ جو گیا!

میری طرف دیکھے بغیر ہی اسے میرے جھیں میں کا اندازہ ہو رہا تھا اور مجھے پیچے  
اس کے کانوں کی لودن سے اس کی مسکراہٹ دکھائی دے رہی تھی۔ آخر میں نے لطیفہ شروع کیا۔

"ایک بہت ہی ڈرپوک قسم کا پریمی تھا"

"ہوں" ... جو گیا کے سننے ہی سے اس کی دلچسپی کا اندازہ ہو رہا تھا۔ پھر میں  
نے کہا۔ "وہ کسی طرح بھی اپنی پیسکا کو اپنا پیار نہ جتنا سکتا تھا۔"

اس پر جو گیا نے تین چوتھائی میں میری طرف دیکھا۔ "تم لطیفہ نہار ہے ہو؟"

"ہاں!" میں نے کچھ خنیف ہوتے ہوئے کہا۔

اور جو گیا پھر سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔ منتظر... ایک ایسا انتظار جو بہت ہی

لباہ ہو گیا تھا، جس میں لمحات کے شرارے، کسی بارہ دس سے پھوٹ پھوٹ کر نکل رہے تھے، خدا میں پھٹ رہے تھے اور آخر صعدہ میت کا حصہ ہوتے جا رہے تھے جبھی جو ہو میں ایک عصیج " میں لال زنگ کے نیچے سے سورج کی کرن نیچے سمندر کی سیاہیوں میں دولتی ہونی کشتی پر پڑی اور میں نے کہا۔" وہ لڑکی اپنے پریمی سے تنگ آگئی۔ آخر اس نے سوچا اس بیچارے میں تو ہمت ہی نہیں۔ کپوں نہ میں اسے کوئی ایسا موقعہ دوں، شاید... چنانچہ اس نے اپنے جنم دن پر لڑکے کو بدلایا۔ لڑکا آیا بھی، گذرستہ بھی لا یاب ہے با تھہ میں لیتے ہوئے اس کی پریمی کا نے کہا۔ " ہے کتنا پیارا ہے، یہ اودے میں گلابی، گلابی میں بزرگ کے پھول... ان کے بدلتے تو کوئی میرا منہ بھی چوم لے۔"

" پھر؟ " جو گیا کی بے صبری پیچھے سے بھی دکھانی دے رہی تھی۔

" پھر۔ لڑکی نے اپنا منہ لکھوڑ آگے کر دیا، مگر... وہ لڑکا باہر جا رہا تھا، دروازے کی طرف " " ہے ہمگوان " اور جو گیا نے با تھا اپنے ما تھے پر مار دیا۔

میں نے اپنا بیان جاری رکھتے ہوئے کہا۔ " لڑکی بولی " کہاں جا رہے ہو لالی؟ " لالی نے دروازے کے پاس مرٹے ہوئے کہا۔ " اور پھول لینے... "

اس سے پہلے کہ جو گیا ہنستی اور اس کا انتفار ابدیت پر جھا جاتا، میں نے پیچھے سے اس کے دونوں بازوں پر ٹکرائے اس کا منہ چوم لیا تھا۔ اب جو گیا بنادٹی غصتے سے مجھے ہٹکے ہٹکے تھی پر لگا رہی تھی اور اپنے ہونٹ پیچھے رہی تھی۔ وہ ہنس نہ سکتی کیونکہ درہ ناراضی تھی اور خوش بھی۔ محبت کے اس بے برگ و گیاہ سفر میں ایکاں یکی زمین کا کوئی ایسا ٹھکڑا چلا آیا تھا جسے بارش کے چھینگوں نے ہرا بھرا کر دیا تھا... اس دن اگر ہم جو شیئے، گہرے سرخ زنگ کی تصویر کے نیچے کھڑے نہ ہوتے تو میں جو گیا کامنہ نہ چوم سکتا تھا۔ اس کے بعد آرٹ کا دلدار کوئی آدمی آیا اور اس نے بازو والی تصویر خریدی جس کا نام تھا " کوئی کسی کا نہیں " اور جس میں ایک عورت سر ہاتھوں میں دیسے رہی تھی۔ سب رنگوں میں اُداسی تھی اور وہ

اپے دلت میں اُداسی کے رنگ خرید رہا تھا جبکہ سب کھلتے ہوئے رنگ ہمارے تھے۔ جیب میں ایک پائی نہ ہونے کے باوجود سب تصویریں ہماری تھیں، نمائش ہماری تھی۔ بوجیا ایک عظیم شفی کے احساس سے محمور باہر دروازے کے پاس پہنچ چکی تھی جہاں سے اس نے ایک بار مذکور میری طرف دیکھا، مُکاڈ کھایا، مسکرانی اور بھاگ گئی ...

کچھ دیر یو ہنی ادھر ادھر رنگ اچھا لئے کے بعد میں بھی باہر چلا آیا۔ دنیا کی سب چیزیں اس روڑا جلی اجلی دکھائی دے رہی تھیں۔ لوگوں نے ایسے ہی رنگوں کے نام اُدا، سفید، کالا اور نیلا وغیرہ رکھے ہوئے ہیں۔ کسی کو خیال بھی نہیں آیا۔ ایک رنگ ایسا بھی ہے جو ان کی جمع تفریت میں نہیں آتا اور جسے اُجلاء کہتے ہیں اور جس میں دھنک کے ساتوں رنگ چھپے ہوتے ہیں ... میرا لگاتاشکر کے احساس سے رندھا ہوا تھا —

میں کس کاشکریہ اوکر رہا تھا؟ ... اس ایک لس سے جو گیا ہمیشہ کے لیئے میری ہو گئی تھی۔ میں جیسے اس کی طرف سے بنے مکر ہو گیا تھا۔ ابادہ کسی کے ساتھ بیاہ بھی کر لیتی، اسکی کے ساتھ سو بھی جاتی، جب بھی وہ میری تھی۔ ایسا چمن جس میں سچائی ہو، دلوں ہو، بدصیب شوہر کو کہا ملتا ہے؟

تو گویا میں اس دن دیکھ رہا تھا کون سے رنگ کی ساری جو گیا اپنی الماری میں سے نکالتی ہے۔ اگر وہ مجھے میرے ہال کے دروازے کے چھپے دیکھ لیتی تو ضرور اشارے سے پوچھتی۔ آج کوئی ساری پہنچ اور اس میں سارا مزہ کر کر اہو جاتا۔ میں تو جاننا چاہتا تھا، صبح سوریہ کے بنہادھو کر جب کوئی سندھی اپنی ساری بول کے ڈھیر کے سامنے کھڑی ہوتی ہے تو اس میں کوئی چیز ہے جو اس بات کا فیصلہ کرتی ہے۔ آج گلابی رنگ کی ساری ہمینی چاہیے۔ ان عورتوں کے سوچنے کا طریقہ ٹراپر اسرار ہے، اور پہنچ۔ اتنا بھیڈ، اتنا رہتیہ کہ مرد اس کی تھاہ کو بھی نہیں پہنچ سکتا۔ بُنا ہے چاندنہ صرف عورت کے خون بلکہ اس کے سوچ بچار پر بھی اثر انداز ہوتا ہے لیکن چاند کا اپنا تو کوئی رنگ ہی نہیں، روشنی ہی نہیں۔ وہ

تو سب سورج سے مستعار لیتا ہے... جبھی... جبھی ساری پہنچ سے پہلے عورت ہمیشہ اپنے کسی سورج سے پوچھ لیتی ہے — آج کوئی ساری پہنچوں؟

نہیں، نہیں... اس کا اپنا رنگ ہے، اپنا فیصلہ۔ ہر کسی کو کوئی مرد تھوڑا ہی بتانے جاتا ہے؟ پھر رات — رجنی کا بھی تو ایک رنگ ہوتا ہے، اس کا اپنا رنگ... جسے دیکھ کر جاتے ہیں۔ موہے شام رنگ دیتے، موراً گرا رنگ لئے... اس دن بہت گرمی تھی۔ نیچے دادی شیٹ آگیاری لین میں آتے جلتے لوگ بیت کے رنگ کی مرٹک پر سے گزرتے تھے تو معلوم ہوتا تھا موسوم کی بھیماری کہیں دانے بھون رہی ہے۔ جبھی کوئی پنجابی یا مارداڑی بڑا سا پکڑ باندھے آتا تو اور پر سے بالکل مکی کا دانہ معلوم ہوتا جو بھٹکی آنچ میں لپھول کر سفید ہو جاتا ہے...

یہاں گیان بھون سے مجھے صرف رنگ کے چھینٹے دکھائی دیے۔ وہ سب سائیاں تھیں جن میں سے ایک جو گیا اپنے لیے میرے لیئے ساری دنیا کے لیے چُن رہی تھی۔ یوں ہی اس نے ایک بار میرے گھر کی طرف دیکھا شاید اس کی نگاہیں مجھے ڈھونڈ رہی تھیں۔ لیکن میں نے تو کسی اوٹ کی سلیمانی ٹوپی پہن رکھی تھی جس سے میں تو ساری دنیا کو دیکھ سکتا تھا لیکن دنیا مجھے نہ دیکھ سکتی تھی۔ اس دن میری حیرانی کی کوئی حد نہ رہی جب میں نے دیکھا جو گیا نے ہلکے نیلے رنگ کو چھا ہے۔ ایسی گرمی میں یہی ٹھنڈا رنگ اچھا معلوم ہوتا تھا۔ اگر میں ہوتا تو جو گیا کوئی رنگ پہنچنے کا مشورہ دیتا۔ جبھی میں نے سوچا۔ میں نے بہت چھپنے کی کوشش کی، لیکن جو گیا نے جانے اپنے من میں مجھے بلا کر مجھ سے پوچھ ہی لیا ہے۔

پھر دہی شروع کی جدائی اور آخر کا میل۔ معلوم ہوتا تھا آگیاری تک یہ دنیا اور اس کے قانون ہیں۔ اس کے بعد کوئی قانون ہم پر لاگو نہیں ہوتا۔

میں نے بڑھ کر جو گیا کے پاس پہنچتے ہوئے کہا۔ آج تم نے بڑا پیارا رنگ مُچنا

میرا اندازہ ٹھیک نہ تھا۔ جو گیا اور بجور کی ماؤں اور پنجاب نے مل کر بھابی کے ساتھ بات چللئی اور مُنہض کی کھائی۔ باپنو گھر کی عورتیں یوں ٹھیک تھیں۔ ان سے بایس کر لینا، ان کے ساتھ چیزوں کا تبادلہ بھی درست تھا۔ ایک آدھ کو اشارے سے رام کرنا اور چوری چھپے ان سے ہم بتری کر لینا بھی ٹھیک تھا لیکن ان کے ساتھ رشتے ناتے کی بات چلانا کسی طرح بھی درست نہیں تھا۔ پھر اور بھی بہت سی باتیں نکل آئیں جو ہمارے گھر اتی گھر دل کا و بال۔ ان کا زہر مٹی کا تیل اور کنواں ہوتی ہیں۔ جو گیا کی ماں لڑکی کو کچھ دے دلانے سکتی تھی۔ اسی لئے ہمارے گھر دل میں جب کوئی لڑکی جوان ہوتی ہے تو کچھ لوگ اس کی طرف دیکھ کر کہتے ہیں۔ تیار ہو گئی مرنے کو۔ خیر دینے دلانے کی بات پر میں تن کر کھڑا ہو گیا، لیکن اس کے بعد بھابی اور گیان بھون کی عورتوں نے دوسری باتیں شروع کر دیں۔ جو گیا کا باپ کون تھا؟ کوئی کہتی وہ مسلمان تھا اور کوئی بڑھیا گواہی دیتی وہ ایک پر تگالی تھا جو بڑودے میں بڑے عرصے تک رہا تھا۔ جو بھی ہو وہ سب باتیں تھیں۔ ایک بات جو تحقیق کے ساتھ مجھے معلوم ہوئی دہ یہ تھی کہ جو گیا کی ماں منادر کے براہمی دیوان کی دوسری بیوی تھی جسے قانون لے نہیں مانا۔ جو گیا اس دیوان کی لڑکی تھی مگر لوگ جو گیا کی ماں، ایک بیاہتا عورت کو دیوان صاحب کی رکھیل کہتے تھے۔ یہ اس قسم کے لوگ تھے۔ جنھوں نے جو گیا کی ماں کے کچھ بھی پلے پڑنے نہ دیا اور وہ بمبئی پلی آئی۔ کچھ بھی تھا، اس میں جو گیا کیا تصور تھا؟ وہ تو اپنے باپ کی موت کے قین ہمینے بعد پیدا ہوئی تھی اور باپ کی شفقت کا مُنہض تک نہ دیکھا۔ میں ان سب چیزوں کے خلاف چماد کرنے اور جو گیا کے ساتھ نہ پانہ پر رہنے کو تیار تھا لیکن باقی سب نے مل کر جو گیا کی ماں کو اتنا صدمہ پہنچایا کہ وہ مرنے کے قریب ہو گئی۔ اب وہ چاہتی تھی جلدی سے جلدی جو گیا کا ہاتھ کسی داجی گزارے والے مرد کے ہاتھ میں دے دے۔ میرے گھر والوں کی باتوں کے لارن وہ میری صورت سے بھی بیزار ہو گئی تھی۔ اس نے اپنی بیٹی سے صاف کہہ دیا تھا اگر اس نے مجھے

سے شادی کی بات بھی کی تو وہ کپڑوں پر تیل چھڑک کر جل مرے گی۔ جو گیا اب کافی نہ جاتی تھی اور باپوگھر کے جو گیاداے فلیٹ کے کوارٹ اکثر بند رہتے اور سہم تازہ ہوا کے ایک جھونکے کے لیے ترس گئے تھے۔

ایک شام مجھ پر بہت کڑی آئی۔ سر شام ہی چینگناڈ کے بڑے بڑے پر مجھ غریب پر سستئے لگے۔ کچھ دیر کے بعد۔ یوں لگا جیسے کوئی میری شرگ پر اپنا مٹھ رکھے تیزی سے ببری سانس چوس رہا ہے۔ جتنا میں اسے ہٹانے کی کوشش کرتا ہوں اتنا ہی اس کے دانت ببرے گلے میں گڑے جا رہے ہیں۔ ایسی شاموں کا رنگ سیاہ بھی نہیں ہوتا اور سفید بھی نہیں ہوتا ان کا صرف ایک ہی رنگ ہوتا ہے۔ — جبکہ اور جانکا ہی کارنگ اور جن لوگوں پر ایسی شا میں آتی ہیں وہی جانتے ہیں کہ ایسے میں صرف ماں کی چھاتیاں اور محبوبہ کی چھاتیاں ہی ان کو بچا سکتی ہیں۔ میری ماں مر چکی تھی اور جو گیا میری نہ ہو سکتی تھی ...  
افوہ۔ — اتنی گھٹٹن، اتنی ادا سی۔ — ادا سی کا بھی ایک رنگ ہوتا ہے۔

میلا میلا، چھدر را چھدرائ جیسے مٹھہ میں ریت کے بے شمار ذرے اور پھر اس میں ایک عغزت ہوتی ہے جس سے متی بھی ہوتی ہے اور نہیں بھی ہوتی۔ آخر آدمی دہاں پہنچ جاتا ہے جہاں سے احساس کی حدیں ختم ہو جاتی ہیں اور رنگوں کی پہچان جاتی رہتی ہے۔

صبح اٹھا تو میرا اس گھر، اس شہر، اس دنیا سے بھاگ جانے کو جی چاہتا تھا۔ اگر جو گیا کی ماں نہ ہوتی اور وہ بیرے ساتھ چلنے کو تیار ہو جاتی تو میں اُسے لے کر کہیں بھی نکل جاتا... جبھی مجھے بیراگی یاد آنے لگے، بدھ بھکشو یاد آنے لگے جو اس دنیا کو چھوڑ دیتے ہیں اور کہیں سے بھی بھکشا لے کر اپنے پیٹ میں ڈال لیتے ہیں اور پھر بیٹھ کر ”ادم منے پدمے“ کا درود کرنے لگتے ہیں۔

میں داقعی اس دنیا کو چھوڑ دینا چاہتا تھا لیکن سامنے باپوگھر میں جو گیا کے فلیٹ کا دروازہ کھلا اور جو گیا مجھے سامنے نظر آئی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ راتوں نہیں

سوئی۔ اس کے بال بیچر دکھئے تھے اور یو ہنی ادھر ادھر چہرے اور گلے میں پڑے تھے۔ اس نے نگھی اٹھائی اور بالوں میں کھبودی۔ کچھ دیر بعد وہ الماری کے پاس جا پہنچی... میں اسکول کی طرف مبارہا تھا۔ راستے میں سب عورتوں نے جو گیا کپڑے پہن رکھے تھے۔ انھیں کس نے بنایا تھا؟ وہ اس تھیں جیسے زندگی کی ماہیت جان لینے پر انھیں بھی کوئی بیراگ ہو گیا تھا۔ ان کے ہاتھوں میں کھڑتاں تھی اور مٹھے میں کھجن تھے جو نہ کسی کو دکھائی دے رہے تھے اور نہ سنائی دے رہے تھے۔ وہ ہجکشو بنی ایک دروازے سے دوسرے دروازے پر جا رہی تھیں اور انھیں کھٹکھٹا رہی تھیں لیکن اس بھرے شہر بمبیٹی میں کوئی انھیں ہجکشادی نہ کے لیے باہر نہ آ رہا تھا۔

اسکول پہنچا تو ہمیلت بدستور مہنس رہا تھا۔ آج اس نے پہل کی۔ بولا۔ ”شہر کی عورتوں نے آج کیا نگ پہن رکھا ہے؟“

میں اس بے حس آدمی کو جواب نہ دینا چاہتا تھا لیکن اپنے آپ ہی ہیرے مٹھے سے نکل گیا۔ ”آج سب جو گئیں بن گئی ہیں۔ سب نے بیراگ لے لیا ہے اور جو گیا پہن لیا ہے۔“

اس دن جس آسے اور سکیشی کو گل مہر کے نیچے سے پام کے پڑوں میں سے گھٹیتا ہوا باڑ کے پاس لے گیا۔ سامنے سڑک چل رہی تھی اور اس پر انسان کے پتکے ساکت تھے۔ ان بنے بیراگ پالیا تھا اور جو گیا کفناں پہنے بلا ارادہ بے مقصد ہٹھی پھٹی آنکھیں سے گھور رہے تھے جیسے اس دنیا میں کوئی مرد نہیں۔ کوئی عورت نہیں جسے ان کو جواب دینا ہے۔

میں نے ایک عورت کی طرف اشارہ کیا وہ جو گیا کپڑے پہنے ہاتھ میں کمنڈل لیے جا رہی تھی ہمیلت کھلکھلا کے ہنسا۔ ساتھ سکیشی بھی مہنسی جس نے جنیز پہن رکھی تھی اور اس کے کو لھئے اس کی رانیں نک دکھائی دے رہی تھیں۔ وہ پورے طور پر ماذل بن

چکی بھتی ...

جب ہمینت کی ہنسی بھتی تو اس نے کہا — ”تو بالکل پاگل ہو گیا ہے، جگل... کہاں ہیں جو گیا کپڑے؟ اس عورت نے تو ایک اُودی ساری پہن رکھی ہے اور وہ لمنڈل جو تجھے دکھائی دیتا ہے، ایک خوبصورت پرنس ہے“... سوکیشی نے بھی ہمینت کی تائید کی۔ میں حواس باختہ سڑک پر کھڑا سامنے دیکھتا رہا۔ جبھی ایک بس ڈرکی اور اس میں سے ایک لڑکی اُتری ... ”یہ کیسے ہو سکتا ہے؟“ میں نے اپنے آپ سے کہا — ”وہ جو گن ہے، جو گیا کپڑے پہنے ہوئے! ... میں کیا اندھا ہوں؟“ لیکن اپنی آنکھوں پر یقین کرنے کے لیے میں کچھ دیر دیں کھڑا رہا۔ کچھ دیر کے بعد مجھے یقین ہو گیا اور مجھے دیکھتے ہوئے میں نے آواز دی۔ ”ہمینت ...“

لیکن ہمینت اور سوکیشی ایک دوسرے کی بانہہ میں بانہہ ڈالے اندر جا چکے تھے ان کے قبھے سنائی دے رہے تھے۔ وہ مجھے ایسے ہی بے یار و مددگار اس صحراء کے کنٹھے چھوڑ گئے تھے جیسے لوگ کسی پاگل آدمی کو چھوڑ جاتے ہیں ... یہ بھی ان کی عنایت بھتی کہ انکھوں نے مجھے پتھر نہیں مارے تھے اور اسے ہی مجھے اولیا کہا تھا۔

اور وہ لڑکی اس طرف آرہی تھی۔ اب تو مجھے پوچھے سفار پر پھیلے ہوئے اس رنگ کے بارے میں کسی قسم کا شکا نہ تھا۔ اس سے پہلے کہ میں یقین اور ایمان کی بنند آواز کے ساتھ ہمینت اور سوکیشی کو پکارتا وہ لڑکی میرے قریب آ چکی تھی۔ میں نے ایک آواز سُنی — ”بیر“

اور میں نے چونک کر دیکھا۔ کسی دوسرے رنگ کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ کیونکہ وہ خود جو گیا تھی جسے میں نے اس صبح اپنے گیان بھون سے باپنوگھر کے کھلے دروازے میں سے اس بساریوں میں سے جو گیا رنگ کی ساری کا انتخاب کرتے دیکھا

تھا۔

ایک عجیب بے اختیاری کے عالم میں میں نے ایک قدم پڑھایا اور عجیب تر بے بسی کے عالم میں رک گیا۔ جو گیا بولی۔

”میں کل بڑدے سے جا رہی ہوں۔“

”کیوں جو گیا۔ بڑودے سے میں کیا ہے؟“

”میری نہیں ایال — وہاں میرا بیاہ ہو رہا ہے، پرسوں...“

”اوو...“

”میں تم سے ملنے آئی تھی۔“

”نولو۔“ میں جلنے کیا کہہ رہا تھا؟

اس وقت آرٹس اسکول کے کچھ لڑکے لڑکیاں، پرپل صابری اور کچھ دوسرے لوگ آجائ رہے تھے جبکہ جو گیانے اچک کرتے زور سے میرا منہ خوچوم لیا کہ میں بوکھلا اور لڑکھڑا کر رہ گیا۔ وہ اٹھا رہا نہیں برس کی لڑکی کی بجا شے سپنتیس چالیس برس کی ایک بھرپور عورت بن گئی تھی۔ اس کا بوسہ کتنا مرتعش تھا، کتنا مقدس و حشت ماشہوت تھی اس میں۔

اگر کچھ لوگ دیکھ بھی رہے تھے تو ہمیں وہ دکھائی نہ دیے۔

”وہ دیکھ بھی رہے تھے تو کیا کر سکتے تھے؟“ جاتے ہوئے جو گیانے کہا۔

”میرے جلنے کے بعد تم روئے تو میں تمھیں ماروں گی، ہاں“ اور ساتھ ہی اس نے مجھے مٹکا دکھایا۔

اور اس کے بعد جو گیا جلی گئی۔

سیرے گیان بھون اور بانپو گھر کے سامنے ایک دکٹروریہ کھڑی تھی جس پر بازار کا بوجھا اٹھانے والے کچھ سوٹ کیس اور کچھ ٹرنک لکھ رہے تھے اور کچھ یونہی را دھرا دھر کا سامان۔ ان لوگوں کو رخصت کرنے کے لیے بانپو گھر کے سب لوگ نیچے چلے آئے تھے۔

لیکن سامنے لیاں بھون سے میرے سوا کوئی نہ آیا تھا۔ موٹے بھیا اور بھابی تو کیا آتے  
معصوم ہیما کو بھی انھوں نے غسل خانے میں بند کر دیا تھا جہاں سے اس کے رونے کی  
آواز گلی میں آرہی تھی۔

پہلے بجور کی ماں اور پنجابن کے سہارے جو گیا کی ماں اتری اور گرتی پڑتی دکٹریہ  
میں بیٹھ گئی۔ نخواڑا سانس درست کیا اور پھر سب کی طرف پانچھ جوڑتے ہوئے بولی۔  
”اچھا بہنو، ہم چلتے بھلے، تم بستے بھلے۔“  
اور پھر آئی۔—جو گیا!

جو گیا نے ہلکے گلابی رنگ کی ایک خوبصورت ساری پہن رکھی تھی اور گلاب ہی کا  
پھول محنت اور خوبصورتی سے بنائے ہوئے جوڑے میں ٹانک رکھا تھا۔ ابھی دہ  
دکٹریہ میں بیٹھی بھی نہ تھی کہ اگیاری کا پارسی پر دہت ادھر آنکلا۔ میں نے عادتاً  
کہا۔—”صاحب جی“

”صاحب جی“ پارسی پر دہت نے کہا اور پھر مجھے اور جو گیا کو تقریباً ایک ساتھ  
کھڑے دیکھ کر مسکرا یا، آشیرداد میں پانچھ اٹھائے اور مُسٹھ میں ٹندا دستا کا جاپ کرتا ہوا  
چلا گیا۔ جو گیا گاڑی میں بیٹھی تو اس کے ہونڈوں پر مسکرا ہٹ تھی۔  
جب میں بھی مسکرا دیا!

# بِسْلَمٍ

در باری لال، نشام گھر، ہی میں بیٹھا، سیتا کے ساتھ بیکار ہو رہا تھا۔

کسی کے ساتھ بیکار ہونا اس حالت کو کہتے ہیں جب آدمی دیکھنے میں ایونگ بوز پا غالب کی غزل میں پڑھ رہا ہو لیکن خیالوں میں کسی سیتا کے ساتھ غرق ہو۔

سیتا نے تو کہا تھا وہ ٹھیک چھنبجھے آر و راسینما کی طرف سے آئے دالی سڑک کے موڑ پر کھڑی ہو گی۔ اس کی ساری صورت کا سنی ہو گا، لیکن —

در باری کنگز سرکل میں رہتا تھا جس کا نام اب ہمیشوری اُو بیان ہو گیا ہے۔ وہ لادڈا پسکر دل کی ایک فرم میں کام کرتا تھا۔ آمد فی تو کوئی خاص نہیں تھی لیکن پیسے کی کمی بھی نہ تھی۔ باپ رہتا گردھاری لال نے ایک ہی دن کی فار در ڈر پیدا نگ میں تین چار لاکھ روپے بنائے تھے اور پھر ایکا! ایکی ہاتھ کھینچ لیے جواب تک کھینچنے ہوئے تھے۔ آج بھی کاشن ایک پیسے میں ان کے ساتھی رہتا صاحب کے ملکھن میں سے بال کی طرح سے نکل جانے پر گالیاں دیتے تو وہ جواب میں ہنس دیتے — ایسی ہنسی جو آدمی تین چار لاکھ روپے اندر ڈال کر ہی ہنس سکتے ہے!

پھر بڑے بھائی بہاری لال کی شادی مارو اڑیوں کے گھر میں ہوئی تھی، جنہوں نے میں سیر سونے کے کڑے اپنی لڑکی کے ہاتھوں میں ڈالے اور یوں اسے درباری کی بھائی بنا دیا۔ برس ایک بعد درباری کی اپنی بہن، ستونتی نار، ایک لکھ پتی اسماعیلی صالح محمد کے ساتھ بھاگ گئی اور نکاح کر لیا۔ گلی، محلے پورے شہر میں ہنگامہ ہوا۔ برسوں مہتا صاحب نے لڑکی اور داماد دونوں کو ”پرمیم کٹیر“ — اپنے گھر میں گھسنے نہ دیا۔ آخر من منتو ہو گئی۔ لڑکے کے رشتے دار کہتے تھے لڑکی کو مشترف بہ اسلام کیا گیا ہے اور اس کا نام کنیز فاطمہ ہے اور مہتا صاحب کہتے تھے۔ لڑکے کو شدھ کرنے کے بعد اس کا نام سرداری مونہن رکھا گیا ہے لیکن سرداری مونہن یا صالح محمد اپنے نام سہیشہ ایس ایم فواب ہی لکھا کرتا۔ چونکہ لڑکے کی اس قبیح حرکت پر غصہ نکالنے کا اور کوئی ذریعہ نہ تھا۔ اس لئے درباری لال کے حواری جب بھی ستونتی نار کے پتی یا شوہر سے ملتے تو یہی کہتے — ”یوں بے صالح ...؟“

آج صالح یا سرداری اور ستونتی دونوں گھر پر تھے اور ان کے دد پچے بھی۔ اس سکے بہاری اور بھائی گن دتی نے مل کر درباری کی شادی کا مسئلہ چھپڑ دیا۔ عورتیں مثالی مرد اور مرد مثالی عورت کی باتیں کرتے کرتے آپس میں انجمنے لگے۔ درباری برآمدے میں بیٹھا، اپنے بارے میں ساری گفتگو سن رہا تھا۔ ایکا ایکی دہلپکا اور اپنے منہ کے لاود اسپیکر کو کھڑکی میں سے اندر کرتے ہوئے بولا — ”میں درباری لال مہتا، دل دگرو ہماری لال مہتا، ساکن بھبھی ہرگز شادی نہیں کروں گا۔“... سب اس آواز پر چونک گئے، عورتوں اور بچوں کی توجان ہی نکل گئی۔

درباری لال داپس اپنی جگہ پر آ کر ایونگ نیوز کے درق اللہتے لگا اور کھرا درور آئیا کی طرف سے گھر کو مرٹی ہوئی سڑک پر دیکھنے لگا، جہاں اسے کاشنی رنگ کی ساری ہی کی تلاش تھی۔ اندھے سب سبز رہے تھے۔ ماں بھی ان میں آکر شامل ہو گئی تھی۔ درباری گھر مجربرا کا بالکا تھا۔ جس طریقے سے وہ بالوں پر پیٹر ناک لگاتا، محنت سے ان کو بچاتا، پیچنی لے کر آئیئے

ہے۔ جوگی...“

”میں جانتی تھی تم اسے پسند کر دے گے۔“

”تم کیسے جانتی تھیں؟“

”ایسے ہی... کبھی کبھی تمہارا من میرے من میں آ جاتا ہے۔“

”ہوں“ میں نے سوچتے ہوئے کہا۔ ”آج تمہیں چھونے، ہاتھ لگانے کو بھی جی نہیں چاہتا۔“

”کیا چاہتا ہے؟“

اس وقت ایک دکھڑیہ ہم دونوں کے بیچ آگئی جسے نکلنے میں صدیاں لگیں میری نگاہیں پھر جھیلوں میں تیرنے، چھیننے اڑانے لگیں۔ جب تک ہم پرس امریٹ کا چوراہا پار کر کے پاس آچکے تھے جہاں سے ہمارے راستے جدا ہوتے تھے۔ میں نے کہا۔ ”آج جی چاہتا ہے سر تمہارے پر دل پر رکھ دل اور روڈل۔“

”روڈل؟—کیوں؟“

”شارستہ کہتے ہیں آنکے پاپ رونے ہی سے دھل سکتے ہیں۔“

”کون سا پاپ کیا ہے تمہاری آنکے؟“

”ایسا پاپ جو میرا شریر نہ کر سکا۔“

ایسی باتوں کو عورتیں بالکل نہیں سمجھتیں اور یا پھر ضرورت سے زیادہ سمجھ جاتی ہیں۔ جو گیانہ سمجھ سکی۔ اپنا کوئی بچار اس کے من میں چلا آیا تھا۔ ”جانتے ہو میرا جی کیا چاہتا ہے؟“

”کیا—کیا؟“ میں نے بے صبری سے پوچھا۔

”چاہتا ہے“ اس نے اپنی ہلکے نیلے رنگ کی سارنی کی طرف شارہ کرتے ہوئے کہا۔

”تمہیں اس میں چھپا کر ان امبروں پر اڑ جاؤں، جہاں سے آپ ہی والیں آؤں،“

نہ تھیں آنے دوں ” اور یہ کہتے ہوئے جو گیا نے ایک بار اوپر، ہلکے نیلے رنگ کے آسمان کی طرف دیکھا جہاں سے وہ کبھی آئی تھی —

میں کچھ دیر کے لیے دیہیں تھم گیا اور ان خوش نصیبوں کے بعد میں سوچنے لگا جنھیں جو گیا اسی سند ریاں اپنے دامن میں چھپا کر امبر دل پر لے گئیں جہاں سے وہ خود آئیں اور نہ انھیں آنے دیا۔ خدا بھی ان کے پاس سے گزراتا ایک سرداہ بھر کر چلا گیا ۔

**مرٹ کے دیکھاتو جو گیا جاہلی تھی ۔**

امبر تو کہاں، جو گیا مجھے تھتی ہوئی زمین اور نوٹی پھولی سڑک کے ایک طرف اکیلا،  
بے یار دمدگار جھوڑ گئی تھی جس کا حساس مجھے خاصی دیر کے بعد ہوا۔ حدت سے بھٹتی  
ہوئی سڑک کی درازوں میں گھوڑا اگاڑیوں کے بڑے بڑے پہنچنے پر ہے تھے اور ان  
کے ڈرائیور پیشانیوں پر سے پسینہ پوچھتے اور ہر اور ہر تبرے سنتے ہوئے جا رہے تھے۔  
جبھی میں نے دیکھا خنک آب کی سی کوئی موج چلی آرہی ہے۔ وہ کوئی اور جوان لڑکی تھی  
لابی، اور بخوبی باب کیے ہوئے بال۔ وہ ہلکے نیلے رنگ کی شوار پہنے ہوئے تھی ！

چند قدم اور آگے گیا تو ایک نہیں، دو، تین، چار عورتیں ہلکے نیلے رنگ کے  
کپڑے پہننے ہوئے شاپنگ کرتی پھر رہی تھیں !

یہ تجربہ مجھے پہلی بار نہیں ہوا تھا۔ اس سے پہلے بھی ایک بار کرا فورڈ مارکیٹ کے  
غلانے میں آنے جانے والی سب عورتوں نے دعائی لباس پہن رکھا تھا۔ فرق تھا تو صرف  
آنسا کسی کی اور حصی دھلائی تھی اور کسی کی سلادی۔ اسکرٹ بھی دھانی تھے اور میں سوچتا رہ  
گیا تھا — سویرے جب یہ عورتیں نہاد ہو گر بالوں کو چھاٹتی بناتی ہوئی گپڑوں کی الماری  
کے پاس پہنچتی ہیں تو ان میں کوئی بات، کون، بیبا جذبہ ہے جو انھیں بتا دیتا ہے —  
آج مولسوی پہننا چاہیے؟ یہ تو سمجھ میں آتا ہے کہ ایک دن کوئی نارنجی رنگ استعمال کرتی ہے

تو پھر اس سے اس کی طبیعت ادب جاتی ہے اور پھر دوسرے دن اس کا ہاتھ پانے کسی دوسرے زنگ کی طرف اٹھ جاتا ہے مثلاً سرسوں کا ساپیلارنگ، چمپیٹی رنگ، گل اناری کاسنی، فرڈزی... لیکن — وہ کونسا بنتے تار بر قی کا عمل ہے جس سے وہ سب کی سب ایک دوسری کو تباہیتی ہیں اور پھر ایکا ایکی پورا بازار پورا سنوار ایک ہی رنگ سے زنگ جاتا ہے؟ شاید یہ موسم کی بات ہے یا دیسے ہی چاند کی، بادل کی... شاید کوئی مرد ج نیشن، کسی ایکٹریس کا لباس ہے جو ان کے انتخاب میں دخل رکھتا ہے؟... نہیں الی ڈی کوئی بات نہیں۔ بعض اوقات وہ زنگارنگ کپڑے بھی پہنچتی ہیں اور کیا کچھ مرد کی آنکھوں کے سامنے لہرا دیتی ہیں۔

اس دن سب کی ساریاں بلکے نیلے زنگ کی دیکھ کر میری آنکھوں کو لقین نہیں آ رہا تھا۔ سمجھ کا شتمہ بھر بھی دماغ میں نہ کھس سکتا تھا۔ میں اسکوں پہنچا تو ایک کلاس ختم ہو چکی تھی اور لڑکے لڑکیاں باہر آ رہے تھے۔ کچھ آگے کیا ڈنڈا۔ میں کے گل مہر کے نیچے کھڑے ہو گئے۔ ان میں سکیشی بھی تھی۔ اس کے اسکرٹ کا بھی زنگ نیلا تھا —!

اگر سہیئت نیڑا روستا دہاں نہ مل جاتا تو میں پا گل ہو جاتا۔ سہیئت یوں تو خزانہ کو کہتے ہیں لیکن وہ حقیقت میں وہ سخت تھا — بہار جو اس پر سہیش چھائی رہتی تھی۔ دنیا بھر میں کہیں، کسی جگہ بھی ایکری موسم نہیں رہتا اور نہ ایک زنگ رہتا ہے لیکن اس کے چہرے پر سہیش ایکا ہی سی ہنسی اور تفہیک رہتی تھی جس کے کارن بہم اسے کہا کرتے تھے۔ سالے اچا ہے کتنا زور لگائے تو کبھی آرٹ ٹھنڈ نہیں بن سکتا۔ کیا تجھ پر گریبان پھاڑ کر باہر بھاگ جانے کی نوبت آئی ہے؟ بے بسی میں تشنی ہاتھ تو نے ہوا میں پھیلائے ہیں اور اپنے یالی ہذپھے ہیں؟ کیا تیرے بدن پر ایکا ایکی لاکھوں ڈبے ریختے ہیں؟ رات کے وقت انہیں میں چمگا درج تجھ پر جھپٹے ہیں اسدا اپنا سُنھہ تیری شرگ سے لگا کر تیر اخون چو سن ہے؟ کیا تو اس وقت پھوٹ کی طرح رہ دیا ہے جب...

تیری تصویر انعامی مقابلے میں اول آئی؟ کیا تجھے ایسا محسوس ہوا ہے کہ مال بآپ ہوتے ہوئے بھی تو میکم ہے اور دوست ایک ایک کر کے تجھے اندھے کنوئیں جو دھکنیں کر چل دیسے ہیں؟ کیا تو نے جانا ہے جس منصور کو سولی پر پڑھایا گیا تھا، ویکھنے کی وجہ تیرے چہرے پر سیاہیاں چھٹیں ہیں اور تیرے خدوخال اتنے سخت، گھناؤ ہے اور طاقتور ہوئے ہیں جتنے میکسیکو کے میور لز؟ کیا تجھے ہر لمبے تری چیز ایک بندگ اور پیڑی کی چاندھی یونی معلوم ہوئی ہے جس سے متوجہ ہو کر ...

آج پھر میں نے اسے بنایا۔ شہر کی سب عورتیں بلکا نیلا پہنچنے تک آئی ہیں۔

ہمینت نے اپنے دانت دکھادیے اور حسبِ معمول میرا نہ آق اڑا نے گا۔ وہ مجھے ساروں کا اندھا سمجھتا تھا۔ جسے ہر طرف ہرا ہی ہرا دکھائی دیتا ہے۔ میں نے سکیشی کی طرف اشارا کیا جسے ہم ماذل کہا کرتے تھے۔ وہ آج تک کسی کی ماذل نہ بنی تھی لیکن اس کے بعد کے خطوط بالکل دیسی ہلکے کھول کے تھے۔ میں نے کہا۔ ”دیکھو آج یہ دھمکی ہلکے نیچلے بندگ کا سکرٹ پہنچنے ہوئے ہے ...“

ہمینت نے مجھے کچھ نہ کہا۔ وہ میرا ہاتھ پکڑ کر گھیٹتا ہوا، کمپونڈ سے لان پر سے آیا جو پام کے پیڑوں سے پشا پڑا تھا۔ وہاں ایک کنارے پر پہنچ کر وہ باڑ کے سیچھے کھرا ہو گیا۔ جہاں سے سامنے مردک دکھائی دیتی تھی۔ ایک راستہ کر انورڈ ملکیٹ کی طرف جاتا اور دسرہ دکھوڑیہ ٹرمینس اور پارن بی روڈ کی طرف۔ وہ ثابت کرنا چاہتا تھا یہ سب میرا دہم ہے دہاں پہنچے تو کوئی عورت ہی نہ تھی۔ اگر عورتیں اپنے اپنے ہمراووں کو ہلکے نیلے رنگ کی ساریوں میں چھپا کر اپر، ام بردار پر اڑ گئی ہوتیں تو دہنہ سر دنظر نہ آتے۔ لیکن — چاروں طرف مرد ہی مرد تھے اور دہیوں گھوم پھر رہے تھے جیسے کسی عورت سے سرد کا رہی نہیں۔ کوئی لا بننا تھا اور کوئی نام۔ کوئی خوبصورت اور کوئی بد صورت اور تو نہ ہلا۔ اور وہ سب بھاگ رہے تھے جیسے انہیں کسی عورت کو جواب نہیں دینا

ہے۔ جبھی ادھر سے جیسے لوہے کی بنی ہوئی، گھاٹن گذری جس نے ہرے رنگ کا کاشٹ لگا رکھا تھا۔ اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ہمینت بولا۔ ”پہچان اپنی اس ماں کو ..“ میں نے بیکار کی عذرداری کی۔ ”میں ان یچاری غریب مردوں کی بات نہیں کرتا۔“ ”کن کی کرنے ہو؟“

”ان کی۔ جن کے پاس کپڑے تو ہوں۔“

جبھی میری بد قسمتی سے ایک سیدان، سامنے پارسی داؤ والے کے ہاں رکی۔ اس میں ادھیر عمر کی ایک عورت بیٹھی تھی۔ وہ اس جماعت کی نامنده تھی جن کے پاس نہ صرف کپڑے ہوتے ہیں بلکہ بے شمار ہوتے ہیں اور رنگ اتنی انواع کے کہ وہ بوكھلا جاتی ہیں اسی لیے جب وہ اپنے دار ڈرب کے سامنے کھڑی ہوتی ہیں تو انہیں سندھیوں کا وہ بے تار بر قی کا پیغام نہیں آتا۔ ان کی حالت اس خریدار کی ہوتی ہے جس کے سامنے کوئی دکاندار انواع د اقسام کا ڈھیر لگادے اور وہ ان میں سے کچھ بھی نہ چن سکیں۔ وہ عورت خوب پی پی ہوتی تھی اور اس نے ایک شعلہ رنگ ساری پہن رکھی تھی۔ پچاس فیٹ چوڑی سڑک کے اس پار سے مجھے اس کی وجہ سے گری لگ رہی تھی لیکن اسے اس بات کا احساس نہ تھا کہ باہر آگ برس رہی ہے جس میں ایسا شعلے کا سارنگ نہ چلے گا۔

اس عورت کا نوکر جو تھوڑی دیر پہلے پرست کے کاغذ سنبھالتا ہوا اندر گیا تھا، ایک ٹوکری میں کچھ دسلی اور چند بیڑ کی بولیں رکھے ہوئے باہر چلا آیا اور دیکھوں کر اس میں رکھنے لگا۔ جب تک میں ہمینت کے سامنے خفیف ہو چکا تھا اپنی خفت کو چھپانے کے لیے میں نے کہا —

”یہ بیڑ کی بولیں ... کم از کم اس کے مرد کو تو گرمی لگتی ہے۔“

ایسے ہی میں ہمینت کے سامنے کسی بار شرمندہ ہوا۔ ایک آدھ بار مجھے اسے شرمسار کرنے کا موقع مل گیا جبکہ سب عورتیں سرمی ساڑیاں پہنے سڑک پر چلی آئی تھیں۔ مجھے

ہمیشہ ان کے رنگ ایک سے لگتے تھے لیکن جب ہمینت میرا کان پکڑ کر مجھے باہر لاتا تو مجھے وہ الگ الگ دلکھائی دیئے لگتے۔ آخر یہی نے اسے اپنے دل کا واہمہ سمجھ کر ان باتوں کا خیال ہی چھوڑ دیا۔ لیکن — دہ چھوٹتا کیسے؟ ایک دن جو گیلنے کا لے بلاڈ اور خاکستری رنگ کی ساری کابیخدا خوبصورت امتزاج پیدا کیا تھا۔ اس دن سب عورتوں نے یہی کمبی میشن کر لکھا تھا۔ فرق تھا تو صرف اتنا کہ ان میں کسی کا بلاڈ خاکستری تھا تو ساری کا لے رنگ کی ختنی جس میں سہرے کی ایک آدھنار جھبلمار ہی تھی۔

کئی موسم بعد ہے۔ خواں گئی تو بہار آتی۔ یعنی جس قسم کی خواں اور بہار بھی ہیں آسکتی ہے اور پھر اس بہار میں ایک کاٹش سی پیدا ہوئی شروع ہوتی۔ ایک چھین ٹیکھی کی ایک لذت چلی آتی جو محبت اور کامرانی کو حدود رجھ گذاز کرتی ہے اور جذبوں کی آنکھوں میں آنسو چلے آتے ہیں۔ پھر کہیں ہرا زیادہ پرا ہو گیا اور اس پر تازگی اور شگفتگی کی ایک لہر دوڑ گئی۔ چیزے بارش کے ڈوچپینیوں کے بیچ سُبک سی ہوا پانی پر دوشاہ بُن دیتی ہے۔ پھر سمندر میں اس قدر زمرہ گھلا کہ نائم ہو گیا اور اس میں مچھلیوں کی چاندیاں چمکنے لگیں۔ آخر وہ چاندیاں تڑپ تڑپ کر اپنے آپ کو ماہی گیروں کے حوالے کرنے لگیں۔ پھر آسمان پر صوت و تحلی کا ٹکراؤ ہوا۔ بادل گرجے، بھائی تڑپی اور یک ایک چھا جوں پانی بر سے لگا۔ اس عرصے میں جو گیانے کئی نیے پیلے اددے کا لئے سردی اور سرمنی دھانی اور جمپی رنگ بدے۔ اسے کتنی جلدی تھی لڑکی سے عورت بن جانے کی اور پھر عورت سے ماں ہو جانے کی۔ مجھے لفیقین تھا کہ اتنی صحت مند رہی کے جب پچھے پیدا ہوں گے، جڑوں ہوں گے۔ بلکہ تین چار بھی ہو سکتے ہیں۔ میں انھیں کیسے سنبھالوں گا؟ اور اس خیال کے آتے ہی میں ہمنے لگا۔

ان بُنوں جو گیا اپنی بیمار ماں کے پیر پکڑ کر اس سے لپ اشک لگانے کی اجازت بھی لے چکی تھی۔ ایک طرف زندگی دھیرے دھیرے بھجھی جا رہی تھی اور دوسری طرف لپک لپک کر کھل رہی تھی۔ جو گیانے لپ اشک استعمال کرنے کی اجازت تو ہے لی تھی لیکن اتنی ساری پوں

اتنے رنگوں کے لئے اتنے لپ اشک کہاں سے لاتی؟ میں نے ایک دن میکس فلکٹر کی لپ اشک خرید کر تھے میں جو گیا کو دی تو وہ کتنا خوش ہوتی۔ جیسے میں نے کسی بہت بڑے راز کی کلید اس کے ہاتھ میں دے دی ہو۔ وہ بھول ہی گئی کہ وہ میرے ساتھ گرام کے ٹرام کے پئے پر کھڑی ہے۔ وہ مجھ سے لپٹ گئی۔ اس کے فوراً ہی بعد اس کی آنکھیں میڈیں اندر دھنس گئیں اور نمی سے باہر چھکلنے لگی۔ میں سمجھ گیا جو گیا۔ بجد جذباتی لڑکی ہے۔ بھلا میرے سامنے اتنی حمnoon دکھائی دینے کی کیا ضرورت تھی، لیکن بات دوسرا تھی۔ جس رنگ کی میں لپ اشک لاپا تھا۔ اس سے میچ کرتی ہوتی ساری جو گیا کے پاس نہ تھی اور نہ خریدنے کے لیے پیسے تھے۔ میرے پاس بھی اتنے پیسے نہ تھے جن سے کوئی خوبصورت سی ساری خرید کر اسے فرے سکتا۔ میں نے تو لپ اشک کے پیسے بھی موٹے بھسیا کی جیب سے چڑائے تھے اور یا بھابی کے ساتھ اس عشق میں بٹوڑے تھے جس کا حق صرف دیور ہی کو ہنچتا ہے۔

برسات ختم ہونی تو ایک تماشہ ہوا۔ جو گیا نے گھر میں بڑوں کے وقت کے پڑے ہوئے کچھ عقیقی بیج ڈالے اور میری لپ اشک کے ساتھ میچ کرتی ہوتی ایک ساری خریدی۔ اس بات کا مجھے کہاں پتا چلتا لیکن ہمارے گھر میں ایک مخزن تھی۔ جو گیا کی سہیلی ہےجا... جو گیا نے نارنجی سبز رنگ کی ساری پہنچی اور حب ہم اگیاری پار، لاقانو نیت کے جنگل میں ملے تو میں نے جو گیا کو چھپیرا۔ — ”جانتی ہو، جو گیا! آج تم کیا لگتی ہو؟“  
”کیا لگتی ہوں؟“

”بیر بہوتی... جو برسات ہوتے ہی نکل آتی ہے“  
جو گیا کے دل میں کوئی شرارت آتی۔ میری طرف دیکھتے ہوئے بوی۔ — ”جانتے ہو تم کون ہو؟“  
”؟“

”بیر۔۔۔ اور میں بیر بہوتی۔۔۔“

اور اس کے بعد جو گیا اس قدر لان ہوا بھاگ گئی کہ اس کے چہرے کے رنگ اور ساری کے رنگ میں ذرا سا بھی فرق نہ رہا۔

اس دن سب عورتیں نے نار بھی رنگ کے پکڑے پہن رکھے تھے۔ اپنی آنکھوں کے اس جلوس کی تاب نہ لا کر میں نے پھر ہمینت سے کہہ دیا۔ اب کے ہمینت نے ایکلے ہمیں، تین چار لڑکوں کو ساتھ لیا! اور شاہراہ عام پر میری بے عزتی کی۔ شاید مجھے اتنا بے عزتی کا احساس نہ ہوتا اگر سوکھیتی وہاں نہ آ جاتی جو سفید نائیلوں کی ساری پہنے ہوئے تھی اور اس میں تقریباً نیکی نظر آ رہی تھی۔ — وہ روز بروز صحیح کاموڈل ہونی جا رہی تھی۔ جو گیا کو بیر بھوٹی بننے کی کتنی خواہش تھی۔ اس کا مجھے روح کی گھر ایلوں تک سے نہ اڑہ سختا لیکن میں کچھ نہ کر سکتا تھا سوائے اس کے کہ میں اسکول سے پاس ہو کر نکل جاؤں اور کوئی اچھی سی نوکری کر لوں اور یا تصویریں بناؤ کر مالا بار ہل موردار ڈن روڈ کے جھوٹے وققیہ شناسوں کو اونے پونے میں بیج دوں۔ لیکن ان سب باتوں کے لئے وقت چاہیے تھا جو میرے پاس تو بہت تھا۔ لھوڑا بہت جو گیا کے پاس بھی تھا لیکن اس کی ماں کے پاس نہ تھا، جنت اور مشقت کی وجہ سے جسے کوئی کرم ردگ لگ گیا تھا۔

میں اس انتظار میں تھا کہ ایک دن بھابی اور موٹے بھیا سے کہہ دوں۔ لیکن مجھے اس کی ضرورت ہی نہ پڑی۔ ہمما، باپو گھر میں جو گیا کے پیار دلاد لیتی ہوئی ایکا، میں اپنے گھر میں آدمیکی اور دھڑ سے کہہ ڈالا۔ — ”کاکا! کیوں ہمیں تم جو گیا سے بیاہ کر لیتے؟“ جبھی میں نے کہا۔ — ”دھت“

یہ ”دھت“ اگر میں ہی کہتا تو کوئی بات نہ تھی۔ کچھ دنوں بعد مہیا کی اس ٹائیڈ میں پر بھیا اور بھابی نے اُسے ڈانٹنا شروع کر دیا اور ایک دن تو بھابی نے اس معصوم کو ایسا طما نچہ مارا کہ وہ الٹ کر دہیز پر جا گری۔ اس دن میرا ما تھا ٹھنکا۔ مجھے یوں لگا جیسے اس بارے میں دنوں گھروں کے بیچ میں کوئی بات ہوئی ہے۔

کے ساتھ گھنٹہ دوڑا ملتے و نجپور کی ڈالیں۔ رانیتا سب، باپن کل دیں ہی تو تھی۔ بت دیا یہ ہے کہ شدی تھیں عمر کے ۲۰ سوچیں را کیں لڑکوں کی سی درجہں۔ نے لگتے ہیں اور لڑکوں کی ۵۔ پھر نادی دفعے۔ آپس میں ملتے ہیں تب کہیں جا کر اپنا اپنا کام سنبھلتے ہیں۔ ..... من لی ان رکتوں کو دکھنے لگ کر کی سورتیں کہتی تھیں: یہ سب شادی کی بیوی ہیں۔ ..... ——ہر بادی کی!

برآمدے ہیں سکھ رکھاں نے جانی کا۔ ..... ۱۴۳۷ یوں شروع کیا تھا۔ وہ دن بھر ایک بے شکل بے قابو اور کھڑی سی کلڑی تو چیلی۔ اس پر رندہ کرنارا تھا اور اسی پر سا۔ سے گھر میں لکڑی کے چھلکے اور پھیلیں مجھ د بدقیقیں اور ہر دین میں ہر دن نیہیں۔ ..... چھم سستے ڈان باسکوا سکول میں تھنٹی بھج۔ ..... صید سنبھل تھیں اور بیلی نیلی لکڑی پہنے ہوئے نزکے ایک درجے پر گرتے پڑتے ہیں۔ اُن کے زوال۔ ..... خلے۔ شاید وہ شام کی بیوی کے یہ گھبے کی ہڑت جا رہتے ہیں۔ سکول کی گزاوند ہیں، سافر غل پہنے ابھی تک فاد بچوں کو فٹ ہال بھلا رہا تھا۔ ..... یہ بھی سنبھلی، بودی کھیل ختم کر دیا مر سینا نہ آئی۔ ..... اور اسہنما کی طرف سے احمد آنے والی سڑب پھوکا بیٹ اسی سی بھی تھیں اور جگاؤ تھی تھیں۔ پھر اس جانب نے ایک آنہ مل کا۔ ..... اسی اور دیگر طرف کی بیٹوں کے بھیجے دیا ہے۔ ..... بھی یہ ہوئی سی طب۔ ..... تھے برو۔ ..... دلھلن دی۔ اس کے تیکھے مداری ہوں اپنی دہن۔ ..... ۱۸۱۷۔ بائی۔ ..... دشی مٹھی۔ ..... اور چہ دوسری طوریت اور بیٹیں ہیں۔ ..... اماڑا میں ایک بیٹے سے کافی ناتھ تھے۔ تاہم کہ یہاں دیہ برقی کے ہاں تے۔ تھے حلمہ سور باتفاق جیسے دو ہیں۔ ..... دوسرے سے دشیت از صیحہ اور عجیب۔ ..... جو کیسی نہیں تھے۔

پہنچاں جانتے تھی طب تھے۔ ..... زیارتی۔ ..... بیشتر طبع آج بھی اس کی گودیں بھی تھیں۔ ..... بیل!

بُل ایک تند رست بچھے تھا۔ گول مٹول، نہ مڑھ، یہ سخنگو کا بننا ہوا۔ اس نے یون تو کئی دانتے نکال لیے۔ تھے یہ کہنے پر، کے دو دانت نہیں بٹھے سے تھے۔ کمینہ ہنستا تو والٹ دُنی کا خروش معلوم ہوتا۔ آج تک تویی ایسا دکھ اُنہی نہ دیا، جو بُل کو ہنستے دیکھو۔ بے اختیارت ہنس دیا ہو۔

”بُل“ درباری نے پکارا اور ہاتھ پچے کی طرف کھیلا دیے۔ مُسکراتے ہوئے بُل نے درباری کی طرف دیکھا اور اندر کی کسی بے بُس سی تحریک سے ایک ایک دباری کی طرف ہمکنا شروع کر دیا۔ بے دایوں مال مصہد سے سنبھالانہ جارہا تھا۔

”کھبہ“ و ”درداری“ نے کہا اور کمرہ مرا یعنے کے لیے اندر لپک گیا۔ وہ یہ بھی بھول گیا کہ سیتا آئے کی اور علی جائے گی۔ بُل کے چہرے پر ایک پُر خلوص مایوسی کی لہر دڑھنی اور پل بھر میں ودیاں دوسارے نگاہیے کہہ۔ ہا جو ————— یہ ساری دنیا دھوکا ہے۔ پھر جیسے وہ مایوس ہر دہ تھا، ایسے ہی درباری کو آتے دیکھ کر خوش بھی ہو گیا۔

بُل کی ماں، مصری ایک بہکارن تھی۔ احتیاج کی بنا پر اتنی حصہ ٹھیک عمر میں اس نے بُل اور بھیب مانگنے کا فن سکھا دیا تھا۔ بازار میں جاتی ہوئی وہ باپو فرم کے کسی بھی آدمی کے پاس بُغڑی ہدیتی اور بُل ایک یہہ سل کیے ہوئے ایکڑ کی طرح اس آدمی کی دھوکی یا قیص کو کھینچنے ملتا ہے۔ اس چیز کی طرف اٹھا۔ نہ نے لگت جو اسے مطلوب ہوتی۔ آدمی دیکھتا، نظریں بچاتا، پھر بُل اسے دیکھتا۔ اور بے خدا یہ وہ چیز خرد کر بُل کے ہاتھ میں کھندا دیتا۔ مصری باپو کے چلنے جانے کے بعد، بُل نے ہاتھ سے وہ چیز کے لیتی اور دکاندار کو واپس کر کے پیسے کھرے کر لیتی۔ — بُل ردتا چلا آتا رہ جاتا۔

لیکن درباری کے ساتھ بُل اور اس کی ماں مصری کا رشتہ ایسا نہ تھا۔ کُمرے کرنے سچنے کا سوال سی بھاول۔ بھاول تھا؟ کُمرے کے ساتھ مصری کو سیدھے دوئی یا چوئی مل جاتی تھی۔ جس سے بُل کو کوئی بھوکھے۔ بھتی۔ اُسے تو اپنا کُمرہ پہیے تھا، جسے ماں نہیں حسینہ تھی اور نہ

کسی دکاند اکو دیتی تھی۔ کُمراوہ سیدھا منہ میں ڈال لیتا اور دانتوں میں پوپ لئے ہوئے ہمکر۔  
ہمکر کر، اچھل اچھل کر اپنی خوشنودی کا اظہار کرتا... آج جب درباری نے بیل کو گود میں  
اٹھایا تو ایک بھی بار میں کُمراے سے مٹھی بھرتے ہوئے وہ ماں کی طرف لوٹنے پہنچنے لگا۔  
درباری نے بیل کو بہت روکا، پیارہ دلار کی کوشش کی، لیکن وہ بھلاکہاں ماننے والا تھا۔ اول  
اول کرتا ہوا وہ تو جیسے ماں کی طرف گراہی جا رہا تھا —

درباری نے کہا۔ — مکینے.... سائے....

اندر سے صالح یا سرداری کی آواز آئی۔ کیا حکم ہے حضور؟

”اپ کو عرض نہیں کی، فیض گنجوڑ“ درباری نے اندر کی طرف منہ کرنے ہوئے جواب  
دیا اور پھر بیل کے پیارے دلار سے سے گالوں پر چیختنگاتے اسے ماں کو لوٹاتے ہوئے  
بولائی۔ اتنا خود غرض؟... سلام نہ دعا، شکریہ نہ دھنیہ واد... کام نکل گیا تو اب تو کون  
اوڑیں کون؟“

مصری، نٹ پانچ کی زندگی نے شرم کو جس کے لیے ایک تکلف بنادیا تھا۔ بے باکی سے  
بولی۔ یہ سب ایسے ہی ہوتے ہیں، بالogy!“ اور پھر بیل کو چھاتی میں چھپا تی، وہیں کھڑی وہ اپنی  
دوستی یا چونی کا انتظار کرنے لگی۔

بیل سہیش کی طرح الٹ نہیں توب نہ گا صردار تھا کیونکہ، ملن پر کر کے نزدیک وہ ایک  
کلاس انگا پہنچنے ہوئے تھا جس میں ایک تعویز لیک رہا تھا۔ اس ”لباس“ میں خوش ماں کے  
پاس پہنچتے ہی اس نے اپنا منہ مصری کی بڑی بڑی چھاتیوں میں چھپا دیا جہاں سے وہ ایک  
بہت بڑے فانچ کی طرح مرکر دیکھنے لگا جیسے وہ کسی بہت بڑے قلعے میں ہیچنگ گیا ہے۔ پھر  
نظر دل سکتیں ترکش تانے وہ قلعے کے لگنگروں پر بیٹھا، سامنے کسی جدال فوج کا جائزہ لینے لگا،  
یورش سے پہلے ہی جس کے تھکے چھوٹ گئے۔ پھر ایکا ایکی، کسی پر قل والے خیالی گھوڑے پر  
بیٹھا وہ کسی شوارنی طرح لپکنے لگا۔ آگے ہی آگے، اور پہلی اور پنجم... وہ منزہ یہیں نہیں ہو گکر

اس نے پیر دل میں پڑی دتی میں۔

مصری ایک پکے بلکہ کاے رنگ کی جوان عورت تھی اور بُل گورا چٹا... یہ کہئے ہوا؟ — درباری نے کبھی نہ پوچھا۔ وہ سمجھتا تھا یہ غریب عورتیں کتنی بے سہارا ہوتی ہیں۔

رُمل کے کنارے سے پڑی ہوئی مصری کو کوئی بابو آٹھہ تنے روپے کے عوض بُل دے گیا ہو گا۔

"آپ کے پاس تو پھر بھی چلا آتا ہے؛ باجوہی" درد نیہ بُل کٹ... کسی مرد کے پاس نہیں جاتا۔"

"کیوں کیوں؟" درباری نے حیران ہو کر پوچھا۔

"مالم نہیں" مصری کہنے لگی اور پھر پیار سے بُل کی طرف دیکھتی ہوئی بولی۔ "اہ عورتوں کے پاس چلا جاتا ہے۔"

درداری جی کھوں کھوئے ہیں۔ — "بِر معاشر ہے نا... ۱۰۰۰۰ بھی سے عورتوں کی چاٹ لگی ہے۔ بڑا ہو کر کیا کرے گا؟"

مصری خوب شرمائی، دن خوب ہی انزواجی۔ اسے یوں لگا جیسے وہ اپنی رو دیں ان گنت گوپیوں والے کھنکیا کو کھلا رہی ہے اور مصری کے تصور میں جو گوپیاں تھیں، وہ خود بھی ان ہیں سے ایک تھیں جیسے بُل مصری کامی تھا اور مصری کی اپنی برتیاں اس کے ارادگرد ناجر ہی تھیں۔.... بُل ابھی ایک گوپی کے ساتھ تھا پھر انیک کے ساتھ!

درداری نے جو مصری بانی کے ساتھ تھوڑی سی آزادی لی تھی، اُسی سے گھبرا کر پوچھ دیتا۔

— "اس کا باپ کیا کام کرتا ہے، مصری؟"

"ن کا باپ؟" — مددی کو جیسے سوچنے میں وقت لگا۔ — "نہیں ہے۔"

اس جواب میں بہت سی بائیش تھیں یہ بھی تھی، دوسرے ہے اور یہ بھی کہہ نہ سکتے ہی بدقسم بیوی بھی دو دیکھنے لگی از رپھر درباری الائچی تکامور کے تاسف، درد، نہستہ، بڑے بڑے — ایک بار وہ پھر آیا تھا۔ .. مجھے یوں ہی لگا جیسے —

دہی سہے۔ لیکن . . . میں کیا کہہ سکتی تھی، بالو جی؟ . . . میں نے تو اسے جویں بھوکے دیکھا بھی نہ تھا۔ . . . جب تک میں نے اس پیچے کا کوئی نام نہیں رکھا تھا۔ کبھی گوپا کسمی ناریاں کہہ کے پکارتی تھی۔ جبھی اس نے اس کے ہاتھ پر پانچ کا ایک لوت رکھا اور پسے پیارے پکارا۔ . . . تبل! . . . جب، سے میں نے اس کا نام تبل رکھ دیا۔ ہے . . .“  
اوہ سری پھر دیچنے لگی۔“ اس کا باپ نہ ہوتا تو پانچ روپے دیتا؟“

دباری بھی سوچنے لگا۔“ ہو سکتا ہے وہ آدمی نہیں . . . پانچ روپے کا لوت ہی، اس پیچے کا باپ ہو۔ دوباری نے آج اٹھنی مصروفی کے ہاتھ پر رکھنے کی سجائے تبل کے پانچ پر رکھ دی۔ تبل نے سگے کو ہاتھ میں لیا، زور زور سے باز دکوہم کایا اور پھر اسے پھینک دیا۔  
اٹھنی مرک پر کے میں ہول میں گینے ہی والی تھی کہ جیسے وہ وہ کی تقدیر کو ایک خشک بے بضاعت سے آدم کے چھلکنے سے روک لیا۔ مصروفی نے جھٹک کر اٹھنی اٹھنی اور تبل کو یعنی سے پہلتے ہوئے بولی۔“ لچا ہے نا . . .“ اور پھر اسے چومنتے ہونے والے دوباری لال سے بھلی۔“ کچ پوچھزا بالو جی! تو میرا صد بھی ہے۔“  
“ تیرا صد . . .“؟“

“ ہاں ” مصروفی نے تبل کو سنبھالا جو اپنی ماں سکھ تیرا پرستہ پو شیخ رہا تھا اور کہنے لگی۔“ کہا تھا میں کھاتی ہوں؟“

مدرسی بہت بالوقت تھی وہ اور بھی بہت پوکھنی تبل اور بھی کی۔“ کہا تھا میں دوباری کو اپنی فلکوں کے افق پر کاشنے رنگ، لہراتا ہوا نظر تبا۔ اس سے جلدی سے صدمہ کرنا ہے جسے“ اور تبا کی گوشی چھپی معصومیت کو جھٹکا دیا اور۔““ جسے جلد اپنے بھائی۔ اچھا بھائی ” کہہ کر دو جلدی سے باہر نکلا۔“ ابھی وہ مرٹک پر پیچے بھی آئے اور تبا کے پیچے میں اسے کٹڑی کے جھٹکے اڑتے۔“ دکھائی دیئے۔ جھپسیں دوباری نہیں جھبٹا۔ اگر با۔“ نکلا اور دیکھتا ہے پاس جا پہنچ۔ . . .

شیواجی پارک میں، سمندر کے کنارے، کلب اور حسیل پوری والوں سے کچھ دوست کر درباری اور سیتا ایک دیوار کا سہارا لے کر بیٹھ گئے۔

سیتا اٹھ رہا تھا<sup>۱۰</sup> اپنی بس کی ایک لڑکی تھی جس کی ماں تو تختی پر باپ مر چکا تھا۔ گھر کی حالت بچھے انہی خراب بھی نہ تھی کیونکہ مکان اپنا تھا جس کے مکینوں سے کبھی کرایہ وصول ہوتا تھا اور کبھی نہیں۔ سیتا کو ماں نے دی یوں تو اپنی بیٹی کی شادی کرنا چاہا، تھی نیکن شادی سے زیادہ اسے اس بات کا خیال تھا کہ کوئی ایسا آتے جو ہر مہینے اپنے "رُباب" سے کرائیں اگاہ تاہم سیتا کے کہنے کے مطابق دروازے پر برمہینے جو بھیڑ پاؤ کھانی دیتا ہے، بھاگ، جائے۔ اور جینا سکھی ہو جائے۔ نیکن دیا ہے تھا سیتا نے درباری کی بات بھی کی۔ پہلے تو ماں شرمند و سو سے کا انہار کرنے لگی۔ لیکن جب اسے پتہ چلا درباری کا پو انام درباری لا اپنہتا ہے تو اس نے جھٹتے اجازت دے دی کیونکہ بھنی میں جو لوگ مرد اول کا لریا ہمکا جانتے ہیں، انہیں مہتا بولتے ہیں۔

سیتا کا قدر دیکھا نہ تھا لیکن بدن کا تنا بے ایسا جو مردوں کے دل میں جذبے بیدار کیا کرتا ہے اور کوئی سیخود سی سیڈھی ان کے ہونٹوں پر چلی آتی ہے۔ چہرے کی تراش خداش، محظی نہیں لیکن اس کا پاس آنے والے سے پتہ چلتا تھا۔ پلکیں کچھ نہ سی۔ نیکن کیونکہ سیتا کی آنکھیں تھوڑا اندر و صنسی ہوئی تھیں اور ان کے بچاؤ کے لیے پلکوں کو جھکنا پڑتا تھا۔ نیکن یہ ان صنسی ہوتی آنکھوں ہی کی وجہ سے تھا کہ سیتا مرد کے دل میں بہت دُوزنگ دیکھ سکتی تھی۔ وہ کسی کو کچھ کہے یا نہ کہے، یہ اللہ بات تھی، لیکن جانشی وہ سب تھی۔ ہاں سیتا کے جبال بہت لمبے تھے جن کے کارن درباری اسے پوچھا کرتا۔ "تمہارے کھر میں کوئی کسی بنگالیں کو بھی بیاہ کر لایا تھا؟ اور سیتا کب تھی۔" میں خود جو ہوں بنگالیں..... میرا نام سیتا موجہ رہے۔ "....." درباری نہ تھا۔ سیتا نہ تھا۔ اور سیتا نہ تھی۔

استہے جس سے رہا پہنچین، کامے چیکیت اور بھکیتے بالوں والے سر کو دیواری تو پھٹ فی پر مکہ سکتی ہے اور اپنے وجود کی زدج تک کوئی کسی کے سے نہ رہے اپنے۔۔۔ تو مجھے سئیتی ہے اور تھوڑے سے فرق سے رہ پتی اور پہنچتا کو ایک کر سکتی ہے۔۔۔

دیوار کی اونٹ میں بیٹھا ہوا درباری سیتا کے پیار کر رہا تھا۔ سیتا نہ چھپا ہتھی کہ اس کا پیار اپنی حد سے گزر جاتے۔ کمر کے گردہ تھا پڑتے ہی سیتا چوتھی ہونے لگی۔ اس نے درباری کو بالوں میں لگانا چاہا۔ بلا ذریعہ میں سے اس نے یک چھوٹی سی چاندی کی ڈبیانکالی اور درباری کے منہ کے پاس کرتے ہوئے بولی۔۔۔ ”دیکھو۔۔۔۔۔۔ میں تمہارے لیے کیا لائی جوں؟“ کیلانی ہے؛ ”درباری نے پوچھا اور ان جانے میں سیتا کی کمر سے ہاتھ نکال کر ڈیلیک طرف بڑھا دیا۔

سیتا نے ڈبیا اور پرے ہٹالیا اور بولی۔۔۔ ”ایسے نہیں۔۔۔۔۔۔ میں مفرود کھلوٹیں گی۔“ در پھرستے درباری کی ناک کے پاس کرتے ہوئے بولی۔۔۔ ”سن گھوڑا۔“

شامہت اعمال درباری نے ڈبیا کو سونگھہ لیا اور اسے چھینکیں آنے لگیں۔

محبت کا سارا کھیل رک گیا۔ درباری چھینک پر چھینک مار رہا تھا اور حبیب سے رو مل نکال کر بار بار اپنی ناک کو پوچھ رہا تھا اور سیتا پاس میمھی میستی جا رہی تھی۔

”یہ۔۔۔۔۔“ درباری نے کہا اور پھر چھینکتے ہوئے بولا۔۔۔ ”کیا مذاق ہے؟“

سیتا کہنے لگی۔۔۔ ”تم اسے مذاق کہتے ہو؟“۔۔۔ بیش رپٹے توڑ کی فسوار ہے؛

”ذوار؟“

”ہاں“ سیتا بولی۔۔۔ ”تم چھینکتے ہو تو مجھے بڑے اچھے لگتے ہو۔۔۔

درداری نے سیتا کی طرف یوں دیکھا بیسے کوئی کسی پاگل کی طرف دیکھتا ہے۔ سیتا نے پیار بھری نگاہ اس پر ڈالی اور کہنے لگی۔۔۔ ”یا وہ می پہلی بار تم مجھے کہاں میئے تھے؟“

”ذہنیں“ درداری نے۔۔۔ ملا تے بوسے کہا۔۔۔ صرف اتنا بھی پتہ ہے، تم سے کہیں پہلی بار

"دہاں" سیتا نے سما میئے اب تھے۔ سونگک پرانی طرف اٹھا و کرتے ہوئے کہے کے۔

”تم ہمارے حق اور چینیک رہتے تھے۔ میرا۔ انکھ میں چار کبیں اور بھی متھیں۔ اس دن دفتر میں آؤ۔ سے دن کی محیثی بڑھتی تھی اور ہم یونیورسٹی ملکوں تک گئے۔ قابو میں جانکھیں.....“

دُنْهَرَكَوْلُ،

"لوگوں" سینتا نے کہا -- "چھپی بہن نے ہمی نہ جانے ہم رب را کیوں کو کیا ہو ..؟" لگتا ہے بہم پر جیسے جی سینہر سکتیں ۔ ایسے ہی باہر نکل جاتی ہیں جیسے کچھ ہونے والا ہے ۔

پھر بتا دا، تو کچھ نہیں جسمیتہ چلتا ہے۔ -- کوکا کولا یا ربی یہس اے۔

بیتِ بخشی تو سمازی در باری بھی میں دیا۔ وہ اپنی بابت حماری رکھتے ہوئے کہنے۔

درباری جیسے ایک ہی بات سوچ رہ تھا۔ — ”دوسری لڑکیاں کون تھیں؟“

”ایک تو گدھتی“ سیتا بولی ”دوسری جو لی ..... وہاں، کھاڑی کے پار ماؤنٹ میری کے

پاس رہتی ہے تیری — اور پھر ایکا ایک کتنے ہو شے کہنے لگی — تم کیوں نوچہ رہے ہو؟

"ایسٹھی" دربدی نے جواب دیا "تمہاری کہیلیاں بہتری بُونگ کی بھی زیں پہنچ

۱۷

”تم ندوی می ہیں؟“

## "دیکھی تو نہیں؟"

یتباہ پر جو سخوراً کھل، اٹھا تھا، ماند پڑ گیا۔ بھی ایک چینیک نے درباری کے چہرے پر تو سے نیشن رُک گئی۔ وہ سامنے دیکھتے ہوئے بولا۔ "آج ون ڈرباہی نہیں۔" سمندر میں جوار شر در غہوچ کا تھق۔ لہریں کناروں اور ندیوں پر پھر رہی تھیں اور اپنے ساتھ بیسیل پوری کے بے شمار پتل، گندیری اور مونگ پھلی کے چھٹے، ناریل کے خود سے لا رہی تھیں۔ پھر بیچ میں کہیں کوئے بھی دکھانی دیتے تھے جو دوز اندر دھانی کشیوں اور بڑے بڑے جہازوں نے اپنا ختم بلکاڑنے کے لیے سمندر میں چھینیں۔ یہے تھے نیل کا الزام بھی خشکی پر ٹال دیا تھا اور ان کا خالی کیا ہوا ڈنیل بریتے پر پہنچ کر اس کے ایک بڑے سے حصے کو چکنا اور سیاہ بنارہ تھا..... سید نے مژاکرہ دیکھا، درباری کچھ عجیب سی نظریوں سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ سیاہ بول کے پرے اس کے چہنے چہرے پر حفاظت رہے تھے —

..... دن ڈوب رہا تھا۔ اس نے اپنے لانے بانے بازو دنیا کے دونوں کناروں سے سینٹے، دراہنیں بغل ہیں دبا کر ایک گھرے، کیسے یہ رنگ کی نہتری سی بنا، وہ بچھم کے گھرے پانیوں میں از نے لگا۔ تقدیری ہی دیر میں اس کا تجویز میں کی گولائیوں میں گم ہو گیا۔ اب کنارے اور اس کے مکانوں اور مکینوں پر وہی ردیشی تھی جو آ۔ ماں پر کے آوارہ بادل پرے ہوتے ہوئے زمین پر پڑتی ہے اور جو ہو لے ہو لے دھیرے دھیرے بڑے پیارستے اندھیرت کو پنی جگہ دیتی ہے جیسے کہ رہی ہو۔ ..... لذاب تھا راج ہے۔ جاؤ، منج اڑاؤ .....

وہی چینیک جس نے درباری کو سید نے کو سویں ڈور چینیک دیا تھا، ایک ہی وار نیں، اس کے قریب بھی لے آئی..... سید ناپنے لگی دبایی، مانپنے لگا..... ندھیرے کا سلطط ہوتے ہی پول اور ملب اور بک پرے مقعے تو ایک طرف، پھیرے ڈالوں کے جھبلوں اور بھیلوں پر مٹا نے وہ ستدیے، نہ روز نہ نئے۔

ججھی، جلیسے دیوار میں سے آواز آئی۔ ”درباری! کیا کرتے ہو؟“  
”اس کا مطلب ہے“ درباری نے اپنا ہاتھ ہٹاتے ہوئے کہا۔ ”تم مجھ سے پیار  
نہیں کر سکتے؟“

”پیار کا مطلب — یہ کھوڑے سے ہوتا ہے۔“

”میں سب جانتا ہوں۔“.... اور درباری ہاتھ کر کھڑا ہو گیا اور اپنے کپڑے نہیں  
کرنے جانے لگا۔ سیتا نے اسے رد کرنے کی کوشش میں اور ہاتھا آمیز ریجے میں بولی کیا کہ رہے ہو،  
چاہرے؟“.... اور ریست پر پڑی ہوئی سیتا درباری کے پیروں سے لپٹ گئی، جو غصتے  
سے ہانپ رہتا۔

درباری نے اپنے بیرائی جھٹکے کے ساتھ چھڑایے اور بولا۔ ”Bitch.....  
بڑی پاکیزہ بنتی ہے، بھتی ہے۔“

”میں کچھ نہیں سمجھتی“ سیتا نے وہیں گھٹنے کے بل کھٹ کر پھر سے درباری کو کہتے  
ہوئے کہا۔ ”میں مہماری ہوں، چند۔ .... نس نس، پور پور مہماری ہوں۔ پر میں ایک  
بڑہ، ماں کی جیٹی ہوں۔ .... بھت شادی کرو، پھر.....“

”کوئی شادی وادی نہیں“ درباری بولا۔ ”تم سے جو کہہ دیا، کیا وہ کافی نہیں؟ کیا منتر  
پھیرے ضروری ہیں؟ قانون کی پکڑ، اس کی اونٹ ضروری ہے؟“ اور درباری لال رُک گیا  
جیسے اب بھی اسے امید دھتی.....“

”ماں غربری ہے“ سیتا روتنے ہوئے بولی ”یہ دنیا میں نے تم نے نہیں بنائی۔“  
درباری کی آخری امید بھی ٹوٹ گئی۔ بولا ”میں اس پیار کو نہیں مانتا، جس میں یعنی  
کوئی بھی پردہ، کوئی بھی شرط ہو۔ روحوں کا ملنا ضروری ہے تو جسموں کا ملنا بھی۔ اس میں سوکھ  
بھگوان ہوتے ہیں۔ ایسا شاستر دیں میں لکھا ہے۔“

”لکھا ہوگا“ سیتا بولی ”سب مہماری طرح اس بات کو مانتے ہوتے.....“

"یہ کہنے کی پردازیں کرتا" درباری نے غصتے سے پیر زمین پر مار تھے جو شے کہہ، جو بیت میں دعفہ گئے اور کھپڑہ دہا بہیں کھیچتے، بیت سے نکالتے ہوئے چل دیا۔

سیتا، تجھے پسلکی۔۔۔۔۔ سنو،..... ابھی درباری نے دیوار کی ہر رخیں پھاندی تھی اب بھگا دیا، سہارے بیٹھ سکتے تھے اور، زندہ ہے کو گھنے نکالتے تھے۔

ایک دولڑ کے فنسا میں تعجب ہے، کیونکہ رُک گئے پھر چنے والا آیا، جس کی پھیری میں

گل، سمندروں کی طرف تھے آنے والی تیز ہوا میں ہر لحظہ بُرستی جا رہی تھی۔۔۔۔۔

اب کے سیتا نے رہنم دھرنے کے پیر کڑے بلکہ اپنا سرا در بھگالی زلفیں ان ہر دنکھ دین اور نہم، نکھیں سمجھی، موڑتے بھی۔ درباری پیروں تک حاصل رہا تھا اور انہوںکی آنکھ سے لرز رہا تھا۔ پیر چوتھی ان پر آؤ کرتے ہوئے سیتا نے تھوڑا آنکھ کر دہ باری کی طرف دیکھا اور کہنے لگا "تم سمجھتے ہوئے کسی برداشت کی سچھ کی بنی ہوں؟ میرا تمہرے گھر میں بانہ کو جی نہیں چھپتا؟ تم مجھ سے لگتے۔ تو کیا میرا، بھگا کہ دئنے دئنے نہیں لائے؟..... پر تم کیا جاؤ، ایک رُک کے ذریعے"۔۔۔۔۔

اور پھر کسی ان جہانے دوستے کا نتی ہوئی بولی "میں نہیں کہتی یہ دکھ فتنہ دیکھے چیزیں یہ بھگوں نے دیتے ہیں بھگوان ہی نے عورت کے ساتھ بے انصافی تھے۔۔۔۔۔"

"میں سب جانتا ہوں" درباری نے اپنے آپ کو جھپڑانے کی کوشش یہ ہوئے کہا "مرد سب سہہ سکتا ہے، تو ہیں نہیں سہہ سکتا"۔

"کس کی تو ہیں؟"

درباری نے جواب دینے کی بجائے سیتا کے تھوڑے رہا اور وہ تیچھے کی طرف، جلوہ کی خود رہ بیٹھے ڈگ بھرتا ہوا روشنیوں کی دنیکل گی۔۔۔۔۔

سیتا، ایک ایسے در سے کاٹے جا۔ ہی حقی جواپی مختصری زندگی میں اس نے جو نہ دیکھا تھا۔ جس کا تجربہ اس نے اپنے تباہی موت پر بھی دیکھا تھا۔ ماں کی چھاتی میں

منہ پھپر دہ ۔ ۔ بھروسی نہیں اور جیسے جستے ہو ست پھوسٹ۔ یہ کے اُرد ملکی انگلیاں، پھیرنے سے  
یک طرح کا حظ، ایک قسم کا آرامہ آتا ہے۔ یہ سے تین ماں کے سر پر پانچہ پھیرنے سے اس کے  
سلسلے کے وکھ دو رہ جو لئے تھے ۔ ۔ ۔ ۔ وہیں دیست پر پڑی پڑی سیتا بیل دبی سسلکیوں لیتی رہی  
تیخ میں کبھی کبھی دہ سہ امکان نہیں دیتا تھا۔ لوٹی دیکھ تو نہیں رہا۔ وہ نے یہے تو زیر رہا جیسے  
سیاست میں پڑی ہوئی عورت کے یہے لوٹی ملے لوٹی ۔ نکا صرد چلا آتا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ سانش  
دیتے کی نو میں کوئی چیز چھپی۔ سیتا نے اخدا کی تو دہ چاندی کی ذیبا تھی جو نیچے جا کری چھی اور اب  
۔ ۔ ۔ اس میں بیت پلی آئی تھی ۔ ۔ ۔ ۔

یہ حقیقت کہتی کہ دوسری سیتا سے پیار کرنا تھا، لیکن اتنا نہیں۔ جتنا سیتا آرتی تھی۔  
سیتا تو چیزیں اس دنیا میں اپنے نام کو بجا ثابت کرنے کے لیے آئی تھی اور اب، شوک باشیکا میں  
پڑی دیکھ رہی تھی کوئی اور سترے سترے میں انگوٹھی پھیٹئے ۔ ۔ ۔ ۔ لیکن راتم جی کے زمانے سے  
آج تک تیخ میں کیا کچھ ہو گیا تھا۔ اب تو انگریزی فن "چلا آیا تھا" جس سے درباری پرانی طرف  
ڈینا چاہتا تھا۔

لمریت جالی لگ گئی تھی۔ تین دن خوب ہی پریشان کرنے کے بعد سکھ نزک کھان چھپی  
کر گیا تھا۔ صاف سترے برآمدے بیس بیٹھے ہوئے درباری خالی خولی نگاہوں سے مردک  
کے اس سور کو دیکھ رہا تھا جہاں کبھی کاشنی اور کبھی مردٹی، کبھی دھانی اور کبھی جو گیا نگہ پر را  
کرتے تھے۔ پاس درباری کا بھان بن محمود یا بنواری۔ اندھے اور نہیں۔ بیٹھنے والے ایک بدوضع  
کھلوٹ سے کھیل رہتے جس سے اس کے ہاتھ کے کٹ جانے کا ذر تھا۔ شاید اسی لیتے اندرستے  
تھے تیکنے زیادتی ہوئی آفی اندھے پر بیٹھے سے اس کا کھنڈ اچھیں لیا۔ بچھ رونے مجھے

”ہے ہے .....“ درباری نے احتیاج کیا ”تیکر رہی ہو آپ؟“  
 ”تم چپ رہو جی“ وہ بوق تم سے ہزار بار کہا ہے مجھے آپ مست آپ کرو ..... دیدی پتہ  
 کیا سانپ میں لگتا ہے؟“

”اچھا جی“ درباری بولا اور اصل بات کی بات ہی نہیں۔ دیکھو تو یہی رہا ہے ....  
 یہے تو لارڈ چزر بھی یورا بڑہ ڈوب جانے پر نہیں روپا ہو گا ... دوائیں کھلونا؟“  
 ”دیکھتے دوں ... یہیں آنکھ پھوڑ لے ---“

”سب نچے اُنہے سیرے کھلوں سے کھیتے ہئے ہیں۔ کتوں فیض نہ پہنچی ہے؟“  
 ”جتنا یہ شیطان ہے، کوئی اور بھی ہے؟“

”سب ماں کو اپنا بچہ اتنا ہی شیطان معلوم ہوتا ہے：“  
 اور محمود یا بنواری بڑی بیزاری سے رہ رہا تھا۔ گھر بھر کو اس نے سر پر انٹھایا تھا  
 درباری نے طلق پر سے جا پانی تلی اٹھا کر دی جو چابی دیتے ہی بھاگنا اور نلا باشیاں تھیں  
 کوئی سختی جسے دیکھ دیکھ کر نچکے تو کیا بھے بھی سخت ہونے لگتے تھے۔ لیکن بچوں کو تو دبھی کھوئا پڑتی  
 جو کسی نے چھینا ہے ... درباری نے بُرے بُرے سُنہ بناٹنے کیسے کیسے خوش خاکہ کیا۔ سخن  
 میں نکلی ڈال کر ہنومان بنا بیجہ بُنی دا کر آغا ... لیکن وہ رہ رہا تھا۔ اسے اپنا دسی کھلو  
 چاہیے تھا۔ درباری کا جی چاہا، اسے تھیڈیا رائے۔ اگر نچکے کے اور دوسرے کا ڈینہ ہو، تو وہ خدا  
 مار دیتا۔ درباری نے ایکا ایکی جھلاؤ کر کہا ”اب بند بھی کر ساے ...“  
 ”ند سے آواز آئی ...“ ”رونے دے یار۔“

”بچہ رہ رہا تھا۔ آخرد بی بھاگی آئی، ائٹے پریوں --- تے ہے رام“  
 ”بائیے الہ کبھی نہیں کہتیں،“  
 ”بچکوں کے لیے --- تم چپ رہو“  
 ”خدا کے لیے کہو نو ...“

پھر سوچی یا کیز تھی؟ ناچھیڑے نہ تھے ہی لوما بھی کئی — تھے میرے باپ؟ س نے معلوم نہ تو نہ ہے کو ما تھے میں تھے نہ تھے ہوتے کہا اور پھر جیسے س کی حالت تو نہ رکھدے بھی نہ سکتی ہوتے ایک دن پہلی نے یہ ٹلوڑے دیے۔ قیصر سے اس کا سخن پڑھا، ناک صاف کی پڑھا۔ پڑھا..... اور اس نے کے کے مطابق ”بڑی کھنڈ پڑی“..... پھر بہت گالیاں پھنے آپ کو دیں ہائے مر جانتے ایسی ماں ..... خوب ہے اس دنیا میں لال دکشاد لایا ہے: اور پھر اپنے پتی یا شوہر کی طرف دیکھتے ہی بر س پڑی دیکھو تو کیا اُن سے سمجھتے ہیں: ”وہ اٹکھڑے ہوئے ..... خاصے بے مزہ دکھائی دے رہے تھے!

درباری بولا — ”اب چاہے اکتھے نہیں، گردن بھی کاٹ رہے۔“

”کاٹ رہے“ دیدی بولی ”مردن گی میں ..... تم لوگوں کو اتنا سا بھی روشن ہو گا۔“

”ہو گا یا نہیں“ درباری بولا تھکتے ہیں — نہ ان بھی ربی کرتا ہے جو دانہ کرتا ہے لیکن ہزار جھجک مارنے کے بعد ..... پہلی سی چھینٹ کی بے دفعی نہ کی ہوتی: ”ہاں میں بے دقوف ہوں“ دیدی لہتی ہوئی پچھے کو اندر رے گئی ماں ہونا اور عقل بھی رکھنا انگ باتیں ہیں۔

اور دیدی کے کانڈھے پر رکھے بدموش محمود بیانواری ہفتا ہوا دکھائی دیا، جیسے اپنی طاقت اور قدرت کو اچھی طرز سے جانتا ہو۔

بھی سامنے اور رائینما کی طرف سے آنے والے موڑ پر نار بھی سارنگ دیکھنے والے ہر یا درباری نے جلازی سے کپڑتھیک کیئے سر پر ٹوپی رکھی اور باہر نکل گیا —

موڑ پر سینا کھڑی تھی۔ اس نے ایک پار بار بادی کی طرف تاکا اور پھر پرے دیکھنے لگی۔ اس کی آنکھیں کچھ اور بھی اندر دھنس گئی تھیں، پلکیں کچھ اور بھی نہ ہو گئی تھیں۔

”کہیے حضور ..... کیا حکم ہے؟“ درباری نے پوچھا۔

سینا نے کئی جواب نہ دیا۔ درباری کو یہ لگا جیسے سینا کچھ کا نپ سی رہی ہو۔ درباری

کچھ: یہ اس کی طرف دیکھتا رہا اور بولا "اگر چپ ہی رہنا ہے تو پھر....." اور وہ رونٹے لگا۔

"سنو" سیتا ایکا ایکی مڑتی ہوئی بولی — "مجھے چھما کر دو۔ اس دن مجھ سے بڑی صلح ہو گئی"۔

درباری نے رُک کر اس کی طرف دیکھا — "اب تو نہیں ہو گی؟" سیتا نے نفی میں سر ٹاپا دیا۔

"جہاں آبؤں گا، میرے ساتھ چلو گی؟"

سیتا نے اشیاء میں سر ٹاپا دیا اور مٹھہ پرے کرتی ہوئی ساری کے پتوں سے اپنی آنکھیں پوچھ دیں۔ درباری کے بدن میں خون کا دورہ ہیسے ایکا ایکی تیز ہونے لگا۔ اس نے اپنے کھردے سے ہاتھ کھپیا ائے اور سیتا کا زرم سا ہاتھ پکڑتے ہوئے بولا — "تو تو ایسے ہی ڈر رہی ہے سیتا!.... بچے دیکھ کر مجھے یوں لگتا ہے، جیسے میں بڑائیج ہوں"۔

سیتا جیسے یہی سننا چاہتی تھی بولی — "نہیں..... ہمیں کبھی؟"

درباری اور سیتا وہیں پہنچ گئے۔ شیوا جی پارک میں، دیوار کے نیچے ..... دن ڈوب چکا تھا۔ آج آسمان پر کوئی بادل بھی نہ تھا جو زمین کی گولائیوں سے آسمان پر انگکس ہونے والی ردشتی کو ادھرز میں پر کھینک دے۔ اس لئے امیرے نے جلدی ہی دنیا کو لپکایا۔ سامنے مہاتما گاندھی سرمنگ پرکل کے ار ڈگر بننے ہوئے جنگلے، خاکے بننے اور پھر معدوم ہو گئے۔

درباری کے بڑھتے ہوئے پیار کے سامنے، سیتا منفعل سی بھی رہی۔ درباری ایک دم جھلٹا اٹھا اور بولا — "کچھ نہ سو بونو بھی نا" — سیتا کو پسنا پڑا۔

درباری سے سیتا کی کھوکھلی نہی کی نقل اتاری اور سیتا کو بھی ہی نہ دی.....

درباری خو صد پا کر بولا — "تمہیں کیا کام کی مجھ پر دشواں نہیں؟"

”ہے بٹ بنیں“ سیتاہولی ”تمہرے مجھ سے شادی کر جئی دے، تو جو سُجے غفرت فی نکاد سے دلکھو گے سمجھو گئے ہیں اسی ہی عقی .....

"نہیں سیتے، میں نہیں سمجھوں گا.....نجھی نہیں سمجھوں گا۔"

جمھی کچھ لوگ ہاتھ میں وہ ہے کی سلاخیں لیے چلے ہے۔ درباری چونکا۔ اس کی تسلی ہوئی جب انھوں نے سلاخیں بریتے میں مالنی شروع کر دیں وہ پیڑ سے کے اس فینے کو دیکھ رہے تھے جو دو ایک دن پہلے انھوں نے بریتے میں دبایا ہو گا اور اب سکندر میں جوار آنے سے پہلے اسے برآمد کرنا، استعمال میں لانا چاہتے تھے۔ درباری اور سیتا اٹھ کر ذرا پرے دیوار کے دوسرے نارے پر جا بیٹھے۔ مہنگا دیکھ تو دیوار کے اُپر بھی کے برتن، نجھنے والے رام لوگ بیٹھتے اور آپس میں لکھا کر رہے تھے۔ درباری نے دیکھتے ہوئے بھی نہ دیکھنا چاہا۔ سیتا گھبرا۔ ہی تھی بج رہی تھی، لپیٹ نہ پہنچنے بورہ ہی تھی۔ دہ مکمل طور پر درباری کے ہاتھوں میں تھی۔ آج اس کا اپنا کوئی ارادہ نہ تھا۔ وہ تو کسی روشنے کو من، چاہتی تھی اور اس کے لیے کوئی بھی قیمت دیسنے کو متا رہتی۔

جسھی کچھ من چلے ہے میرے دل کیسی....." گاتے ہوئے پاس سے نذرے پھر ایک پولیس ہین آیا اور رباری محفلہ کر لٹھ گیا۔ اس نے خونیں آنھوں سے اڑا گرد کے منتظر کو دیکھا اور انگریزی میں ایک سوتی سکی گالی دی، اور پولا۔ "جلو سستے، جو ہو چلیں گے یہ

۶۰۰

۔۔۔ مل — امکنہ کیل رودستے سیکسی بنتے ہیں ॥

مہتاب یہ بڑا ہے اور دینہ دنی کے ... تھہڑا دنی۔

سیا اور دیگر ی جو نوکے زمین پر ادھر پڑتے ہیں سلطنت تھے۔ کیونکہ اس سے خطرہ نہیں۔

ردِ کوئی نہ کوئی وارداست ہوتی۔ سمجھتی۔ ابھی چندی دن ہوئے ایک قتلہ میواننا چڑھنڈوں

نے ایک میاں بیوی کو بھر رہنے لگی کے دو کناروں پر جا کھڑا کیا تھا۔

لیکن اس علن جو پتوں کے سب ہٹل، سب کا لیچ گناہوں سے بھرے ہڑے تھے۔ کوئی گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے کے بعد درباری اور سیتا فورٹ کی طرف جا رہے تھے۔ راستے میں سیتا کوئی بات کرتی تھی، درباری کوئی اور ہی جواب دیتا تھا۔ دیبا بھی کھانا تو اکھڑا اکھڑا بے تعلق۔ زبان میں ایک عجیب طرح کی لکھتی تھی جیسے کوئی نشے والی چیز سخن میں رکھلی ہو۔ جس سے زبان پھول گئی ہو۔

میکسی حاجی علی سے ہوتے ہوئے تاٹیوں میں داخل ہوتی، دہان سے اور پاہاؤں سے ہوتے ہوئے ارن بائی ردد پر جا پہنچی جس کا نام اب ہہاتما گاندھی ردد ہو گیا ہے۔ ایک ہٹل پر چھپتے ہوئے درباری نے میخرا سے پوچھا —— ”کوئی کمرہ ہے؟“

میخرا نے غور سے درباری کی طرف دیکھا جس کے چہرے سے معلوم ہوتا تھا جیسے کوئی واردات کرنے آیا ہے، یا کرنے جا رہا ہے۔ یہ سیتا کھڑی زمین کی طرف دیکھتے ہوئے خفر خفر کا پر رہی تھی۔ دونوں گناہ کے عادی نہ تھے۔ خامہ بے رحم فطرت کے ہاتھوں گرفتار دیا گیا تھا۔ سے ہو رہے تھے۔ جبھی میخرا نے پوچھا —— ”آپ کہاں سے آئے ہیں؟“

”جی؟“ درباری نے ایکا ایکی سوچتے ہوئے کہا ”اوژنگ آباد سے۔“

”خوب؟“ میخرا نے یہ سیتا کی طرف اور پھر درباری کے سیاہ چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا —— ”آپ کا سامان کہاں ہے؟“

”جی سامان نہ ہنسیں ہے۔“

”معاف کیجیے“ میخرا نے دی۔ می کی طرف بیوں دیکھتے ہوئے کہا جیسے وہ کوئی نجس اور بجلجی شے ہو اور بولا —— ”اپنے پاس کوئی رومن ہنسیں۔“

”کیا مطلب؟ ابھی تو سیلیفون پر۔“

بیرہ نمبر ۲ جو ایک رٹے پر ولیفز، مونگ کی وال سوڈ سے کی ہے تملیں اور چاہی لے کر

جانا تھا، بول پڑا۔۔۔ یہ ہوٹل عزت داے لوگوں کے لیے ہے صاحب؟"

درباری کچھ نہ کہہ سکا۔ حالانکہ وہ جانا تھا، وثوق سے جانا تھا، اس بیرے کا ٹپ ایک روپ سے زیادہ نہ تھا اور قبلہ میخ صاحب کی عزت پانچ روپے سے ۔۔۔ اور آج یہ رب کے سب ایک دم سیکی اور عزت اور شرافت کے پنکے بن سیٹھے تھے۔ وہ عزت اور شرافت کے پنکے تھے یا نہیں۔ لیکن، ایک بات طے تھی کہ زندگی میں کچھ بھی کر گزرنے کے لیے مشاق ہونے کی ضرورت ہے۔ نگاہوں میں ایک پیشہ ورانہ جرأت اور بے باکی اور بے حیائی لانی پڑتی ہے جس کے سامنے بد مقابل کا اخلاق، اس کی شرافت اور پارسائی جھجوٹی پڑ جاتی ہے ۔۔۔۔۔

درباری اپنے اندر کہیں کمزور، کہیں بزدل تھا۔۔۔ وہ ایک ناز اشید، ہیرا تھا۔۔۔  
لوٹتے ہوئے دھکالیاں بک رہا تھا، انگریزی میں۔ جنہیں وہ ہوٹل کے قنطیں کو سنانا بھی  
چاہتا تھا اور ان سے چھپانا بھی!

"چلو سیتا" درباری نے کہا "پھر کبھی ہی:

اور دونوں ٹیکسی پر سیٹھ کر گھر کی طرف چل دیئے ۔۔۔

زندگی بے کیف ہو گئی تھی۔ اتنی ہزیمت کا احساس درباری کو کبھی نہ ہوا تھا۔ اس کی نگاہوں میں کئی لوگ ہیرد ہو گئے اور بہت سے ہیرد پیروں میں آگئے۔

آج اس کا کہیں جانے کا ارادہ نہیں تھا، کوئی پروگرام نہیں تھا۔ حالانکہ ایک مہم سے احساس کے ساتھ وہ دفتر سے جلدی چلا آیا تھا۔ تھکا تھکا، ٹوٹا ٹوٹا، مضمحل سا۔ اس شام کی شست اور بے خوبی کے بعد ایک تسلیم کا سا احساس تھا جو تسلیم بھی نہیں سمجھی۔ یہ آگ ۔۔۔۔۔ بیا تو پیا ہی نہ ہوتی۔ اسی لیے بڑے خیال کو بہت اہمیت دیتے ہیں یا تو یہ حضرت پیدا ہی نہ ہوں اور اگر ہوں تو آپ انہاں کی اولاد کی طرح انھیں جھیک ہنیں سکتے، ان کا گلا نہیں

گھونٹ سکتے ہیونکہ ہر دو صورتوں میں سزاً موت ہے۔ یہ دماغ کے کسی کونے میں چپکے دبکے پڑے رہیں گے، اور اس وقت آلیں گے، جب آپ مکمل طور پر نہتے ہوں گے، باکل بے دست و پا۔

## غسل دہی جانے والی میریت کی طرح —

دن بار می اس وقت بد آمد سے میں شیخا ڈان باسکو کی دیوار کے ساتھ آگے ہوئے پڑوں  
کو دیکھ رہا تھا جن کی جھاؤں میں محلے کے امراء کی موڑیں ستار ہی تھیں۔ کچھ تو یہ ان اسیں  
مزدوری کی تھیں جو گھر سے دفتر اور دفتر سے سیدھے گھر پلے آتے تھے اور بیوی کے ساتھ  
جھیکھ رہے ہی سے ان کی پوری نسلی ہو جاتی تھی۔ اور کچھ ایسے لوگوں کی جھنوں نے انہیں چلنے  
پھرتے تھے خانے بنار کھا تھا۔ ان کے ڈرائیوروں کو سیرشام گاڑی چکانے اور منہ سی رکھنے  
کی شکنادیکے سے دے دی جاتی تھی۔ یہ بہرہ نمبر ۲۸ تھے۔

دیداری نے کھنچ کھا بخ کراس دن ہوٹل میں پیدا ہونے والی مایوسی کا اکار میں افراد  
پانے والی ٹکھیہ سے تعلق پیدا کر لیا۔ لیکن کیا فائدہ؟ امید کو چمکانے والے دمکاتے سے کارکھوڑے  
ٹلاکرتی ہے؟ باہم گرد و گداری لال مہتا تو پسے کو ہن بھی نہیں ٹکواستے تھے۔ اگلے جنم میں بھی سانپ  
بن کر درپیسے پر مشکو جانشناکا ارادہ تھا۔

صاحب بھائی یا سردار ملک نال مرح اپنے یہوی بچوں کے اپنے گھر چلے گئے تھے۔ پہچھے لٹھنٹ سے بازو دوں والی بے پچھے بھائی رہ گئی تھی جس کی بھیا اسے بچہ نہ ہو سکنے پہنچا رہی تھی دہ کہتی تھی — تم میں نقش ہے اور وہ گھتے — تم میں — وہ کہتی تم دا کھڑکو دکھاؤ وہ کہتے تم اپنے ہون ٹنگراو۔ اور ناپید نپکے مایوسی مختہ ایشیں دیکھتے تھے اور اپنا سر مریٹ لیتے —

وہ باوری مکمل طور پر بور ہو چکا تھا۔ وہ جانشنا اور مشتولی دیر گھر میں رہے گا تو ماں شادی کی باتیں کرنے چلی آئیں۔ اور وہ شادی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ مل، کچھ دن تو زندگی دیکھ لے۔ آخر تھا ایک دن ہر کسی گی شادی ہوتی ہی ہے — —

گر کے ساتھ شادی پڑھتے لپک کر اس کے دماغ نہیں بھٹکتی تھی۔ مہیتا ذہلے سے ٹھیک نہیں۔

لیکن شادی کے سلسلے میں نہیں۔ وہ بہت ایثار دالی لڑکی تھی، شکل صورت سے بھی بُری نہ تھی لیکن بیوی — بیوی کوئی اور ہی چیز ہوتی ہے۔ اسے کچھ تو چلپلا ہونا چاہیے۔ ادھر ادھر جماں کن چاہیے تاکہ مرد کان سے پکڑ کر کہے — "ادھر" اور پھر بہو اکی بیٹی؟ — مرد سے یوں حنشتی ہے، جیسے وہ اس کا شوہر نہیں، باپ ہے۔

— میں کہاں کرائیے اگاہتا پھر مل گا؟

ہاں تھڈی دیر کے پیار کے لیے سیتا سے اچھی کرنی نہیں کیا جسم پایا ہے!  
جبھی مصری دکھانی دی اور تبل دکھانی دیا۔ . . .

مصری دوڑی سے "بابو جی" کی طرف منتقلی کرتی ہوئی آرہی تھی اور تبل وہیں سے غول عند غال غال کرتا ہوا سماں کر رہا تھا۔ پھر یکایک تبل میں ذہنگی مچھلی، جیسے گینہ زمین پر سے اچھتا ہے اور مصری کو سنبھالنا مشکل ہو گیا۔

آج تبل خدا کے نہیں، انسان کے لباس میں تھا۔ ایسے یہی سی بیان ہیں رکھی تھیں۔

ہاں نیچے اللہ ہی اللہ تھا۔

پاس آتے ہی تبل نے دونوں ہاتھ کھپیلا دیے — "کمینہ! جیسے میں اس کے لیے  
کرمائیے ہی تو نہرا مول" — جیسے امر رجانا اور باہر آکس کے حضور بالحکداری اس کے  
غیر کی آخری حب ہے،

در باری گمراہے کر باہر آیا تو آج پہلی بار اسے خیال آیا۔ — مصری ایک عورت  
ہے، بتزاں اس کا بچہ۔ اور یہ سب کتنا مقدس ہے۔ غریب لوگوں میں باپ ہوتا تو ہے، مگر  
حضرت مکلف کی چیز،

جبھی در باری کا دماغ تیرزی سے چلنے لگا۔ وہ ایک داثرے میں گھومتا تھا اور گھٹھ  
پھر کروہیں آ جاتا تھا۔ پھر کلٹی کشت کی سی کیفیت ہونے لگی۔ آنکھیں پھیلنے اور سہنے لگیں۔  
در باری لاں نے آج ذہیں سے گمراہ تبل کو دیے دیا تھا۔ جلنے کیا بات تھی جو آج در باری تبل

کو گودیں نہیں لے رہا تھا۔ جیسے وہ شرما رہا تھا۔ لیکن وہ رپڑ کی گیند۔۔۔ ببل۔۔۔ جیسے دیوار کے ساتھ لگ کر پھر روٹ آتا۔ یہ نہیں کہ آج اسے گمرا نہیں چاہیے تھا۔ اسے گمرا بھی چاہیے تھا اور آسمان کی باد شاہت بھی۔ ببل حیران ہو رہا تھا۔۔۔ آج یہ بالبو مجھے لیتا کیوں نہیں؟

”آج تم نے کتنے پیسے بنائے ہیں، مصري؟“ درباری نے کچھ جیسا نتیہ ہوئے پوچھا۔

”ہی کوئی چودہ آلتے“

”کیوں، صرف چودہ آٹے کیوں؟“

”آج میرا مرد ناگ پارڑ سے چلا گیا تھا“، مہری نے بے باکی سے کہا۔

"یہ زامد؟" درباری نے جھران ہوتے ہوئے کہا "تم نے کوئی مرد کر لیا ہے؟"

بھری نہی اور بیل کو دلوں بازوں میں تھام کر اونچا، درباری لال کے برابر کرتے ہوئے بولی — ”یہ ہے میرا مرد، میرا کماڈ مرد..... اسے آج اس کی موی پارے کی چونا بھٹی لے گئی تھی۔ یہ بنیان دی جو بیل کٹ پہنتا ہی نہیں۔ یوں کندھے جھینکتا ہے، جیسے پوری صحرائی کا بوجھ لا دیا۔“

در باری سمجھتا اور رہنے لگا۔ الجھی تک دہ بیل کو اپنے ہاتھوں میں نہیں لے رہا تھا اور

بیل کرماد غیرہ سب بھول کر خود میار ہاتھا:

بھرمی بولی۔۔۔ ”ننگا رہتے کی عادت پڑ گئی، تو پڑا ہو کر کیا کرے گا؟“

”یہ ایسے ہی اچھا لگتا ہے، بھری۔“

بیل جیسے بیگ ہمک کر کہہ دھاتھا — "جھوٹ ! ... اچھا لگتا ہوں تو پھر

بچھے لیتے کیوں نہیں؟" اور اب تو وہ بہت ہی شور مچانے لگا تھا۔—" ہو، ہو، ہو...!"

”بیل ہوتا ہے تو تم کتنا کم لیتی ہو؟“ دوباری نے یو جھا۔

"یہ؟" مصری جل کو نیچے کرتے ہوئے بولی۔ اس کے بازو تھاں گئے رکھتے "یہ موتا ہے

تو مجھے تین بھی مل جائیں ہیں، چار بھی —

درباری نے اپنی جیب سے دل روپے کا نوٹ نکالا اور مصری کی طرف بڑھایا —

”یہ کیا بالجوحی؟“ دہلوی اور اس کا چہرہ لال ہونے لگا۔

”تم لو نا“ درباری بولا۔ اور پھر ادھر ادھر دیکھ کر کہنے لگا ”جلدی سے لے لو“ نہیں

کوئی دیکھے گا۔

مصری نے ادھر ادھر دیکھا۔ اب تک اس کا چہرہ قمرزی ہو چکا تھا۔ اس نے جلدی سے دس کا نوٹ لیا اور ادھر ادھر دیکھ کر اپنے نیفے میں اُڑس لیا اور اس فقرے کا انتظار کرنے لگی جو ب دہ سال میں مشکل سے تین چار بار سنتی تھی۔ لیکن مصری کا رنگ سیاہ ہو گیا جب اس نے درباری کی بات سُنی —

”تم تو جانتی ہو، مصری“ درباری بولا“ میں اس سے کتنا پیار کرتا ہوں — بُل سے

..... اگر تم اسے ایک دن کے لئے مجھے دے دے تو —

..... مصری کچھ نہ سمجھی ..

درباری نے کہا — ”میں اسے کیجھ سے لگا کے رکھوں گا، مصری —

ایک مل کی طرح، قتھاری طرح یہ مجھے اتنا اچھا لگتا ہے اتنا اچھا لگتا ہے کہ — بہت ہی اچھا لگتا ہے“ اور درباری نے ہاتھ بڑھا کر بُل کو لے لیا۔

بُل ایک دم خوشی سے اچھل گیا۔ درباری کی گود میں آتے ہی اب وہ گُردوں کے لیے گردن کو یوں ادھر ادھر گھمانے لگا جیسے مور چلتے وقت اپنی گردن کو ہلاتا گھما تھے ..... پھر اس کے گول گول، گدرائے ہوئے بازو کسی سائکل کی طرح سے چلنے لگے۔ درباری نے کر مرے کے کچھ دانے بُل کے مٹھے میں ڈالے۔ جنہیں لیتے ہی وہ عام طور پر ماں کی طرف لپکا کرتا تھا لیکن آج وہ درباری ہی کے بازوؤں میں شیطانی حرکتیں کرتا رہا۔ کبھی کہتا چھوڑ دیجئے اُتار دو۔ کبھی پکڑو، چھاتی سے لگاؤ — بیچ میں اس نے ماں کی طرف دیکھا ہنسا بھی لیکن منہ درباری

کی طرف کر لیا۔ ماں کو چڑا لے گنا، جیسے دوباری کو چڑا ایسا کرتا تھا۔ مصری ابھی تک بھجوں چکلی کھڑی رہتی اور غیر یقینی انداز سے باپ بیٹے کی سی رونوں سہیتوں کو دیکھ رہی رہتی۔

”کہیں آپ کے گڑے خراب کر دیئے تو؟“

”تو کیا ہوا؟“ درباری نے کہا۔ پھول کی ہر چیز امرت ہوتی ہے۔“

مصری کی آنکھیں نہ ہو گئیں۔ پہلے اس نے سوچا تھا۔ زندگی میں بہت ہی نایاب چیز تھوڑی دیر کے لیے اسے مردمل گیا۔ اب اس نے سوچا، میرے نپے کا باپ پال گیا اور پہلی چیز سے دسری بہت بڑی رہتی۔

”میں اسے کھلاڑی گنا، پلاں گا، مصری“ درباری نے دعہ کیا۔ ”تم رات دنل بجے کے قریب اسے لے جانا۔“

”اچھا۔“— مصری نے سر ٹالا دیا۔

مصری چلی۔ پھر ڈک گئی۔ مرکر نپے کی طرف دیکھا جو درباری کے بازوں میں کھیل رہا تھا۔ اور اپنے ارادگر درباری کی بند مٹھی کھولنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اور اس کے نہ کھلنے پر جھوٹ رہا تھا۔ مصری نے آزاد بھی دی۔ تبل نے دیکھا بھی۔ مگر اسے آج کسی بات کی پرواہ نہ تھی۔ باپ کی پھانے تھی تو ماں کی بھی نہیں۔

مصری پھر چلی لیکن جیسے اس کا دل وہیں رہ گیا۔ ڈک کر پھر دیکھنے لگی اور جب اسے اس بات کی تسلی ہو گئی کہ تبل رہ لے گا تو وہ جلدی جلدی چلی گئی۔ پکھ دُر جا کر اس نے نپے میں سے دل کا لوز نکالا اور اس کی طرف یوں دیکھا جیسے کوئی اپنے شوہر کی طرف دیکھتی ہے۔ درباری تبل کو لیے اندرا گا۔ تبل کو کرے کی بہت سی چیزوں میں دیکھی پیدا ہو گئی۔ ہر چیز اس کے لیے نئی تھی۔ ہر شے کو وہ مُنخہ میں ٹال کر ایک نیا تجربہ کرنا چاہتا تھا۔ ایسا تجربہ جس کی کوئی حد نہیں۔ ایسا سواد جس کی کوئی سیما نہیں۔ جبھی ماں اندر چلی آئی اور درباری کے ہاتھ

میں پچھے کو دیکھ کر حیران ہوا تھی۔ ناک پر انگلی رکھتی ہوئی بولی ۔۔۔ ”بائی رام، یہ کیا ہے؟“

”بتل مال! ۔۔۔ مصری کا بیٹا“ درباری بولا۔ ”مجھے بڑا پیارالگتا ہے۔“

”اس کی ماں کہاں ہے؟“

”گئی ۔۔۔ میں نے تھوڑی دیر کھینچنے کو سے لیا ہے ادھار ۔۔۔ ایک بارہ پیڈا اگر دیا۔ پھر ماں کا کیا کام؟“ درباری نے ماں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”جارے جا“ ماں بولی ”چھٹا آٹھ مہینے تک ہی ماں کی جرودت ہوتی ہے۔ پھر جیسے اپنے آپ نیزے ایسے لوٹھے بن جاتے ہیں۔“

”اپھا ماں“ درباری نے کہا ”میں اسے پودا رکابی کے سامنے والے میدان میں لے جاؤں گا“ جہاں پاس بی مجھے جگ سوہن کی کتا بیس بھی لوٹانی جیسی توڑا سے پکڑا۔“ ماں نے جھر جھری لی ”ہا۔۔۔ گندرا“ اور ہاتھ ہلاتے ہوئے بولی ”میں تو اسے ہاتھ ہنیں لگاتی ہیں۔“

بھابی جو کچھ دیر پہلے آکھڑی ہوئی تھی، بولی ”استاہی شوق ہے تو اپنا ہی کیوں ہنیں لگاتے ہیں؟ شادی کر لیتے ہیں؟“

”ہنیں“ درباری نے بھابی پر چوٹ کرتے ہوئے کہا۔ ”مجھے دسر دل ہی کے اچھے لگتے ہیں：“

بھابی نے ٹھنڈی سانس لی۔۔۔ اب بھگوان نہ دے تو کوئی کیا کرے ہے؟“ درباری نے بتل کو نیچے فرش پر بٹھا دیا، جہاں اس کی نوجہ جرس سلوو کے ایک چھپے نے اپنی طرف کھینچ لی تھی۔ درباری خود اندر چلا گیا اور بتل چھپے کو صندھ میں ڈالتا، چونتا ہوا۔ شاید وہ کچھ اور بھی دانت نکال رہا تھا۔

ایکا بھی بتل کو اپنا آپ اکیلا محسوس ہوا۔ اس نے اپنے ہاتھ پہلے ماں پھر بھابی کی طرف پھیلا دیے۔ ماں تو جھی جھی کرتے ہوئے اندر چلی گئی۔ بھابی ایک لمحے کے لیے

ٹھنڈی۔ پھر جیسے اندر کے کسی ابال نے اسے بجور کر دیا اور لپک کر اس نے تبل کو اٹھایا۔ اور اسے بیٹھنے سے لگا کر لینے لگی، جیسے کسی اپارٹمنٹ اور شانٹی کے جھوٹے میں پڑی ہے۔ تبل اسے گندہ نہیں لگ رہا تھا۔ من ہی من میں اس نے تبل کو نہلا دھلا کر ایک بھکارن کے بیٹھنے سے کسی رانی کا بیٹھا بنالیا تھا اور اندر ہی اندر اس نے سینکڑوں رشی اور مُوتی فراک بناؤ اے تھے اور سوچ رہی تھی اتنا خوبصورت ہے میں اس کے لیے لڑکیوں والے کڑے بخواہل گی —

اندر چھپ کر درباری نے سوت کیں نکالا۔ اس میں کچھ کپڑے رکھے اور پھر اس کے اور پر کچھ کتابیں۔ پھر وہ صپ سے سوت کیں بن دیا اور بیٹھک کی طرف آمد۔

بیٹھک میں پہنچا تو تبل ہمیشہ کی طرح چھاتیوں میں سردیے ہوتے تھے۔ درباری کے پہنچتے ہی اس نے مٹھے نکالا اور ایک فاتح کی طرح درباری کی طرف دیکھنے لگا۔ پھر اگلے ہی پل جائے کس جذبے، کس گفتگی سے اس نے اپنے پورے پر درباری کی طرف پھیلا دیے درباری نے بڑھ کر ایک ہاتھ میں تبل کو اٹھایا، دوسرے میں سوت کیں ناخاما اور ”اچھا بھابی.....؟“ کہہ کر باہر نکل گیا۔

داور چھپ کر ریڈی مٹی کپڑوں کی دوکان سے درباری نے تبل کے لیے ایک قیص خریدی اور ساتھ ایک نکر بھی۔ قیص تو جیسے تیے تبل نے بہن لی لیکن نکر پہنچنے وقت اس نے باقاعدہ شور مچانا، چیننا چلانا شروع کر دیا تھا۔ جب تک دیر بھی وہ کھڑا رہا۔ برابر اپنی ٹانگوں سے سائکل چلتا رہا۔ ابھی ہم کا پھر گرا۔ درباری ایک ہاتھ سے کپڑتا تو وہ دوسرے ہاتھ کی طرف لڑھک جاتا اور پھر مٹھے اٹھا کر درباری کی طرف حیرانی سے دیکھتا جیسے کہہ رہا ہو مجیب آدمی ہو، ایک بچہ بھی کپڑا نہیں آتا۔

پھر ایک بھلی کے ایک قسم نے اس کی توجہ اپنی طرف کھینچ لی۔ وہ اور پرکی طرف  
تھکا بھلی کے ڈر سے درباری نے پانچھا اور کیا ہی تھا کہ تبل نے پاس چلتے ہوئے قبیل نین کی  
جالی میں اپنی انگلی جادا لی، دکاندار نے لپک کر پانچھا ہٹالیا، ہنیں تو جانب کی انگلی اڑ گئی تھی  
جھٹکے سے پانچھا پرے کرنے پر اس نے رونما شروع کر دیا اور حب درباری نے اسے گود  
میں اٹھایا تو وہ تسلیم کے لیے میں پہلے درباری اور پھر دکاندار کی طرف دیکھ رہا تھا۔

اور اس کی طرف پانچھا اٹھا رہا تھا جیسے کہہ رہا ہو — اس نے مجھے مارا۔

میکی میں بیٹھتے ہی تبل کچھ جھلاسا گیا۔ دراصل اسے نگر کی وجہ سے تکلیف ہو رہی تھی۔ وہ  
”زندگی بھر“ یوں کسانہ گیا تھا۔ درباری نے اسے سیٹ پر بٹھانے کی کوشش کی لیکن وہ تکلے کی طرح  
اکڑ گیا۔ جیسے کہہ رہا ہو — تم گارڈی پر بیٹھو، میں تم پر بیٹھوں گا۔ ہنیں مجھے لے کر چلو۔  
بازار میں جہاں لوگ آجاتے تھے۔ پھر اس نے زور سے اور پریچے ہو کر آخر نگر نکال ہی دی  
اور اس پر کوڈتے ہوئے اسے یوں چور مڑ کر دیا کہ کوئی استری اس کے بل نہ سیدھے کر سکتی  
تھی اور اب — نگر نکال دینے کے بعد وہ خوش تھا۔ ایک عجیب فرم کی آزادی کا احساس  
ہو رہا تھا اسے جب وہ کھڑکی میں کھڑا ساری دنیا کو دیکھ اور وکھا رہا تھا بال

درباری صبب سینتا کے پاں پہنچا تو وہ گھر پر نہ تھی۔ درباری نے سر پیٹ لیا۔ ماں نے  
بتایا وہ پر بھادیوی میں کمڈ سے ملنے لگی ہے۔ پر بھادیوی کا علاقہ کوئی دور نہ تھا لیکن کمڈ کے  
گھر کا کیسے پتہ چلے؟ پوچھتا تو ماں کہتی — کیوں کام کیا ہے؟ اس لیے خاموش ہی رہنا  
اچھا تھا۔

اس پر ایک اور مصیبت — ماں بتانے لگی، پہلے ماں پر رہنے والے سندھی  
نے ”زورٹا“ دے دیا ہے۔ نوش دے دیا ہے تو وہ کیا کرے؟ اس وقت زوالات نے  
اسے نوش دے دیا ہے۔ کچھ دیر بیٹھا دے ماں کی بڑھی بائیں سنوار پا اور بتکارہا یہ تبل اس کا  
بجا بجا ہے۔ بڑا پیارا دلارا بچہ ہے۔ لیکن ماں کو جیسے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ اس نے صرف ایک

باد کہا۔ کیوں رے؟ بیل نے جواب بھی دیا، لیکن ماں نے آگے بات نہ چلائی۔ بیل کو ماں کی بولی معلوم تھی۔ لیکن ماں تسلی کی بولی بھول چکی تھی۔ وہ پھر اپنے رونے لے سمجھی۔ — مکیشی کہتی ہے، ہر سال اتنے ہی سے مرمت پر لٹکایا کرو۔ اب بھلا کوئی روٹی کھائے کہ مرمت کر دائے کیا کیا کاٹوں پاس ہو گئے ہیں۔ کانگریس سرکار تو ڈوبنے کو آئی ہے۔ اشتگر ہی میں کیا ہو گا؟ میں توجہ کا دہری ماٹیکے دوڑ جاتی ہوں..... تم شادی کب کرو گے؟

کوئی بھی دیر میں ماں بور ہو گئی۔ ہاں ماں بور ہو گئی۔ بولی۔ — سیتا پتہ نہیں آتی ہے کہ نہیں آتی۔ تم میکسی پر تو آتھی ہو۔ مجھے ذرا ماہم تک چھوڑ دو۔

”میں ماہم کی طرف نہیں جا رہا“ مل جی —

”کہہ جا رہے ہو؟“

”شہر کی طرف“

”ٹھیک ہے“ ماں بولی ”دہاں بھی پریل کے پاس مجھے کام ہے..... ہندو لوں آرہے ہیں نا۔ مجھے مولی خریدیں ہے۔ مولی جانتے ہو کیا ہوتی ہے؟“ درباری ٹپٹا کر رہ گیا۔ بیل تنگ کرنے لگا تھا۔ اس پر باہر میکسی کا میر چڑھ رہا تھا۔ اسے کچھ نہ سوچتا تو دل ہی دل میں مان تھے پر ہاتھ مار کر بولا۔ — ”چلو ماں جی، میں آپ کو پاریل چھوڑ دوں راستے میں کہہ کا گھر ہے نا؟“

”ہے تو“ ماں اٹھتے ہوئے بولی۔ — ”پر آگ لگے۔ — یہ بازار بھٹی کے.....“

”میں بارگئی ہوں تو میں بارہی گھر بھول گئی۔“

”چلو، اکیسویں بار بھی بھول جانا۔“

”پر تم۔ — سیتا کو لے کہاں جا رہے ہو؟“

”دیدی کے پاس..... کہاں؟“

”سناء ہے وہ مسلمان ہے؟“

”کیا بات کرتی ہیں مال جی؟“ درباری نے جیسے کسی گرتے ہوئے پھر اڑ کو تھام لیا۔  
ستونی تار کسی مسلمان غورت کا نام ہو سکتا ہے؟“

اس سے پہلے کہ مال پورے طور پر درباری پر مسلط ہو جائے، سیتا چلی آئی۔ ہمارے کے ایک جھونکے کی طرح، دامن میں پتے ہی پتے، پھول، ہی پھول لیے۔ اس نے آڑن کرے رنگ کی ایک چوپانی کی ہوئی تھی اور یہی چادلوں کے کفر کی سی ہینڈ لوم ساری لپیٹ رکھی تھی۔ جو جسم کے سارے خطوں کو ایک آزاد، ایک طوفانی سے پہاڑیں لے آئی تھی۔ خود وہ بھار کا جھونکا تھی، لیکن درباری کے لیے پت جھٹر کا پیغام۔ اس کے اندر کے پھول پتے ایک ایک کر کے خشک ہونے اگرنے اور کچھ آندھیوں کے ساتھ اڑنے لگے۔ . . . اور جو ڈال پر رہ گئے تھے، سو کھر کر، آپس میں مکرانے، دل کو دھڑکانے لگے۔

سیتا نے آتے ہی پہلے بیل کو دیکھا اور آنکھیں پھیلایں۔ ”کس کا بچہ ہے؟“ اور پھر لپک کر بچے کے پاس جا پہنچی۔ ”ہے، کتنا پیارا ہے، بیلو سا۔“

”ہاں“ درباری نے کہا۔ ”بیل ہی اس کا نام ہے۔ مہیں کیسے پتہ چلا؟“

”مجھے کیا معلوم؟“ سیتا نے تالی بھارتے۔ بیل کو اپنی آغوش میں بلاتے ہوئے کہا۔

”ہر بچے کی شکل سے اس کے نام کا پتہ چل جاتا ہے۔ . . . مہیں ہنسیں چلتا؟“

بیل نے پہلے شک دشہ کی نظر سے سیتا کی طرف دیکھا اور پھر سکرا دیا۔ جیسے برسوں سے جانتا ہوا در پھر زرازو کے انداز میں بارہوا ٹھادیے۔ سیتا نے اُسے انٹھالیا، چھاتی سے لگا لیا اور سب عورتوں کی طرح تھوڑا جھوول گئی۔ بس رشتہ قائم ہوتے ہی بیل نے چھوٹی الماری پر پڑی ہوئی کسی توکری کی طرف اشارہ کیا اور ”او۔ . . او۔ . . او۔ . .“ کرنے لگا جیسے کہ رہا ہو۔ اس میں کچھ ہے، میرے لیے؟

درباری کی نگاہوں میں خواب تھے اور جب سیتا نے دیکھا تو اس کی نظروں میں سمجھیں تھیں اور بچے۔ شاید بیل سیتا کی آنکھوں میں سے منگکس ہو رہا تھا۔ درباری نے کچھ اٹا دے لے

ہو کر کہا۔ ”گھنٹہ بھر سے میں تھاری راہ دیکھ رہا ہوں دیدی نے بلو ایسے ہے۔“

سیتا نے مل کی طرف دیکھا۔ ”مل۔“

”ہاں جیسا۔“..... ماں نے اجازت دیتے ہوئے کہا۔

”مہر د۔..... میں اس کے لیے کچھ سبکدش.....“

درباری نے اور بے صبری سے کہا۔ ”ہوتے رہیں گے تم چلو۔.... میرے پاس اتنا سائبھی وقت نہیں ہے۔“..... اور سیتا بیل کے گال رگڑتی ہوئی چل دی، کہتی ہوئی ”لے تو تو کھتو اسما، موت اسما، گوت اسما بلو ہے۔.....“

اور سیتا دل میں اتنا سائبھی دسوسمہ لیے بغیر چل دی۔ باہر ڈیکھی کو دیکھتے ہوئے بولی

”اس میں چلیں گے؟“

درباری نے سر ٹلا دیا۔ ڈیکھی ڈرائیور جو بے کیف ہو رہا تھا، خوش ہو گیا۔ پنجھے کی طرف لپک کر اس نے ڈیکھی کا دروازہ کھولا اور بیل اور سیتا اور آخر درباری بیٹھ گئے۔ جبھی سیتا کی نگاہ سوٹ کیس پر پڑی۔..... ایک شک کی پر چھائیں اس کے چہرے پر سے گذری یہ سوٹ کیس۔“

”ہاں“ درباری نے کہا۔

”دیدی کے ہاں جا رہے ہو؟“

”کہیں بھی جا رہا ہوں، تمہیں اس سے کیا؟“ اور پھر ایک خشنناک نگاہ سیتا پر چھینکتے ہوئے بولا۔ ”تم نے کہا ہنیں تھا، چہل بھی لے جلو گئے جاؤں گی۔“

سیتا کو کچھ باتیں سمجھ میں آنے لگیں۔ درباری کے چہرے کی زندگی سوٹ کیس۔.....

بچھے۔..... اس نے ذر کے عالم میں بیل کو سیٹ پر بٹھا دیا اور سخت نگہداشتی ہوئی بولی۔

”ہاں کہا تھا۔“

سیتا نے پھر ایک تیز میں نظر درباری پر چھینکی اور پھر اپنی نگاہیں چڑالیں۔ اسے اپنا آپ

جیسے کچھ گزار لگا۔ ساری کے پتو سے اس نے اپنالال ہوتا ہوا چھڑا پوچھا۔ درباری نے خمار آلو دنجاہ سیتا پر کھینکتے ہوئے کہا — “سیتا! تم پھر تگی ہو، اس دن کی طرح کرنے؟”  
سیتا ڈرگئی — “نہیں تو” وہ بولی۔

میکسی حاجی علی کے پاس سے جا رہی تھی۔ آج سمندر کا وہی زنگ تھا جو مانسون سے پہلے ہوتا ہے۔ میلا گچھیا، گندہ اور گیلا..... شاید دور کیسی برسات شروع ہو چکی تھی اور بے شمار گندے نالے اور ندیاں سمندر میں پڑ رہی تھیں.....

پھر دہی سفر — تازہ یو، اور پراہاؤس، مہاتما گاندھی روڈ، فلورا فاؤنڈیشن —  
اور ایک ہوٹل۔ آج وہ ہوٹل نہیں تھا جہاں وہ اس دن گئے تھے۔

خاتون ایک بیرہ کھڑا تھا۔ درباری سیتا اور بیل کو دیکھ کر لپکا۔ بڑی عربت بڑے ہی احترام سے تھا تھا اس نے میکسی کا وہ دھڑکھولا۔ درباری اترًا۔ میکسی دالے کو پیسے دیے اور پھر بیرے کو سوٹ کیس آثار نے کا اشارہ کیا..... سیتا اتری۔ اس کی انکھیں مُھجنی  
مُھجنی سی تھیں اور بیل کو اچھے بازوؤں میں لیتھنے سے جیسے اسے کچھ تاقل ہو رہا تھا —  
”اٹھاؤنا“ درباری نے بیل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ بچھہ ہمیشہ عورت اٹھاتی

ہے!

سیتا نے کچھ بے بسی کے عالم میں بیل کی طرف دیکھا جسے وہ ابھی اُسے اٹھانا نہ چاہتی تھی۔ لیکن درباری نہ اس کے غصے سے ڈرتی تھی۔ مرد اور اس کی وحشت سے خالق تھی۔ اس نے بیل کو اٹھا دیا لیکن اس سے پیار نہ کر سکتی تھی..... ۱۰۰۰ سے پچھے کچھ کھٹے، کھٹے، گندے گندے کے ٹکار سے آنے لگے تھے۔

ہوٹل اُپر تھا۔ درباری نے یہ بھی تو نہ پوچھا۔ — کمرہ چھپ جو..... اب کوئی ضرورت نہ تھی۔ وہ پہنچا ہوں گے۔ وہی پیشہ و رانہ بے باکی پیدا کر چکا تھا۔ سجن کی اب حزارت بھی نہ تھی۔

سیتا نے دیکھا — سیر چیزوں پر جیسے کسی نے تیل اور گھنی کے درم کے درم لے لئے کہا  
دیے ہیں۔ رستہ جس کی مدد سے نہ جانے کہتے لوگ اور پر گھنے ہتھے ہاتھوں کے لگنے سے میلا اور  
گندہ ہو رہا تھا۔ پوری فضائے کسی باری کی بُو آرہی تھی۔

رستے کو ہاتھوں لگائے بغیر ہی سیتا درباری کے آجھے آجھے اور پر پنج گئی۔

میخرا صاحب نے قیزوں کو آتے دیکھا تو ان کے چہرے پر ایک عجیب مقدس سی چمک  
چلی آئی۔ دو عجلت سے کونٹر کے آجھے سے نکلا ہو رہا تو نہ ہاتھ کر رے کی طرف سویپ کرتے  
پڑھے بولا..... "ولیکم سر..... آج سب کھڑکی کے دروازے سیتا اور درباری پر  
کھلے تھے۔

درباری نے میخرا سے کہا — ہم بلی مورا سے آئے ہیں اور اس وقت ٹرانزٹ  
میں ہیں۔ رات گیارہ نجکے دالی پنجاب میل سے ہگرے جائیں گے۔ جہاں تاج محل دیکھیں گے  
جو شاہ جہاں نے اپنی چھینتی ممتاز کے لیے بنوایا تھا۔ دراصل اسے ممتاز سے اتنی محبت  
نہ تھی، تھنا جرم کا احساس تھا۔ کیونکہ اس سے اس نے سولہ اٹھاڑہ نچے پیدا کیے تھے۔  
اور اپنی اس مدد کا اسے صبلہ دینا چاہتا تھا..... "پڑاں باتوں کی ضرورت ہی نہ تھی۔  
میخرا "سر، سر" کرتا رہا۔ ضرورت پڑنے پر منشا بھی، ضرورت سے زیاد بھی پہتا..... سر  
بھی پلاتا۔ جھک جھک گر ڈاپ بھی بجا لاتا۔

دھیر پر دنخڑ کرنے کے بعد درباری کرے ہیں پہنچا تو تبل کے ہاتھ میں سبکٹ تھے۔  
"یہ کس نے دیے؟"

"بیرے نے" سیتا بولی۔

"اویح — اس کریم کی کون؟"

"پڑوس کا ایک ہمہان دے گیا ہے۔"

اور بیڑہ نچے کے لیے کٹوری میں دو دھلالا رہا تھا... جنہے دو صد یوں سے بیکار

نھا اور آج ایکا ایکی اسے کوئی کام ایسا روز گارمل گیا تھا جو کبھی ختم ہونے والا نہ تھا جس میں کبھی چھٹنی نہیں ہوتی۔ جس کے سامنے پُس کی آمدی اور پکار کوئی معافی نہ رکھتے تھے۔ وہ خوش تھا اور دودھ کی کٹوری ہاتھ میں تھا میں ہوئے وہ یوں کھڑا تھا، جیسے ود کسی کو نہیں، کوئی اسے ممنون کر رہا ہے۔ وہ جانا، ملنا نہ چاہتا تھا۔ —

”اچھا بیرہ“ درباری نے بے رحمی سے بیرے کو جھٹکتے ہوئے کہا۔ پھر تھک گئے ہیں، دیکھو نا، کب سے چلے ہیں۔ اب تھوڑا آرام کریں گے۔“  
”جی؟“ بیرا بولا“ میری جمروت پڑے صاحب....“

درباری نے کھٹ سے دروانہ بند کر لیا اور اندر سے چھٹنی چڑھادی۔ وہ سچ مجھ تھک گیا تھا۔ اس نے ایک گہر انس لیا اور جا کر ستر پر بیٹھ گیا۔ اسے سیتا کا بتل کو دودھ پلانا برا لگ رہا تھا لیکن ود کچھ کہہ نہ سکتا تھا۔ کہتا تو بُرا لگتا، بہستا ہی بُرا —

بھجھی اپنے کھلنڈر سے پن میں بتل نے کٹوڑی کو ہاتھ مارا اور دودھ نیچے گر گیا۔  
”ہاتبا گندہ کہیں مکا“ سیتا نے کہا اور رومال سے اس کا مسٹہ پوچھنے اور پھر جھاڑی سے فرش ساف کرنے لگی۔ بتل کو ہاتھ لگانے کی دیر تھی کہ دو سیتا کی باپنہ پکڑ کر کھڑا ہو گیا۔

سیتا اندر ہی اندر کا شپ رہی تھی، درباری کچھ جمل سانظر آنے لگا تھا۔  
”یہ ہو ٹل کوئی اتنا اچھا نہیں“ وہ یوں ہنسی کمی بات کرنے کے لیے بولا۔

”ٹھیک ہے“ سیتا بے پرواٹی سے بولی۔

پھر درباری نے ناک سکوڑ کر ادھر ادھر سوچکا اور پہنچنے لگا۔ ”د کوئی بُسی آرہی ہے“..... اور پھر اس نے پیسے کے قطرے اپنے مانگتے پر سے پوچھنے والے اور بولا“ تم اب اسے چھوڑ دیجی۔“

سیتا نے بتل کو بھاننے کی کوشش کی لیکن وہ تنکلا ہو گیا۔

درباری نے ایک ایش ٹرے بتل کے پاس لارکھی اور بتل اسے کھلونا سمجھ کر سپکا۔ وہ

سُکی اور کھیلنے لگا ..... وہ کیا کرتا؟

پھر نے گے ڈرہ کر دے ہاری نے آئی۔ ڈی بے میٹنے کھونڈ سے انداز میں سینتا کامنہ  
لیکر ہے۔

”نہ گوان کے لیے ...“ سینتا بولی اور اس نے ببل کی طرف اشارہ کی۔

لیکن درباری کی انکھوں پر جیسے لوٹی چربی پھائی ہوئی تھی ۔ ۔ سے کچھ نہ بکھانی دے رہا تھا۔ صرف ایک ہی احساس تھا کہ وہ ہے اور ایک تر و تازہ اور شاداب رہا۔ وہ تیزی سے سانس لے رہا تھا۔ اس نے جب اپنے بازوں سینتا کے گرد وہ اسے تو وہ گوشٹ پوسٹ کے نہیں، لکڑی کے معلوم ہور ہے تھے اور سینتا کے درم اور گدرا جسم میں کچھے جا رہے تھے۔ سینتا نے کوئی مزا جھوٹ نہ کی۔ درباری کی بانہوں میں کافی ہوئی وہ ہر لمحہ بے درم ہوتی جا رہی تھی ۔ ۔ ۔ آج وہ خود بھی بے سہارا ہو جانا چاہتی تھی ۔ ۔ ۔

ببل نے ڈر کر دونوں کی طرف دیکھا۔

سینتا کو ابھی تک رو تے دیکھ کر درباری کہہ رہا تھا ۔ ۔ ۔ ”مری مطلب ہے انا۔ تم مجھ سے پیار نہیں کرتی؟“

”میں تم سے پیار نہیں کرتی؛ ۔ ۔ ۔ میں تم سے ۔ ۔ ۔“

ببل نے ایش ٹرے کی راکھہ منځ پر مل لی تھی اور اب رو تے لگا تھا!

”چُپ بے“ درباری نے نفرت اور غصہ کے ساتھ کہا۔

سینتا چونکی وہ باہر بھاگ جانا چاہتی تھی، لیکن ۔ ۔ ۔ اس کے ہاتھ بارزو جواب دے

۔ ۔ ۔

درداری کی ڈانٹ کے بعد ببل نے ڈر کر چلانا شروع کر دیا۔ درباری ایک درم آگ جو لا بوکر پلا جیسے، اس کا ٹھلا گھونٹ دے گا۔ ۔ ۔ ۔ اور عورت کے نیچے اس بے آہنگ آواز کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دے گا۔ ببل کے پاس ہے پھر ہے بھی اس نے زندے سے ایک تھپر ببل کو مار دیا۔

بیل اٹھا۔ کر دو رجاگرا۔

”شرم نہیں آتی ہے“ کہیں سے مصروفی کے آواز ہلی۔

در باربی و نسخہ سے جو رجھتے اتنے صفات ستر کے پڑوں میں بھی وہ گندو ہے، وہ سیمکے  
اتنا شرمندہ نہ تھا، حتیٰ کہ اپنے آپ کو حق بجا رہی بھئے کی اس سکھاں  
بھی بہت نی دلیلیں تھیں۔

جیجہ زرباری نے اپنا سر جھیل کر دل میں سے اٹھایا اور بیتل کی طرف نہ دیکھنے لگا۔  
وہ بتائی طرف نہ بیکھنی سکتا تھا کیونکہ وہ نسگی لختی اور بیتل سے اپنے نشکن پن کو چھپا ہے  
تھی اور درباری کو دیکھ رہی تھی جیسے وہ دنیا کا سفلہ ترین انسان کفا جو اس کمینہ حد تک اتر  
آیا تھا... پھر اس کی نگاہیں خالی تھیں، وہ کچھ بھی نہیں سمجھ رہی تھی!

شرمزاںی مدامت اور خجالت سے درباری نے اپنا ہاتھ بیل کی طرف بڑھایا سیتا کا بس چلتا تر وہ کبھی بیل کو درباری کے گندے اور نجس ہاتھوں میں نہ دیتی۔ لیکن وہ کیا کرتی۔ بیل خود ہی بتا ب ہو کر درباری کے بازدھوں میں لپک گیا اور روتے ہوئے اٹھا سیتا کی طرف اشارہ کرنے لگا۔ جیسے کہہ رہا ہو۔ اس نے مجھے مارا... اب درباری کے پاس کوئی دلیل نہ تھا اور نہ سیتا کے پام —

سیتا کچھ نہ بولی وہ رو بھی نہ سکتی تھی۔ جلدی سے اس نے ساری کاپتوں کھینچا اور

## اسکا جسم دھک لیا۔

"سیتا" درباری پھر بولا۔ "تم کبھی ..... کبھی مجھے معاف کر سکو گی؟" اور پھر شکو  
بیٹھے کے انہاں میں، اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ "تم پہلے شادی کریں گے۔"  
ادر پھر اس نے ہمت کر کے اپناد و سرا باز دیستا کے گرد ڈال دیا۔ سیتا نے درباری  
کی آنکھوں میں دیکھا اور پھر ایک جست کے ساتھ درباری سے لپٹ گئی اور اس کے  
کام سے پر سر رکھ کر بچوں کی طرح رونے لگی۔ اس کے آنسوؤں میں درباری کے آنسو بھی  
شامل ہو گئے۔ دونوں کے دلکھ ایک ہو گئے اور سکھ بھی .....  
ان دونوں کو رو تے دیکھ کر بیگ نے رونا بند کر دیا اور حیرانی سے کبھی سیتا اور بھی درباری  
کی طرف دیکھنے لگا ..... جبھی دیکھا ایکی دہنہ دیا، جیسے کچھ ہجا ہی نہیں اور اپنے گرمے  
کے لیے درباری کی مشتمی کھولنی شروع کر دی ..... !

---

# لمبی اٹکی

آخر جب مُتّی سوہی پاؤ نٹ آئھا لخچ کی ہو گئی تو رادی ڈیمن نے اپنا سر پیٹھا لیا۔  
اے سخا! — بس تیر سے لیئے ہے کھال سے گھڑا کے لاؤں گی؟ ” دہ اچھے ڈھانی  
بال ذہنیتے ہوئے بول اور اب کے سچ مجھ روتنی ہوئی دہ اپنے ڈھیلے ڈھلے بول دھنے اور  
بیمار پنگ ہیں پیچے کی طرف یوں بھاونصی جیسے گھڑ سے پانی چھپدا کر کجھی نہیں ہیں انہیں  
غم ہو جاتا ہے۔

مُتّی سرہی کیا جوا بادیتی؟ اس نے پہلے اپنی طرف دکھھا اور پھر بے بسی میں دادی  
رقم کی طرف۔ جیسے دہ کہہ، ہی تھی — اس میں میرا کیا قدر؟ ..... مُتّی تو اپنی لمباں  
سے آپی شرمندہ تھی جیسے جوانی کی ناگہانی یورش کے بعد مہر کنواری گھبرا لٹتی ہے۔ کوئی پوچھے  
جب پیر پھل لگتے ہیں تو کیا پیر گھبرانے، شرمائے ناگتا ہے؟

پنگ کے پاس اخروٹ کی ایک تپانی رکھی تھی جس پر عقیمت کے دگوں سے کڑا  
جو ایک نیکس کا ایک کپڑا پڑا تھا اور اس کے اوپر پانڈوں کے زمانے کی پرانے چھاپیں  
ایک گلتا، جس کے پنے کھلے ہوئے تھے اور ہوا میں اذر ہے تھے۔ گلتا ہمیشہ دادی کے  
سرہانے پری دیتی۔ ہاں داری کا کیا پتہ؟ — بہ ہوتب نہ ہو۔ بیانی برس کی عمر  
تھی اس کی اور جہاں لگھا اور اس تسلی مختکے کے لوگوں کی بے آسی بُرھتی جا رہی تھی دادی  
مل کی امیدیں جوان ہو رہی تھیں۔ وہ کچھ نہیں توکم سے کم اتنا ہی اندھی بیاشی سال اور جین  
چاہتی تھی جیسے ابھی کوئی سرا دنیں آیا۔ آیا ہے تا ابھی آیا ہے۔ اس کی دُصندلی مغربے چین  
آنکھیں نہ معلوم اور کس وچتر گھٹنا کو ڈھونڈتی تھیں؟ مُنہ کس ذاتے، چٹخارے کی تلاش  
میں تھا؟ اس کا چہرہ پڑ پرے گرے ہوئے پیسیل کے پتے کی طرح تھا، جس میں دگوں اور  
ریشوں کا ایک جال سانفر آتا تھا، ہر بالی کہیں نام کو نہ تھی۔

داری رسم کی ہر یالی کہیں نہ کہیں ہندو رائی ہوئی تھی۔ دندے سے کہتے وہ کہتی۔  
ہوا سے ہوا ہی میں، ہوا کی تکمیلیاں بھرتی، نضا میں چھوڑیں چھوڑتی ہوئی، بے دم بے سد  
ہو کر تیجیے کی طرف لڑھک جاتی۔ آنکھوں کی پتلیاں اور پر کی طرف سمشتی ہوتی دسم روار کو دیکھنے  
لگتیں۔ پران پانچ چکروں میں سے نکل کر چھٹے میں چلے آتے گئے کامنگہ دنبختے گتے۔ بھابی  
شیلا پیٹی کوٹ ہی میں بھاگی آتی۔ دادی کو آخری سواسوں میں دیکھ کر آنکھیں پھیلاتی چلتی  
— ”بائے! کوئی ان کو خبر کرو“..... مُنی سوہی دوڑتی — روئی پکارتی ہوئی۔  
”بالو! کہاں ہو؟ — دادی گئی!“ اور پھر دادی سے پٹ جلتی — ”تو اوی!“ اس بے  
ماں کی بیٹی ..... بچھے چھوڑنے جانا.....“

اور پھر بھابی شیلا اور سنی سوہی مل کر گیتا کے تڑھویں اوصیلے کا پانچ شروع رہیں۔  
سماپتی کے بعد اس کا پہل داری کے نہست دینے لگتیں تاکہ دادی کی جان آسانی سے نکلی  
جائے۔ ایک تو دیسے ہی مرت کے درجود کا احساس، اس پر آدائی میں ڈرتا، کاپتا، دو اتر قم

... پوری فضائیں ایک ڈرائی، گھناؤنی سی جھنکار پیدا ہو جاتی۔ نہ بیکاری کی نوجوانی  
جس سے گھبرا رہتی پکار رہتی ۔۔۔ ڈرائی ڈرائی ۔۔۔ اور اسے ڈرائی  
چوکٹ کرنے لگتا۔ جبکی بھابی بھرپور کے بعد اگر ہیں ما۔ تھے ارم ہیں مانند اور ہیں  
پر ہاتھ دوڑاتے ہوئے کہتی ۔۔۔ ڈرائی اور پھر ۔۔۔ اسے کوئی بیچھے نہ رکھا  
کرو۔ بے گتی، مرگی تو خرچا کون کرے گا؟ کون پنڈتوں کو روپے پوچھے گا؟ نہ پھر  
نوازے تو خالی بیہان سے ہر دروازہ کراچے ہے ۔۔۔

اور دردی کو یوں گھست کر پلٹک پر سے نیچے پھینک جاؤ، بیسے بیسے خدا دکھانے  
سے ملتا کر دھلانی میں پھینکتے ہیں۔ اسے زمین پر ڈالنے ہی متنی سوہنی رنگی کی طرح  
جاتی۔ اور تھوڑی دیر کے بعد آٹھ کارڈیز دیے میں گھی اور گھی میں رسی بی۔ دنی دنی  
ہاتھ میں ماچس لیتے آتی۔ گھبراہست اور ہوا میں جلدی جلدی۔ زیادتی میں پھنسنے والی بڑی  
وڑی جلاتی۔ دردی کو روشنی دکھاتی تاکہ بھنوں کیپھا بس بھی جو نہ تو تھوڑا۔ جو سندھ  
ہاتھ پر دیا رکھنے کے بعد متنی ڈری ہسمی ہوئی ایک طرف لھتی ہے۔ بھابی اُنہیں اسی  
آدمی ملا تے ہوئے ہری ادم ہری، اس کا جانب کرنے لگتی اور پھر کا ٹریکا۔ ما۔ الیتی  
۔۔۔ "ادم کھبور بھجا سواہ ۔۔۔" جب شید بھابی کو بیکیں ہو جاتا، نہ دنیا کے  
سواس نکل چکے ہیں تو وہ نبردستی کے آنکھ بہانے لگتی۔ مان متنی کے انہیں سچھے ہوتی ہوتی۔  
دردی کے بسا اس کا سہما راتھا کون؟ ماں گئی، اب دردی بھی گئی تو اس کی پہنچت لون کرے گا،  
بھر کے اس تھہ میں کی گواہی کون دے گا جو ہر عورت، ہر کمزورہ و کو بولنا ہی پتا ہے بھر،  
اس کے المٹ سے نریا چرتر پر لون پردے دے دے گا؟ .. شادی تو ہو گئی نہیں۔ کون لڑا  
دیکھے کے بیسے گلی محلے کے ہر آنے جاتے لے بیچھے پڑے گا، پھر اتنا لمبائی بہا بلے گا جو  
کب سے بچھوٹے قد کا کوئی بین ہے کا نہیں۔ بیسے لاتر بیسے گا نہیں۔ مکر دردی ہتھ لی  
بھی لئب تک، اس سفر کے بھوساگر کی تو کوئی تھاہی نہیں کوئی دو۔ نہارہ ہی نہیں۔

وہ انٹلی پڑھنے کا ہے کون پڑھاتے گا؟

... دیوبیا ہیں تو اپنی آقِ نوح، اپنی ہی بھاگیں رہتے ہیں۔ سنتے ہیں یہاں سے  
ڈالیں، بازار پرست نہ رہو گے واسے اپنائیں تو قیامت کے جس کے ساتھ رات جا گئے ہیں  
پہلے تو کھڑا ہے سی نہیں۔ آتے بھی ہیں تو خدا سے شری سے بھجا کے چھوٹ رہے ہیں۔  
پندرہ: سب سکے میکھڑیزیں کے یون بھیا گونشہ موت ہے۔ پر یہ بستار نے ہیں کہ انہوں نے  
تباہی دیتے۔ پکڑے جاتے ہیں۔ ہاں بن پئے بھلاکوں ہے جو بول دھیر کے دھیرے  
بٹکاؤ پڑتے۔ لفڑی ہے؟ سوی اندی ہوتا ہے۔ کوئی مور لے نہیں۔ پھر زیادہ ہنسنے  
ہیں زخمی ہر سنتے ہیں۔ ہم خربناک سے جتنا۔ ہوتی ہے۔ وہ سے غل کے پونچھے یہر پنج  
سینٹ پر۔ وہ جو نے برتنوں میں سے کالسی کا طلاق اٹھا کر ان کے سر پر دے داری ہے۔  
دو سو ایک میں، سنتے ہیں یہ جو سب میں والوں سنتے ہیں، انہوں سے فوچتی ہے۔  
جن سنتے ہیں عورت مرکان اتے سی ماں پڑیٹ کا ہے ...

پھر برق گلی ہیں کھینچتے جاتے ہیں۔ جو برق نہیں۔ ہنسنے۔ ایسا طرح کا نیو  
بن جاتے ہیں۔ ایسا بڑتے اور کیا چھوڑتے، گلی کے سب اس لکھر میں آدھکتے ہیں۔ بڑی بڑی  
لکھیتیں، رت سے بڑے بھاشن دیتے ہیں۔ لہائی کیا چکاتے ہیں، اور حجکڑا بڑھاتے ہیں  
کھلاڑی اپنی بیکانے ہیں کوئی اپنی آستینیں بھی چڑھاتے ہیں؟ ... نہ سے دوکھتے خوش  
ہوتے ہیں، یہ پہ بھی نہیں بنتے۔ پھر پڑے پھاٹے جاتے ہیں۔ پہلے تو بھابی  
جس پر وہ ہو جانے کے ذمہ سے ہاں نتی ہوئے اندر بھاگ جاتی تھی۔ پر ایک دن ایسا آیا  
لہ وہ ... نے منے لھڑی تھی ... ننگی؟! پر دنوں ہاتھ کو لھوں پڑ کھے ہوئے  
مجڑیٹ کی طرح ... ہے رام! ایک پیرا و اکھگوان دیتے ہیں دوسرا انسان انسانوں میں ہے  
سنتے تو اب ناچھ دا پہنچا ہی پڑے گا اور بھابی ... انسان میں اکھگوان کا پیرا و اپین  
لھڑی تھی! ... پڑوسی میں چینیں کے دُخانہ ان ہیں ... شویتہ میر جین اور دگامبر ...

اسی دن شویت مبروں کی دوفوں پہنچوئیں آئی تھیں اور شرم سے پانی پانی ہوتے ہوئے بار بار اپنے  
منفرد حصی کے پتو سے ڈھک رہی تھیں۔ ان تک بات رہتی تو کوئی بات نہ تھی۔ ڈھکا مبروں  
کے سوکھم مٹی بھی وہیں نہیں جو بھابی کے اس رعب رابہ کو دیکھ کر بھاگے۔ لوگ تو سر پر پاؤں  
لکھ رہے ہو سکتے ہیں نا؟ — سوکھم مٹی پاؤں پر سر کھکھ لے گے۔ دروازے کی دلہیز کے  
سارے ٹھکڑائے پھر لٹک کے ہئے... پھر گئے سو گئے۔ کیڑوں مکوڑوں سے راستہ صاف کرنے  
 والا ان کا بھروسہ بھی وہیں رہ گیا۔ ناک کا پکڑا بھی گر گیا۔ نہ معلوم کتنا جیو جنتوان کے پاؤں  
تمے آرہنا ہو گئے ہوں گے اور کتنے ناک کے راستے اور چلے گئے ہوں گے؟ بھابی کو کفہ  
پاپ لگا ہو گا۔ جب سارے جھنگیتے بھول مرد یا بھیا اس پر دری پھینکتے۔ کھیٹھے پوئے  
نذر سے گئے... .

یہی بھابی پہلے بات بات پر مائیکے کی ٹھمکی دیا کرتی تھی۔ جھبٹ سے لہنگا سنپھالتی، اگا  
خواں اور جپل دیتی۔ پڑا نست میں دہ سمجھ کری۔ اب اگا نہیں دھنکا بھی ملنے تو وہ نہیں جاتی۔  
یہیں جائے؟ کھر عورت کا ہوتا ہے۔ مرد سافر اس بات کو کیا جائیں؟ اس کا باہر ہوتا ہے  
سیلے رہی جائے —

... دوسری طرف بالپو ہیں۔ جب پولیس میں ڈپنی تھے تو کیا لہڑ کا درڑ کا تھا ان کا۔ مجال  
ہے جو لہڑ میں دیر سے بیتھ جائے، کھانے میں نمک زیادہ پڑے۔ ایسے میں تھاں سر درشن چکر  
کی طرح گھومتی، تشنگاتی ہوئی آنکھ میں ہونی تھی، کھورلوں سمیت اور ایسی کالیاں سننے میں  
آتیں جو چوک میں بھی نہ بلکی جاتیں۔ اُدھر بانگھی، اُدھر بالپو کون جانے کیا ہوا؟ ایسی اُدھر اسی  
کپڑے، اُنی کوئی تھاہ نہیں۔ جیسے کوئی بان پر سکھ لے لیا۔ عورت کا راج اپنے مرد سے ہرتا  
تے تو۔ اُدھر بھی عورت ہی تے ہوتا ہے۔ اب وہ صحیح سورج نے نکل جاتے ہیں اور سیمہ والی نہر  
کے پاس، کھاڑے کے بغل میں ایک پیکل۔ پاکھنڈی مہاتما سے تنسی جی کی چوپا پائیاں سناتے  
ہیں۔ بادہ مہاتما ٹھیک سے ارتھ نہیں کہ پانے بابا پو اپنے مطلب کا مطلب نکال لیتے ہیں

اور پھر اوداں ہو جاتے ہیں۔ رات گھر آتے ہیں تو چوروں کی طرح۔ پیر سن بھال سن بھال کر زمین پر رکھتے ہوئے گھر بھر میں ڈر کے مار سے کوئی ان سے کچھ نہیں کہتا۔ اکثر ڈکوئی کھانا بھی نہیں پوچھتا۔ جب بولا ٹکر جا کرتے تھے تو کوئی جواب بھی دیتا تھا۔ اب وہ پچپ ہیں تو سارا سنوار چپ ہے۔ سبھی اس بات سے ڈرتے ہیں کہ بان پرستہ لیا تو سنیا اس بھی لٹھ سکتے ہیں۔ پھر پنیش گھر میں نہ آئے تو گزارہ کیسے ہو گا؟۔۔۔۔۔ بھیا کی سائیکل کی دکان تو چلتی نہیں۔ نہ کس کے لئے جو بیج میں گول مال کیا تھا، ان کے کارن ایک دل میٹھے بٹھ دشمن کی اکیفی بند پوکی!

بھیا یوں نہیں آتے، با پو گھر میں نہیں رہتے۔ اب یہاں عورتوں کا راجح ہے۔ ہم عورتیں سبھی راج کی اچھا کیا کرتی ہیں، پر جب مل جاتی ہے تو سر پیٹ لیتی ہیں۔ نا بابا! ایس راج کسی کو نہ ملے۔ دد نہر، ہی کیا جس میں مرد نہ آئے۔ حکم نہ چلا شے، ہر روز کوئی نیا جھکڑا خداونہ مچانے۔ عورت بیرن آخر تو مرد ہی کے نام جانی جاتی ہے۔ مرد کیا ہے؟۔۔۔۔۔ دلدار سے پوچھو، بھائی سے پوچھو،۔۔۔۔۔ سامنے والے شاہد میاں کی آپا سے پوچھو، بھائی سے... پر میرا تو وہ آئے گا، ہی نہیں۔ آئے گا بھی تو چلا جائے گا۔ تیکنی جات کی ہم عورتوں کی قسمت ہی ایسی ہے۔۔۔۔۔

جیھی شیلا بھائی کو دادی ملن کا مانتا گرم دکھنے لگتا۔

” یہ تو“ وہ مان تھے پر با تھہ مارتے ہوئے کہتی۔۔۔۔۔ ” جی رہی ہے۔۔۔۔۔“  
مُسْتَقی سوہی چھپٹا کے لمبے لمبے با تھہ پیر مارتی ہوئی سوچ بچار کے بچکوں سے نکلتی اور لپک کر دادی ملن کے مان تھے پر با تھہ کھدیتی جو اس سے اپنی جوانی اور اس کی گرمی کے کارن ویسے ہی برف کا برف معلوم ہوتا اور پھر تھوڑا گرم۔ جیھی دادی کا کانپتا ہوا با تھہ زندگی کی تاثیر میں اٹھ جاتا۔ سوہی مری جی اٹھتی، شیلا جیتے جی مر جاتی۔

” دادی کو اود پر دا، شیلا بھائی“ مسی چلائی۔

بھائی ماتھے پر سائٹ شیکر سے بھوڑتی ہوئی کہتی "تم قاتلو ترڈالو... بمحض سے ہنسیں اٹھائی جاتی یہ گلی لکڑا۔"

مُسْتَنِی اپنے بیسے چوڑے کے کلاوے میں دادی کو اٹھلتی اور پھر سے پنگ پر ٹھاویتی۔ کھٹی ہی دیر میں رقمن بولنے لیوگی ہو جاتی۔ ہوش میں آتے ہوئے جس پہنچے شب کا آچار نہ کرتی وہ "منو" ہوتا جس کے جواب میں مُسْتَنِی بھی ہمیشہ بڑھیا کو پچکارنے ہوئے ہوں۔ ول مُسْتَنِی — "وویا! جبھی ایسا معلوم ہونے لگتا جیسے دادی مُسْتَنِی ہے اندھتی دادی۔" دراصل مُسْتَنِی اور دادی ایک دسری کی طرف چلتی ہیں تو زیج میں کہیں ابیسے مدد! ایسے نکڑ پہل جاتی ہیں۔ جہاں ماں کھڑی ہوتی ہے، جو کبھی اپنے آپ بودھی ہو جاتی ہے اور کبھی پتھی بچتی ہو یا بودھی عورت سے ماں پنے کا الزام تو مل ہی نہیں سکتا۔ وہ اس کے مل موت میں جلیتی، اسی میں مر جاتی ہے۔ اور مرد دے یہی بحثتے ہیں — اس کی آئی تھی اس لیے چیزیں ...

"تو نے مجھے پکھارانا" دادی منو سے پوچھتی۔

"نہیں تو" مُسْتَنِی جواب دیتی "میں نے تجھے نہیں پکایا۔"

دادی سرزنش کے انداز میں انگلی اٹھاتے ہوئے کہتی — "دریکھ... میں نے تیرے باپ کو جنکھے ہے" اور بھر... "میں سب جانتی ہوں تیرے چلیڑا۔ عورت میں چار سو جاہلی چلیڑتے ہیں، پر تجھے میں چار سو آپانے ہیں!"

اس پیارنی سی پھٹکار کے بعد مُسْتَنِی تھوڑا اور بھی دادی کے پاس رکھ آتی —

"تیری سوں دادی" اور پھر ایکا ایکی مُسْتَنِی کو بیاد آ جاتا... ہاں، ہاں، بے بس بول راس نے دادنی کو آواز دی تھی۔ شاید — ہی آواز تھی جو کھنڈ دل، برہنڈ دل کو چپر تی ہوئی دادی تک جا ہی سخنی اور دے سے پھر اس سنوار میں لے آئی، پر اُنی جانتی تھی۔ اور پر جاتی ہوئے دادی بھی تو مژہ مرد کرنے کے دلکھتی ہوگی۔ وہ جانا نہیں چاہتی تھی۔ ابھی کچھ کام تھے جو اُدھورت

ہے گئے تھے، جنہیں وہ نپانا چاہتی تھی۔ مُمنی آخر مان جلتی ۔۔۔ ”ہاں دادی! میں نے پکارا تھا ۔۔۔ میری اور سنتا کون ہے؟“

گلی مخنے لی کچھ عورتیں مزاج پُرسی کے لیے آجاتیں۔ شیلا بھابی کچھ دیر کھڑی رہتی ہو ر پھر دادی پوتی کے نیچ یہ الگھی عشق بازی دیکھ کر ناک نسوان چڑھاتی ہوئی اندر رسوی بھٹدارے کی طرف چل دیتی۔

دادی قسم پھر انہنا چاہتی۔ بڑھاپے میں اور تو سب چیزیں نسان اٹھانی پڑتے ہے بہ اپنے آپ کو اٹھانا بڑا مشکل ہے۔ اصل میں بوجھہ شریک کا نہیں ہوتا، میں کا ہوتا ہے ۔۔۔ دادی جو کوئی ہی دیر پہلے مر رہی تھی عورتوں کی درد پینے سے انکار کر دیتی۔ مُمنی کے بڑھے ہوئے ماتھ کو بھی جھٹک دیتی اور انہکر بیٹھ جاتی اور مُمنی کی طرف دیکھتے ہوئے کہتی۔۔۔

”یہی میری دشمن ہے، گلوکی ماں۔“

گلوکی ماں، قریب ہوتے ہوئے پوچھتی ”کیوں ماں... مُمنی کیسے دشمن ہو گئی؟“

”میں اچھی بھلی جا رہی تھی“ دادی قسم کہتی اس سُرٹی نے نہ جانے دیا۔

پیار سے دی ہوئی اس گالی سے مُمنی کے سارے چھوٹے موٹے ڈر سب دیکھ دل تھے دوڑ ہو جاتے۔ ایسے میں دادی دشمن کی سجائے مُمنی کو سجن کہہ دیتی تو کیا ہوتا؟ پھر دادی کو وہ سارے درش باد آ جاتے جو اس نے تھوڑی دیر کی مت بیس دیکھتے تھے۔۔۔

”کتنا سدر بامکا تھی، جمنا!“ وہ سامنے دیکھتے ہوئے کہتی۔ جیسے اب پھر بامکا دکھائی دے۔۔۔ ہی ہو۔۔۔ ”چہول اور ہری بیلیں، وہ ان بیلیوں میں کھوں، ان کھولاں میں پر کاش، جس میں بڑے بڑے رشی مُمنی بیٹھے اکھنڈ کیر تن کر رہے تھے...“

گلوکی ماں، جمنا، مُمنی سب شردھا سے سنبھلتی ہیں۔ دادی کبھی آہستہ، کبھی تیز اندھہ کا سب و گیان لٹانے لگتی۔۔۔ کر دڑوں سو رو جوں کا جیا لا...۔۔۔ پھر گرمی نام کو ہنیں۔ اسی ٹھنڈک جو دگدھ سے دگدھ من کو ہرا کر دے۔۔۔ ایسا سکھ پہنچاٹے جو کہنے میں نہ آئے...۔۔۔

بس ایک ہی آگ کھتی ہو میری اور لپک رہی تھی۔۔۔

”اُڑ ہے... آگ نیسی ماں؟“

دادی سُنی کی طرف، شارہ کرتے ہوئے کہتی ”سپُونی کی آداج...“

جمنڈ بول اٹھتی ”پر آداز تو شبد ہوتی ہے دادی...“

”مُور کھہ ہونا“ دادی سمجھ لے کر جمناس سے کہتی ”اتنا بھی نہیں معلوم؟ انڑیں شہد اور پرکاش میں کوئی بھید نہیں ہوتا“

”دھنیہ ہو“ جمنا کہتی اور دونوں ہاتھ بوجہ کر مسکار کر دیتی۔

”دھنیہ ہو دادی“ باقی کی بھی مسکار اٹھنیں۔

اور پھر دادی برابر بولتی جاتی جیسے کوئی جیابی لگ گئی یا جیسے کوئی دیر پہنچے کی چہپ کا گھام اپورا اور سری ہو۔ پھر اس عمر میں جبکہ کوئی کسی کی نہیں سنتا۔ جمنا اور ٹلوکی ماں کے سے شروع تا مل جائیں تو اور کیا چاہیے؟ ان سب کو زور زدہ سے سر ہلاتے دیکھ کر سُنی ڈر جاتی۔ پہنچ بھائی اور بھائی کے جھگڑے کے کارن گھر بھر لوگوں کی آر جمار کا کینہ رینا ہوا تھا، اب دادی کے دیوی بن جانے کی وجہ سے۔ چہب اور بھی عورتیں آنے لگتیں نوچار سو پانچ چلتے والی منی دادی کی بات کاٹ دیتی۔۔۔

”اچھا دادی.... وہاں سرگ میں مجھے دادا نہ ملے؟“

ایکا ایکی دادی کے ڈال پر سے گرے ہوئے سوکھے پستے کے رگوں اور ریشوں میں ہر بیالی دوڑ جاتی۔ اور نو بیالا ہتائی طرح وہ شرعاً تے ہوئے کہتی۔۔۔ ”ملے کیوں نہیں رہی تھی؟“ یک دم پانسہ پلٹ جاتا۔ دہی عورتیں ایک دسرے کے کوٹھے میں ٹھوکے دینے لگتیں اور اشارے اشارے میں کہتیں ”سنو، سنو۔۔۔“

”تب وہ کیا بولے؟“ منی نوچھتی۔

”پیڑوں کی لستی مانگ رہے تھے“

مُسْتَی جمنا و نہ کھوگی مال اور دوسرنی عورتوں کی طرف رکھتے ہوئے کہتی "دادا جی کو بہت پسند کھتی پڑوں لئی آتی" اور پیروادی سے بولتی کیا وہاں سرگ بیس پڑیے بھی نہیں دیا۔  
پڑیے سے بھی نہیں، کھٹک کر صھی بھی نہیں۔  
نکھٹک کر صھی دادی کو بہت پسند کھتی؛  
ایسے سرگ بیس جانے کا کیا فائدہ؟" مُسْتَی کہتی۔

"مُسْتَی تو" دادی اپنے بھول پتے میں جواب دیتی "کل تم دیلوں کے پچاری جی کو نیونا دینیا اہد ساتھ پسند تر ریا رام کو بھی۔ خوب کھانا کھلانا اور پیش بھر کے پڑوں کی سُتی پلائیا۔"

عورتیں اپنی غصی دباتیں۔ مُسْتَی کہتی "ہاں دادی .... یہ کوئی سرگ تھوڑے ہے۔  
جہاں پڑیے سے بھی نہ ہوں۔"

اہد دادی سامنے دیکھتے ہوئے بولتی جاتی "کیسے سامنے آکر کھڑے ہو گئے ...  
مند نکی پیروں جواہروں سے بھڑت مرٹت چوکھٹ میں۔ دیے ہی شیر جوان، یہ چوڑی چکلی  
چھاتی لٹکت کرتا ہوا چھڑے۔ اس پر یہ بڑے بڑے موخھوں کے کالے گپتے ...

"کالے گپتے؟" مُسْتَی کہتی "ابھی تک ان کی موخھیں کالی ہیں؟"  
دادی پوچھے مُسْتَی کے ساتھ تھوڑا نہ دیتی۔ پا مغل ہے نا... کال بھجو ان  
کی مارو ہاں تک نہیں پہنچتی، منو۔ دہاں جوان بوڑھے نہیں ہوتے میں نے دیکھا ان کے  
پاس ایک سندھ، سجل لڑکی نکھی۔ کیا روپ تھا اس پر۔"

"کیا بات کر رہی ہو دیا؟" مُسْتَی بول اٹھتی "ہاں بھی دادا۔"

"ہاں .... یہ بھی تو پوچھو دو نکھی کون؟"

"ک کون؟"

"وہ میں نکھی۔ جب بیا ہی آئی تھی"

اس پر سب ہنسی کھلاڑے بوٹ پوٹ ہوتے لگتیں۔ ان کی ہنسی نہ سکتی دیتی تو  
داؤن کو۔ اور وہ کہے جاتی سیراہات پکڑ کر بولے۔ ”تم آجاؤ... رعن... اب ہنسی  
سچھ جائی۔“

یہ عورتوں کے صیر کی حد تھی۔

دلوی بولتی۔ ”میں نے ہاتھ چھڑایا۔ کہا، میں ابھی ہنسیں ہے سکتی، جگن کہتا؟  
ابھی کئی دیر اور سیر ہے راہ دیکھو، مجھے دنیا میں بڑے کام ہیں۔“ اور دلوی کے چہرے  
پر کی نہر و لداہ دیکھیں میں جھبر جھبر بہتے پانی کو دیکھ کر عورتیں ایک دم چُپ ہو جاتیں۔ دادی  
ایک ہاتھ تسلی پر پڑی ہوئی گتیا پر رکھ دیتی اور دسر سے سے وصوتی کا پوچھا سکتا آنکھیں  
پوچھتے ہوئے ایک جیوتی ہیں نجھہ مسٹی پر ڈالتی اور بلبلہ تھی۔

”پہنچ ری سوہی... تو کسے سوہنے گی؟“

اسی ایک ہی باشہ بھی باقی کی عورتوں کا ہند رسمی پانی ہو کر آنکھوں میں چلا آتا۔ ہر خر  
دوہ شیخیں ہاتھ جوڑ کر نکل کر قیس ٹوٹنی ہو دھنیہ ہو دھنیہ ہو مان کہتی ہو تو ایک ایک کر کے چل  
و نیچیں...“

جگن نا تھے تیاری اور ان کے بیٹے دیونید رتیاگی کے مکان ڈپٹی سجنوں میں کامے بھی آئے  
اور گورے بھی آئے۔ پر مٹتی سوہی کے رنگ کا ایک نہ آیا۔ اس کے قدر کا نہ کام کوئی نہ پہنچا۔  
مٹتی سوہی خالی خوالی لمبی ہی نہ لختی، بد ن بھی بھرا ہوا تھا اور اس کا زنگ، اپنے ہی ہو  
کی آگ میں جلتے رہنے سے تابنے کا سا ہو گیا تھا۔ کبھی تو وہ کونا رک کے مندر کی تانتریک  
ٹلپیوں کے ہاتھ سے بنی ہوئی، بڑی سی کمیٹی معلوم ہونے لگتی اور کبھی ایک بڑی سی دیگر بیاہ  
مشادریں میں جس میں حلوہ یا اڑو بیکا سے جاتے ہیں اور جس کے پیچے برابر کی آنچ کے لیے منوں

ہی لکڑیاں ڈالنی پڑتی ہیں اور پھر کیا حلوہ بنگے ہے، کیا اڑو ہوتے ہیں ... ٹھلی باراڑیں  
زیکلتی سرہی تراپنے آپ سے بھی ایک فٹ آگے چلتی جیسے کہہ رہی ہو -- ہٹ  
حادُّ میں آرہی ہوں۔ لوگ راستہ دے دیتے، پچھاڑیں کھا کھاڑیں بھتے جیسے فپی  
جگن ناتھکی ہتھیں، کسی راجا کی بیٹی ہو!

تیاگی کل کی سب بیٹیاں ایسی ہی ہوئیں۔ چھوٹے فٹ کی اور بڑی چھوٹے اور بھرپور بھرپور تھے۔ سب بیٹیوں کی شادی میں بہی مصیبت ہوئی۔ ہری ختم گئے۔ آپر میں چار لپشت میں کوئی ایسی بہو آئی کہ پورے کل کی تباہی سے آئی۔ ایسا سلسہ شروع ہوا کہ رکنے کا نام بھی نہ لیا دادا پہلے آدمی تھے۔ جنہوں نے خاندان کو اس بر بادی سے بچانے کی کوشش کی۔ دادی چھوٹے قدر کی لائے مطلب، اپنی بیوی۔ مُنتی کی دادی خود مُنتی کی ماں بیوی کے قدر تھی۔ بیوی کی بیوی شیلا بھی، نائی بلکہ بونی۔ دادا کے حساب سے اس لپشت میں اولادوں کے ٹھیک ہونے کی امید تھی۔ پر شیلا نے موئی تو دلبوچ ہی لیے: لعل بھی نہ اگلا۔ سب ڈرتے بھی تھے ناک بیٹیاں چھوٹے قدر کی ہوئیں تو بیٹوں کا کیا ہوگا!... پر اس وقت تو مُنتی کا سوال تھا جواب پائیج فٹ تو ایج کی مہوگی تھی۔ کئی گرمیاں آئیں اور کئی گئیں۔ کہتی سردیوں نے شل کیا۔ بہاریں گئیں اور پت جھیر کی بھی۔ سل منے شاہد بھیا کے مکان کے پاس جو کچار کا پیڑ لگا تھا اس نے کئی ہرے اورے کوٹ پہنے اور آثار بھی دیے۔ ڈپٹی بھومن کے باہر بڑھا کر نیچے جو شہیری ڈالی تھی اس میں حجڑ بیاں بھی چلی آئیں۔ برسات آئے آئے، سولہ مولہ، بتیں بتیں آنسو روئی اور نئے مکانوں پر ہری اور کالی کاٹی چھوڑ کر جیے اپنی سسرال چلی گئی۔ پر مُنتی دیکھتی ہے۔

تلی محلے کی رونق، شام کا مذاق... اب کے سال جو گرمی پڑی تو حصہ ہی ہو گئی۔ برسوں میں ایسا امس کبھی نہ ہوا تھا۔ جتنا کی دلوں گائیوں کا مدد و مکنزوں میں سوکھ گیا۔ پہاڑوں پر چلے جانے کے کارن، مکلوکی ماں کے گھر اتو بولنے لگے۔ دن کی روشنی میں اڑنے لگے...

دھرتی سے خبار اٹھتے اور اپنے دماغ، آسمان پر چھا جاتے۔ بادل آتے ہی تو گرجے بر سے بنا ہی نکل جاتے جیسے کسی بجیا کی سیر کرنے آئے ہوں۔ ایک دھول سی تھی۔ جو ہر وقت چھائی اور عقل کو مادفت کیے رہتی۔ اس مٹی اور گرد سے یوں معلوم ہوتا تھا جیسے دھرتی آسمان کی طرف اچھل رہی ہے اور آسمان دھرتی کی طرف لپک لپک جاتا ہے۔ اس جس اور جس میں ایسی لپک جمپ سے یہ پتہ چلتا جیسے پوری کائنات کو اختناق ہو رہا ہے۔

درنواد، آپا فردوس شاہ کل بہت جو دسال سے بھائی کے گھر میٹھی نہیں چلی گئی۔ دو بھائی لے پیر کپڑے معاشریاں مانگیں، توبہ میں کان لال کیے اور آپا کو لے گئے۔ شاہ بوئی ایسے ہی تھوڑے بیسچنے والے تھے۔ یونک میں اس فاصنی کو بھی لے آئے جس نے نکاح پڑھا یا تھا اور جس مہر ہامدھا تھا۔ آپا فردوس کے رخصت ہوتے وقت تھی اتنا۔ .. می ک تمااب بھی گئے۔ آپا نے بہت پیار دیا، بہت تسلی دی اور ہم۔ — "میں بچا اؤں گی مُتو تیری شادی پر تو انشاء اللہ صرزور آؤں گی"؛ منی سوہی نے فرمایا دی نظر وہ سے آپا فردوس کی طرف دیکھتے بوسنے پہا۔ — "تب تو آئی آپا؟"

ڈکا مبروں کی بہو ترمبلکا بائی نے کہا۔ — "سہیا کے جلنے پر تھوڑی کوئی اتنار دنا ہے؟" جب منی نے اپنے آسودوں کو خون بنایا اور پنگی گئی۔ ... پردادی نہیں جو خون کو آنکو بناتی رہتی۔ شیلا اب اس سے تنا۔ آچکلی رہتی۔ اس لیے بھی کہ دادی اب پنگ بی پر چادر کیلی مردی تھی۔ دیوینہ رکھتا بھی تراں بی کبافی تھا مگر دادی سے پیاں کرتا تھا۔ پیاں مردوں کو لوستا پڑتا ہے اس۔ لیے زرنا نہیں پڑتا۔ بس حالی خوفی ہمدردی جتنا، دیوانی کی نظر وہ میں یعنی دگا بول میں، جیسے بنے اور چل دیسے دادی کے پیاسیت کیسے ہوئے کپڑے تھے دھوفی تھی۔ اس پر بھی شیلانا۔ دیوینہ رکھتے ہوئے نہہ آتی باہر جاتی۔ دیوینہ کو یہ نظارہ پہنچت نک چڑھا سکرہ ہوتا۔ ایک دن نہ بولا۔ —

”تم چاہتی ہو دادی مر جائے؟“

”ہاں“ شیربے جھگ بولی۔

”اس کا ایک ہی طریقہ ہے：“

”کیا طریقہ؟“

”مُمتَنی کا بیاد کر دو：“

شیلا پٹھانگنی۔ میں تو کہتی ہوں، دادی بھی جائے اور اس کی پوتی بھی۔ مجھ سے اب کسی کے مرنے لئے میرے جلتے“ اور پھر بولی ”کل ہن تھاری اونچی ایڑی کا جوتا زیکھ رہی تھی... میں تو کہتی ہوں پہنچ۔ میرا دلوں میں چھپتا ہے، کہیں اور پر کی اور پر چلی جائے۔ دیوبند رچپ رہ۔“

”اور ہنسی تو کیا“ شیلا پھر بولی ”دونوں کے لیے جنم راج کیا مجھے ڈھونڈنے جیں؟“

جمنم راج ڈھونڈنے کی ذمے داری چونکہ دیوبند کی تھی، اس لیے وہ پچھڑنے بول سکا۔ وہ طبیعت ہی سے کام چونتھا۔ ہر قسم کی ذمے داری سے گھبرا تا تھا۔ جو کام اپنے آپ ہو جائے سون ہو جائے۔ اپنے پناہگن ناتھ کی طرح ود بھی اپنی اس کاہلی اور بے عملی کے سلسلے میں شہادت روں اور پرانوں کی مدد لیتا۔ — ماں کا سب جتنی چترائی ہے۔ بھگوان نے بھاہے۔ تم پوچھے طور پر اپنے آپ کو یہ سے حوالے کر دو۔ تھارے سب کارج سدھہ ہو جائیں گے...“

کام ہو گا یا نہیں ہو گا۔ اس لیے پنجاں فی صدی کے تابع سے ایسے لوگوں کے کارج سدھہ ہو بھی جانتے ہیں۔

دیوبند برآمدے سے اٹھا، صحن میں آیا۔ ایک نظر آسمان کی طرف دیکھا جہاں بادل گھر آئے تھے۔ کیوں نہ آتے؟ یہ موسموں کا چلر بھی ایک سائیکل ہوتا ہے۔ بردی کے بعد گری گری کے بعد برسات۔ اور پر بھی کبھی کسی گول مال سے یعنی بندہ ہو جاتی ہے... ادھر برسات کی چہلی بُونڈ گری ادھر گو تم دیوبند کے بچپن کا درست لکھتے سے چلا آیا، جہاں اس کے پاس ہند سائیکلوں

کو ایجنسی تھی اور اب بیہل دینا پڑیں سب ایجنسی تو مُگرنے آیا تھا۔  
 گوتمن کے اعتبار سے مشکل سے پار نہ نہ دو بخ کا ہو گا۔ لیکن تن دوش کے اختبار  
 سے اچھا تھا۔ آ کا ہا کا سا چھرو۔ لعل رنگ معلوم ہوتا تھا گلوں میں دشمنوں کے رکھے ہیں۔ بات  
 بات پر اچھتا جیسے نہ جانتا ہو۔ اس صحت کا کیا کرنا ہے؟ رویندہ نے گوتمن کو چائے پر گھر بلایا۔  
 شیلا کے کان گوتمن کی باقی سنتے پک گئے تھے۔ شیلا نے اسے دیکھا نہ تھا۔ شاید  
 اس سے پہلے گوتمن اس گھر میں کبھی آیا بھی نہ تھا۔ اس لیے بھابی تو پہنے میں بھی نہ دیکھی تھی۔ شیلا  
 اس سے یہی تیک سے ملی جیسے برسوں سے جانتی ہو۔ رویندہ لے شیلا کو جائے لانے کے لیے  
 کہا اور پھر انہ کر اس کے کان میں ہصر ہپر کرنے پر ہوئے انہیں بھیج دیا۔

بس، بھی غلطی ہوئی۔ شیلا اندر گئی تو چائے بناتے ہوئے مُتنی سے کہہ دیا۔ ”مُتنی اندر  
 بیٹھک میں نہ جائیو۔“

”کیوں؟“ ”مُتنی نے پوچھا“ وہ آگئے، سمجھتا کے —؟

”ہاں“

اور پھر شیلا خود کیتیں ریتلی نکالنے لگی۔

بھابی مسنون کرنی تو شاید مُتنی کو کچھ نہ ہوتا۔ لیکن اب... اس کے قن بدن میں کوئی آگ سی  
 لپک آئی۔ وہ اب اس حالت کو پہنچ گئی تھی جس میں لڑکیاں آنکھیں بند کر کے صرف آوازیں  
 سن کرتی ہیں اور پھر بے دم ہو کر گر جاتی ہیں۔ مُتنی سوہی کے لیے شاید آواز کافی نہ تھی۔ بھابی  
 کے اندر جاتے ہی وہ برآمدے کی طرف پسکی اور سیر چبوں پر سے ہوتی جوئی نیم چھتے پر جا ہنچی۔  
 جہاں ایک روشن ان بیٹھک کے اندر کھلتا تھا —

شیلاڑ سے میں چائے اور کچھ دال ٹوٹ دغیرہ یہے بیٹھک میں آئی۔ رویندہ نے اچھاتے  
 ہوئے کہا۔ — ”مہرو... میں کچھ پڑیے سکتا ہوں۔“  
 ”اے نہیں بھابی...“ گوتمن نے روکا۔

ایں منٹ میں آتا ہوں" دیونید رنے کہا "میں جانتا ہوں تم پڑے بہت پسند کرتے ہو" اور اس سے پہنچے کہ دیونید رکو کوئی روکے وہ نکل گیا تھا۔  
 مئی روشنداں سے دیکھ رہی تھی۔ گوتم آگئے بڑھ بڑھ رجھابی شیلا سے دیور کارشہ جگہ رہا تھا۔ دیور رجھابی کارشہ جو ایک طرح سے ہر دیور کے لیے شادی کی ریہریل ہوتا ہے... جس میں ادب کی حد سے پہلے اور نیچے پن کی سیما سے درے کی باتیں ہوتی ہیں... رجھابی چیز بھی ایسی بولی ہے کہ اس کی ہر نس اس کاہر پور چھڑنے کے لیے تیار رہتا ہے۔ گوتم شیلا سے کہہ رہا تھا۔ "کوئی زور بکاؤ رجھابی — ایک بیٹا جن دو نہیں تو یہ بھیا میرا دوسرا شادی کرے گا" دیونید را بھوآئے نہیں تھے۔ رجھابی نے وال موت والی پیٹ سائیز کہ کر چائے انہیلی اور کہا۔ "بان دیور جی — یہ کہہ بھی رہے تھے"

"کیا کہہ رہے تھے؟"

"ہی کہ اگلی بیساکھی تک کچھ نہ ہوا تو — دوسرا بیاہ کر لیں گے" اور شیلانے جن بوجہ کر شند پرے کر لیا۔ جیسے رونزگی ہو — گوتم لپک کر اپنی ہنگہ سے انکھڑا پوا۔ "تو رجھابی؟" ... اور اس کے باقیہ جانے ہی میں آستینیں چڑھانے لگے جبھی است، ایک کھلی سنائی دی ... رجھابی نہ رہی تھی! گوتم سمجھ گیا۔ ایک نسیم کی سنس لیتے ہوئے بولا "ادہ رجھابی — تو نے تو بیری جان بھی نکال لی" اور پھر چار پانچ پر دسم سے بیٹھ گیا جو صوفی کے طور پر استعمال کی جاتی تھی۔ سو قوت تو گوتم بن بھی گیا تھا لیکن اس بیز مریتست پنجے کے لیے برابر ہاٹھ بیریا تارہا۔ ظاہر ہے گھر آنے سے پہنچے دلوں دستوں میں کچھ تو راز دنیا ز کی باتیں ہوئی ہوں گی۔ چائے کی پیالی تھا میں ہوئے وہ خیلا کے قریب ہو گیا اور کان کے پاس منہ کرتے ہوئے بولا "مدائق کی بات نہیں رجھابی اسنا ہے دیونید رکھیا نے ایک نس رکھی ہے —"

شیلا کے منہ میں آگ کا ایک بھجھا کا سامنا۔ سارے بین میں آگ لگئی۔ اب وہ

نہ مذاق کر سکتی تھی اور نہ سن سکتی تھی۔ اس کے باہم ہم کو جو تھیں لگی تھی۔ اس میں اس نے گوتم، ہی کا تنخوا کر دیا۔ ایک دم ناک پھلاتے ہوئے بولی۔ — تھیک ہے... مرد ہے لوز کھلہ ہے اور کیا تم ساچو ہما عورت رکھے گا؟

مردوں میں پڑیے ہے کہ آیا تو گوتم رذمال تے اپنے ما تھے پر سے پینہ پونچھ رہا تھا! مُتنی کی تلاش میں داری رمن گستی ہوئی نیم چھٹتے پر آئی تو دیکھا۔ — مُتنی بے ہوش پڑی ہے۔ دادی نے سر پیٹتے ہوئے آواز بی بی بی۔ شیلا آئی، پھر گلوکی مال اور سب نے مل کر ایک چمچے سے مُتنی کی دنکن کھوئی۔ ہاتھ اور پیریں مل ار سیدھے ہیے۔ بڑا دڑا ہوتا مگر گوتم جب تک خصت ہو چکا تھا۔ —

یو کچی پکی جگہ، سایہ ہسیب کی باتیں ہونے لگیں لیکن بھیتی سے رب جانشی تھیں۔ یہ سب کیا ہوا؟ کیوں ہوا؟ مُتنی بوش میں آئی تو شرمدہ تھی، اپنے آپ سے شرمدہ — نہ جانے مجھے کیا ہو جاتا ہے؟ دہ بولی اور دادی کی گود میں سر رکھ کر چھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ شام تک مُتنی تھیک ہو چکی تھی اور مگر کامہ کامہ کاچ کر رہی تھی... آج شیلانے سبزی اور دال دونوں ہیں غلطی سے دوبار نمک ڈال دیا تھا۔ اب زدہ، رُمُتنی دونوں ڈور ہی تھیں۔ باپو ائے تو کیا ہو گا؟ دہ تو عامِ نمک سے بھی کم پنڈ کرتے ہیں۔ کہیں پرانے جلال میں آئے تو تھاںی کھو رئی سب باہر چٹخ دیں گے۔

رات ہاپو آئے بہت کر کے مُتنی نے کھانا پروسا اور باپو نے کھانا شروع کیا۔ شیلانے اور مُتنی دونل کی آنکھیں باپو کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ پہلا ہی گراس باپو جی کے مسخہ میں رکا۔ پھر انھوں نے یوں اندر نگل لیا جیسے روٹی نہیں، حلوا کھا رہے ہوں۔ شیلانے معدومت کرتے ہوئے کہا۔ —

“آج نمک کچھ زیادہ بھی پڑ گیا ہے، باپو جی؟”  
باپو جی نے ایسے کہا جیسے انہیں کچھ سپہا ہی نہیں۔ بوئے ”جی؟ — نہیں تو بیٹا۔

— نک تو ٹھیک ہے، باکھل ٹھیک ہے ۔۔۔ ”

دُو چار فوا لے اور مُسخہ میں ڈالتے ہوتے بولے ۔۔۔ ” قد اصل آج مجھے بھوک تی نہیں  
ہے ۔۔۔ ہما تما جی نے دُھرا پسادر سے دیا مان ”

مُسخی نے اپنی آنکھیں پُرچھیں اور دُڑ کر جمنا کے ہاں سے کھوڑی دال کے آئی اور  
باپ کے سامنے رکھی۔ باپ جب تک تھاں پر سر کا چکے تھے۔ شیلاند بستر ٹھیک کرنے  
کے لیے چلی گئی مُسخی نے کھوڑی تھاں میں رکھ کر اسے قریب کرنے ہوتے کہا ۔۔۔ ” کھانا  
پڑے گا، باپ جی ”

باپ جی کو بھوک توجی تھی۔ چکے سے فوالہ تو دکر دال میں بھگوتے اور مُسخہ میں رکھتے ہوئے  
اندر کی طرف دیکھا اور بولے ۔۔۔ ” ہبھو دیکھے گی تو ۔۔۔ ” اور پھر اندر سونے والے کمرے کی  
طرف جہاں پہنچ گئی دیکھتے ہوئے کھاتے رہے ۔۔۔ دوسرے دن گوتم کو آنا تھا ۔۔۔ رُڑکی  
دیکھنے !

مُسخی کو تو کوئی امید نہ تھی۔ بھابی نے جو اس کی دُردشائی تھی، اس کے بعد تو کوئی بھی  
مرد اس گھر میں نہ گھستا۔ پہ اُس بات کا نتیجہ اُٹان بکلا۔ بھابی کے شبدوں نے گوتم میں کام رکھا اور بھی  
تندی سے جگا دیا۔

بیٹھک میں آج باپو تھے، دیوبند بھی اور دادی بھی۔ مُسخی کو سادہ مگر خوبصورت کپڑے  
پہنکر ایک طرف بھمار کھا تھا اور اسے کڑا ہدایت تھی کہ اُس نے نہیں، ورنہ سب معاملہ چوپٹ  
ہو جائے گا۔

گوتم آیا۔ اس کی گرڈی کو بہت کلفت لگا تھا۔ شعلہ سر پر ایک نُٹ اور پر اٹھا ہوا تھا۔  
اور اپنے نائلے قند کے باوجود وہ لمبا معلوم ہو رہا تھا۔ آتے ہی اس نے مُسخی کی طرف دیکھا اور  
سمجھ گیا۔ مُسخی کی محظب نگاہیں زمین پر گردی بھئی تھیں اور وہ کانپ رہی تھی۔ اس کے ہاتھ پر  
ٹھنڈے ہو رہے تھے۔

ایک ایکی گو تم کچھ اکھڑی باتیں کرنے لگا۔ پھر اس نے مُتّی کی طرف دیکھا اور دیونیدہ سے بولا۔ ”بھیا!... تم بھی پانی پیو ہے؟“

”اُرے اُرے! پانی کبھی؟“ دیونیدہ نے کہا۔ ”کوئی شربت لا دشیلا۔“

ستیلا کی بجا سے خود حکم لیجنے کی عادی مُتّی ایک ایکی اکھڑی۔ دادی نے دھپ سے ایک ہاتھ مُتّی کے سر پر مارا۔ ”بھی رہ... تو کہاں جا رہی ہے؟“

اوہ مُتّی جو آدھی ہی اٹھی تھی۔ بیٹھ گئی۔ لیکن آدھی ہی میں وہ ساری معلوم ہو رہی تھی... اسے کچھ یاد آیا۔ پچھے بھول گیا...“

اس شام محلے مجرم کے مٹھے ہونے لگے۔ بیعتاً یار ملنے لگیں... گوتم نے مُتّی سو بھی کو پسند کر لیا تھا۔

سب کو یقین ہو گیا تھا کہ مُتّی سو بھی جا رہی ہے۔ ایک نہیں یقین آ رہا تھا تو دادی رُمن کر۔ میں تو اس دن ماںوں کی جس دن سمجھی یہ ڈپٹی بھومن کی دلہیز چھوڑے گی۔ اور ڈولی میں بیٹھتے ہوئے پوری ایک پائیلی چادر اس کی اپنے سر کے اوپر سے پھینکے گی... اور پھر جیسے شادی میں ہونے اور نہ ہونے والی باتیں دادی رُمن اپنے سامنے دیکھ رہی تھی۔ دیکھہ ہبھو، گوتم کا باپ ڈولی پر سے کھوئے پیسے بھی پھینکے تو انہیں مُہریں سمجھنا۔ پھر اس بات کا درکار جس بات سے ڈرو، آخر دہی ہوتی ہے۔

دادی نے دیوال میں سورتی کے لیے دستروں کی منبت تو مانی ہی تھی۔ بد صن شاہ کی درگاہ پر حلے کی دیگر بھی مان آئی۔ ساتھ دہ شاہد کی ماں کو بھی لے گئی تھی۔ جیسے رشت کے طور پر یقین کو اچھی طرح سے نہ جانے والا کسی بچوں نے کبھی رافت کا کر کر ساتھ لے لیتا ہے تاکہ قانون کہیں اُٹھا سی نہ پڑے۔

اب بیاہ کے سلسلے میں چاروں طرف سے مُسْنی کو ہدایتیں ہونے لگیں۔ جو جانتی تھیں وہ بھی اور جو الگ تھیں وہ بھی اپنے پنے طریقے سے مرد کو مُلیع کرنے کے طریقے بننے لگیں اور پھر دادی — جس کے مرد کو مجھے ہوئے نیچا۔ سان سال سے اُپر ہونے کا آئے تھے اور جس کے بچاروں میں مرد اس کی آنکھوں کی طرح دصند لاسا ہو کر رہ گیا تھا؟ بولی — ”دیکھ میا“ — میں تیرے نکٹ ہوں گی بھی اور نہیں بھی۔ پاں، جہاں سہاگئی کھڑی ہو سکتی ہے، دہاں بد ہوا تو نہیں ہو سکتی — یہی ہے ساری دنیا کی ریت۔ یہی شاستر پان بھی کہتے ہیں۔ ٹھیک ہی کہتے ہیں... پھر دادی ایک کھنڈی سانش بھرتی۔ آنکھیں پوچھتی ہوئی شروع کرتی — ”اوُسْن۔ جب پھرے ہوں گے نا۔ تو جھک کے چلنا۔ بہت جھک کے پین! نہیں کیا کرایا سب دھرارہ جائے گا... دیکھ لیں... اور پھر دادی رقم سر پر اپنے بیٹے جگن کی بندھی بندھائی پکڑای رکھتی اور ہاتھ میں کر پان کی جگہ کپڑے دھونے والی تھیکی اور مذہبی ہوئی اپنی طرف سے اکڑا کر چلتی۔ عورتیں نہیں، رُکیاں لوٹ پوٹ ہوئی ہوئی ایک دوسرے کے دوہنڑے مارنے لگتیں۔ مُسْنی شرماتی، روئی پروادی اسے برابر چیخے جھک کر آنے کے لیے کہتی۔

گلوکی ماں پکار آئتی — ”چھ پھرے لینا آماں... ساتواں مت بنتا...“  
گلوکی ماں کا مطلب تھا سات پھرے ہوئے تو مُسْنی کی دادی کے ساتھ شادی ہو جائے گی۔ ایسی شادی ہے وید شاستر تو بیا سوم بھگوان بھی نہیں تو ہو سکتے۔ جب مُسْنی چیخے آتی ہوئی تھوڑا کم جھکتی، دادی مرکر دھپ سے ایک ہاتھ اس کے سر پر مارتی — ”نچی اور نچی...“ مُسْنی درد سے بلبلاتی ہوئی روئی بھی اور نہستی بھی۔ ”بھاڑیں جائے ایسا دوہما“ وہ دادی کی طرف دیکھتے ہوئے کہتی ”جب وقت آئے گا تو دیکھا جائے گا“ دادی اسے پھٹکارتی — ”نصیبوں جلی، عورت نہ جھکے تو اس نہ کا چکر نہیں چلتا۔“ زویں سو گورا ہوئے — جو نیچا ہوتا ہے، آخر دہی اُو نیچا ہوتا ہے۔

اور پھر تو بے تحفے تو اور بھی نبھی ہو کر چلنا پاہیے جسے سویم سمجھو ان نے اور بھی بنایا۔۔۔۔۔۔  
مرد کا سو اگت کرنا ہی پڑتا ہے۔ وہ جا چک ہوتا ہے نا، ہمیشہ کوئی دہن مانگتا ہے جو  
دنیا ہی اچھت ہے۔ کبھی دیلوی بھی پچاری پر اپنے کو اڑبند کرتی ہے؟“  
یہ دادی کا بھی نہ مسلم تھا کہ دیکھنے میں یہ سرگش لڑکی وقت سے نے پر جھجک کے  
چلنے ایک طرف رینگنے اور بٹ جانے کو بھی تیار ہو گی۔

شیام گلی میں ایکاریکی بیسیوں ہی لڑکیاں پیدا ہو گئیں۔ وہ آج تھوڑی پیدا ہوئی  
تھیں؟ تھیں وہ یہیں۔۔۔۔۔۔ برسوں صدیوں سے۔۔۔۔۔۔ بس بیاہ کا شبد اچھارن کرنے  
کی دیر تھی کہ وہ جیسے کسی جادو، کسی جنتز کے زور سے بے اختیار بے بس، ایک دوسرا  
پر گرفتی پڑتی ہوئی کہیں سے آتیں۔ جیسے آموں کے موسم میں بڑی بڑی ہری نیلی مکھیاں  
کہیں سے اپنے آپ چلی آتی ہیں اور جب تک کوئی آم چوتا ہے، وہ اردوگرد منڈلاتی بھینہناتی  
رہتی ہیں۔۔۔۔۔۔ آتے ہی ذہ کوئی دصوہرہ ہاتھ میں لے لیتی ہیں اور ایسے ایسے نورانی کانے کا تی  
ہیں جو دادی کی آنکھوں کی طرح کی دصانی صدیوں سے ان کے گلے میں اٹھے ہوتے ہیں۔۔۔۔۔۔ نظر  
ایک جیواردار کرنے کو ملتا ہے۔۔۔۔۔۔ جیسے ہر عورت کو پین سہلوانے دبوانے سے ایک عجیب  
طرح کا سکھ ملتا ہے۔ ایک خاص قسم کا حظ آتا ہے ایسے ہی ان لڑکیوں کو بھی، جب کوئی جیجا  
یا برات میں آیا ہوا کوئی منچلا ان کے چلکی کاٹ لیتا ہے اور یا کمر میں، اس جگہ کو چھو لیتا ہے  
جہاں بھلی کے سینکڑوں ہزاروں کھروائی جمع ہوتے ہیں۔۔۔۔۔۔ باہر تو کوئی در کے مارے  
ان کی طرف انگلی اٹھانے کی پمپت کرتا ہے اور نہ یہ اٹھانے دیتی ہیں لیکن شادی بیاہ میں ان  
باتوں کی کھلی چھٹی ہوتی ہے۔ بڑے چھوٹے سب دیکھتے ہیں اور۔۔۔۔۔۔ کہا کہ خیباں موجودتے ہیں  
۔۔۔۔۔۔ جیسے کوئی تو سالیاں ملتی ہیں۔ ایک ایک سالی، آدھی گھر والی اتنی لڑکیوں کا جھر سڑ  
چھڑنے، پیار کرنے کو پھر زندگی میں کہاں ملتا ہے؟۔۔۔۔۔۔ اور یہ سالیاں اپنے روپ کی کوئی  
جھملک دکھا کر قدم قدم پر کوئی نیجیخت پیدا کرتی ہیں کہیں چھپن، کوئی لوپ ہو جاتی ہیں

جیسے یوگنیشور دل اور تپیشور دل کے من کی مینکا میں اللہ والوں کی حوریں جواہنی کے دخانی تخلی  
کی پیداوار ہوتی ہیں جس کے کارن ان آسمانی عورتوں کے بدن پر ایک بھی تو خط فلط نہیں  
لگتا ہوتا۔ اگر یوگی چلی عورت کو پسند کرتا ہے تو وہ چلی ہوتی ہیں۔ بھری پُرمی کا گردیدہ ہے تو  
وہ بھری پُرمی اور یوگنیشور را ہنی کے ساتھ آنگن، اہنی کے ساتھ پریم کھیلن کے لیے محل جاتا  
ہے اور آگے بڑھنے، اوپر جانے سے انکار کر دیتا ہے۔ یوگنیشور کو پکارتے پکارتے شبد روپی  
گورو کا گلا بیٹھ جاتا ہے اور جیوتی سر دپ، لیشور کی آنکھوں سے جوت جاتی رہتی ہے۔۔۔  
اور یہ اپرائیں یہ حوریں یوگیوں اور صوفیوں کو اپنے اپنے رتبے، اپنے اپنے مقام سے گرا  
کر اس خلوت صحیح سے ہمیشہ کے لیے غلط ہو جاتی ہیں ۔۔۔

— مگر یہ دنیا کتنی پیاری جگہ ہے۔ جہاں کے لوگ خدا نے بنائے اور بھر  
فرشتوں سے کہا۔ — ان کو سجدہ کرو ۔۔۔ سزا یوں کے چلے جانے کے بعد آخر ایک دن  
ایک رات، عظیم ”دہ“ سامنے بیٹھی ہوتی ہے۔ دیدوں کے منتر اور شاستروں کے ارتھ جس  
کی طرف کبھی واضح اور کبھی مہم سے اشارے کرتے ہیں۔ بیاد شادی کے گیت جس کے لیے  
مرعش اور بھٹوں میں جس کے لیے ایتھیں لکھتی ہیں۔ ہل میں کام کرنے والا مرد درجس کلائیے  
پلنی بڑی کی دوکان پر ہیچ کر اپنی حبیب کی آخری دنی سے آنکڑ لگاتا ہے اور سجادوں میں شدر  
جس کے لیے بڑھتا ہی جاتا ہے۔ جسے اُس کے بچوں کی ماں ہونا ہے ۔۔۔ اس لیے وہ اس صرف  
کی طرح ڈرتی، سستی ہے جس میں کسان آتا ہے — ہل کا نہ ہے پر ڈائے جس کا تیز اور  
تیکھا پھل، بھی ابھی کسی لوار نے تیز آنچ والی بھٹی میں ڈھالا ہے ۔۔۔ سر پر یگرڈی پاندھے  
لکھنی سجائے وہ راجا جنک محروم ہونے لگتا ہے جو دھرتی کو الٹائے گا نونہ جانے کے سے  
اس میں دلی ہولی کوئی ملکی مہوت جائے گی اور اس میں سے بڑے ہی صبر بڑے ہی  
اثیار، بڑے ہی پیار والی، جنک دلاری سینتا پیدا ہوگی ۔۔۔ جس سے لیے اس کا عظیم  
”دہ“ آتا ہے۔ ایک اتحہ میں مقدس کتاب، دوسرے میں شرب لیے ۔۔۔ تاریخ کے دُنیا

ادوار میں وہ ان گستاخوں سے کھیلا ہے۔ ان کے ساتھ بے شمار را سیس رچائی ہیں۔ اور اب اس کی آنکھوں میں ڈر ہے اور محبت اور رسمیت۔ وہ سمجھتا ہے اس بار کی ترقیات نے حسین و جمیل و شیرزہ کے بن پر قبضہ جائے گا۔ بار بار اپنائے گا۔ بے ہوش ہو ہو جانے گا۔ اور ہمیں جانتا وہ محض ایک تکا ہے۔ زندگی کے بھر زخاں میں۔ صرف ایک بہانہ ہے۔ تخلیق کے اس لاقتناہی عمل کو ایک بد چھڑڑہ یعنی، ایک بار حرکت میں لے آنے کا اور پھر بھول جانے کا۔ ... دنیا بھر کے گوداموں میں بھرا ہوا ناج کسی وقت ایک وانہ محض تھا جو شاید اب اس را نے کو بھی معلوم نہیں کیونکہ موت اسے لوٹ چکی ہے۔ زندگی ایک بار اس کے ہاتھوں سے چھوٹ چکی ہے۔ ... کاش انسان کو یہ معلوم ہو جائے تو وہ ایک نہجوکے کی طرح عورت کی طرف ہاتھ نہ بڑھائے۔ پھر عورت بھی خواہ اپنی عصمت نہ بچائے اس پر سونے چاندی کے دلق نہ لکائے ...

شادی کے کچھ ہی دن وہ گئے تو پتہ چلا کہ تم نے سائکلوں کی ایکسی چھوٹ دی ہے۔ اہد آسام میں ڈیکا پور سے پچاؤ ساتھ میل در سی جگل میں کوئی تھیک لے لیا ہے جہاں ہمیں ایک کے بعد کہیں حصہ پہنچتی تھی جیسے ہوا تیڈاک، ریل گاڑی سے نہیں، پیل چل کر جاتی ہو۔ ... شادی ایک غیر معین عرصہ کے لیے ملتی ہوئی۔

دادی کی تو جان ہی نکل گئی۔ اسے پیسے آنے لگے۔ — لھنڈے پیسے، جن کا باہر کی سردی سے کوئی تعلق نہ تھا۔ اس سے پہلے جب بھی گوتم کی چھٹی آتی، دادی رُمن نے مُنی سوہی کو بلا یا اور اس کا سر چوم لیا۔ بلا یا اب کے بھی لیکن چو منکل بجائے زور کا ایک دوپڑہ اس کے سر پر چڑھ دیا۔ — یہ لڑکی ہی سخوس تھی، کسی سخوس گھڑی میں پیدا ہوئی، کوئی سخوس مل بآپ کے گھر جنم لیا۔ اور اب جہاں بھی جائے گی۔ تباہی اور بربادی لا سکی۔ ... دنیا پورا در ڈیکا پور نوکیا پورے بہار، پورے بگال، آسام، دیس میں کھلبی رنج جائے گی۔ پھر گیتا کے پنے کھلے، پھر سترھوں ادھیاۓ کا پاٹھ بوا، پھر دادی سری، پھر جی اٹھی گیونکہ

پاٹھ کی سماںتی کے ساتھ ہی گوتم کی جمپھی چلی آئی تھی جس میں مکھا تھا اگلے سال منی کی نیں تبریغ کا سامان لکھا ہے ... دادی سمجھے بیٹھی تھی، گوتم نے کہیں مُتنی کو چلتے ہوئے دیکھ دیا ہے اور سرچ لیا ہے لیکن اسے کیا معلوم مُتنی بیٹھی ہوئی منی کی کثافت نے گوتم کے پورے ذہن کا کچھ یوں احاطہ کر کر کھاتھا کہ وہاں اب کسی اور لطیف سی سیچ اور سمجھ کی گنجائش ہی نہ تھی۔ اتو، تو ایک مجبوری تھا:

دادی ایک بار پھر مہینے اور دوں گنتے آگی جیسے بیوہ چھت کی کڑیاں اور زندو آسمان کے تارے گنتا ہے۔ پھر ایکاں کی انسان تو کیا وہ بھجوں، آگ، اپانی، ہوا سب کو گالیاں دیتے گئی۔ اس میں صبر تو حد درجے کا تھا لیکن شکر نام کو نہیں ... جب تک مُتنی پانچ فٹ سو اس بُخ کی ہو چکی تھی۔ اس کی کہانی اس قصے کی طرح ہو گئی تھی جس میں قutes کہنے والا پناہ زپھانے کے لیے باوشاہ کو ایسی کہانی سناتا ہے جو ختم نہیں ہو سکتی — سوراخ میں سے چڑیا آئی۔ اور دوں گئی۔ چڑیا پھر آئی اور ایک دن اور لے گئی ... اور کوٹھڑی دافوں سے بھری پرسی تھی آسمان ستاروں سے پٹا ہوا تھا۔ شہر میں کے گھر کے پاس کچندر میں ہزاروں لاکھوں کوں پلیں پھوڑ۔ بھی تھیں ... معلوم ہوتا تھا کہ بیاہ اور صرف بیاہ ہی اس طولانی عمل کو روک سکتا ہے وہ نہ کوئی ہی دن میں مُتنی کا سر آکا شہ میں ہو گا اور وہ اُرپنگی اور پرچلی جائے گی جیسے لکن کے نیچے ٹھنڈے سے بہاما یا بھلی بن کر آسمان کی طرف رپک گئی تھی —

"جب تک نہ گزوں بھی لمبا ہو چکا ہو گا" دادی کہتی۔

"کیا پتہ، سیا؟" جمنا کہتی۔ پھر دھماں بہرول کی بہر توبہ کا بائی ایک قدم آگے بڑھ کر بول دیکھتی۔ "ہو سکتا ہے ایک دو انچ چھوٹا بھی ہو گیا ہو" اور پھر وہ ایک دوسرے کو ہوئے دیتے ہوئے مُسکرا نے لگتیں۔

"ارے؟" دادی توبہ کا بائی کو پھٹکارتی "میں اتنا بھی نہیں سمجھتی، پُتی! ... ایک بار جو بڑھ جائے، پھر نہیں گھستا" اور پھر — میں بڑھی جرود ہو گئی ہوں، توبہ کا پر عقل میں

بجھے پہ بیس ہوں، بیس؟

پھر گلوکی مان حساب کر کے بتاتی۔ اگر اڑکے کا قدر اتنا بھی رہے تو دادی اور دلائکی کا چار پانچ گروہ، دو تین انگل بڑھ جائے تو وہ آپنی چھپوتا ہو گیا کہ نہیں ہو گیا ہے۔

اتنا حساب دادی کو تھاں آتا تھا؟ مُسْتَی سوہی کے دو تین انگل اور لمبی ہو جانے کے خیال ہی سے خون اس کے خشک چہرے کی نگول اور ریٹول میں درپنے لگتا۔ یہ معلوم ہوتا جیسے پیپل سے گراہوا پتہ پھر اپنے دہان پہ جانا کا ہے۔ درود سرے پتوں سے ٹکر رہا ہے شوز مچا رہا ہے۔ وہ ترمبکا کو یا گلوکی ماں کو گالیاں دیتے لگتے۔ چھپوتا ہو تیرا باپ، چھپوتا ہو تیرا بھائی، چھپوتا ہو تیرا خصم۔ اور عورتیں یہ سمجھتی ہوئی کہ دیوی دوی کی گالیوں سے گرہ ٹلتے، ہنسی کھیلتی اپنے گھر چلی جاتیں جہاں انھیں اپنے مرد کیا باپ اور کیا بھائی اور کیا شوہر، یکا بلکی چھپوئے معلوم ہونے لگتے!

مُسْتَی سوہی اب تک اپنی ہنسی اپنے ہر پورے لفڑت کرنے لگی تھی۔ داشادی بیاہ کھنام ہی سے خالق ہونے لگی۔ کیا شادی بیاہ ہی رہ گیا ہے، اس دنیا میں؟ اس کے بہوا اور کوئی راستہ نہیں؟ کہیں بھی جانا ہو دہاں پہنچنے کے لیے مبیسوں سرکمیں اسینکڑوں پکڑڈیل ہوتی ہیں۔ بیاہ کے لیے کیا ایک ہی جرئتی سرکل ہے؟ آخر تھک ہار کر مُسْتَی لیٹ جاتی۔ سو جاتی جہاں اسے خواب میں ڈولھے ہی ڈولھے دکھائی دیتے۔

ایک دن دیوبند انجیری تصویر مولاں روشن "اوکیہ آیا جس میں اداکار" جوزے فیرار اپنے پیر پیچھے بازدھ کر فرانس کا بونا مفتور لوٹک بتتا ہے۔ پہلے تو دیوبند رنے نو نو کروڑ گالیاں اپنے دلیش بھارت کو دیں جس میں اتنا زور لگا نے پر بھی صنعتی ترقی نہیں ہوتی، جہاں سائیل کے چھپے پر زے ابھی تک وہیت ست آتے ہیں۔ جہاں میک اپ کا آرٹ اتنا بھی نہیں پنپ سکا جس سے نبے قدر کا ایک آدمی ٹھکنا اور بوناگ کے اور اس بات کو وہ تھبیل ہو گیا کہ وہ پہلے ہی ٹھکنا ہے اس سے اور ٹھکنا نہیں ہو سکتا۔

اس پر بھی دیوندر نے جونے سے فیرار کی طرح اپنے پرچم کی طرف باندھے اور گھٹنوں کے بل چل کر مُسْتَنی کو دکھانے لگا۔ ”ایسے ہی پر باندھ دینا، مُسْتَنی! اتب گوتم کے ساتھ شہیک سے پھرے لے سکے گی۔“

”اگر رستی گھٹل گئی تو“ مُسْتَنی کی کہیاں گوراں پُر چھتی۔

”تو چھپ کرنا“ دیوندر اسے ڈانٹ دیتا۔ مُسْتَنی کا تو پھر بھی بیاہ ہو جائے گا، ڈھائی مُسْتَنی! — تیرا کبھی ہو گا ہی نہیں۔“

اونچھوڑے قذ کی گوراں دیوندر کو دانت دکھاتے ہوئے ”آئی آئی آئی“ کرتی اونچھر ایک طرف چھپ کر دنے لگتی اونچھر آپ ہی اپنے آپ کو منا کر مُسْتَنی کے پاس آ جاتی اونچھتی — مُسْتَنی! کہیں ایں نہیں ہو سکتا کہ تو اپنا کچھ قدیمچے دے دے اور میرا کچھ آپ لے لے۔“

”ایسا ہو جائے تو پھر — دنیا ہی نہ بس جائے“ مُسْتَنی جواب دیتی۔

— اور پھر دونوں مل کر اس اجرمی ہوئی دنیا کو پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھنے لگتیں۔

جہاں ابھی تک دیوندر اپنی ہیکڑہ میں گھٹنوں کے بل چل کر مُسْتَنی کو دکھارہا تھا اور کھٹہ ہا تھا — ”ایسے ایسے ... کسی کو پتہ بھی نہ چلے گا“، اپنے اعلیٰ طریقے سے دہ اس لمبی لٹکی کو دہی بات سمجھا رہا تھا جو آج سے صدیلیں پہلے ارسطو نے عورت کے نیچے گھوڑا بنتے ہوئے سکندر کو سمجھا نے کی کوشش کی تھی لیکن پوری طرح سے سمجھا نہ پایا تھا ... اس ادھورے کام کو دیوندر پورا کرنے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔ اسے اذیت ہو رہی تھی لیکن کرب کا کوئی بھی اثر وہ اپنے چہرے پر نہ آنے دیتا۔ خاصی دیر تک وہ چلتا رہا۔ حتیٰ کہ اس کے گھٹنے چھل گئے ... ترمبلکا اور جنما اس کی طرف دیکھ کر ایک دوسرے کو کہنیاں مار رہی تھیں اور فیس رہی تھیں اور پکار رہی تھیں — ”شیلا — اری او شیلا ...“

آخر ایک دن برات آہی گئی، پھرے سے بھی ہو ہی گئے۔

پھر دل میں مُسْتَیِ دُہری، تھری ہو کر جل رہی تھی۔ لیکن اب اس بات کا کیا حل اور نجی ہوتے ہوئے بھی دو گوتم سے لمبی لگ رہی تھی؛ ترمبکا کا خیال صحیح تھا۔ گوتم کا قد اور بھی چھوٹا ہو گیا تھا اور یا — مُسْتَیِ کا بڑا پل پل کے بعد پھرے سے لیتی ہوئی مُسْتَیِ کے کان میں کوئی کہہ دیتا — ”نجی اور نجی“... مُسْتَیِ نے دھرتی میں گھس جانے کی کوشش کی۔ لیکن دھرتی نے ساتھ نہ دیا۔ وہ آسمان کی طرف لپک سکتی تھی، دھرتی میں نہ سا سکتی۔

آشیرداد کی جگہ کئی بار دادی کے گھپ چپ رہتے مُسْتَیِ کے سر پر ڈپے، جس سے اسے کا سرول اٹھا۔ وہ تو اسے اپنی آخری مصیبت کھینتی تھی لیکن دادی کا خیال ایسا نہ تھا جو جھوٹ اس نے ادا اس کے بیٹے پر تے اور تیل محلے کے سب مرد عورتوں نے مل کر بولا تھا، آخر تو اسے کھلنا تھا۔ دادی چاہتی تھی کھلے تکھلے پر ابھی نہ کھلے... ایک بار شادی ہو جائے پھر اسے انسان تو کیا بھگوان بھی نہ تو سکیں گے۔ لیکن... آخر وہ پھر مُسْتَیِ کو اُوپنچا ہو کر چلتی ہوئی دیکھتی تو اپنے کیمی میں مکاماتے ہوئے کہتی — ”ہا نے رانڈ تو نہ بے گی“۔ پنڈت لوگ منتر پڑھتے رہے، جن کا مطلب تھا... تم چانوروں کی طرح سے ہنیں رہو گے... بے موسم کا بھرگ بلاس ہنیں کرو گے... تم بیمار اور فاتر اعقل نچے اس دُنیا میں ہنیں لاو گے... اور ارد گرد کے لوگ بیدار اور فاتر اعقل بھلہی کی طرح سے بیاہ کی رسم کو دیکھو رہتے۔ خاپیاں لیے کہ وہ شلوکوں کی دبان، سنکرت سے واقف نہ تھے؟

بیاہ ہو جانے کے بعد جب بھی گوتم انہ، ڈپٹی بھومن کی بیٹھک میں آیا، اس نے مُسْتَیِ کو بیٹھنے ہوئے پایا۔ مُسْتَیِ کو اٹھنے بیٹھنے، چلنے پھرنے کی سخت منابی بھی جس سے اس کے بدن کی ٹھیاں تک اکڑ گئیں۔ اتنی دیر بیٹھنے رہنے سے اسے یوں محسوس ہونے لگا جیسے وہ پیدا ہی

نہیں ہوئی، ابھی تک مان کی گوکھ میں پڑی ہے... اور باہر آنے والے پیر چھپیلانے کے لیے تڑپ رہی ہے...

مُوکھِم مُسٹی نے گوتھ کو اپنے داماد دُسٹی کو اپنی بیٹی جانتے ہونے اپنے گھر کھانے پر ملایا۔ سین دیوین رنے اسے مجھ بھجا کر لوٹا دیا۔ شام کے قریب گوتھ نے سینما دیکھنے کا پروگرام بن لیا۔ وہ اپنی بیوی کے ساتھ جا، کوئی سوچ اڑانا چاہتا تھا۔ لیکن دادی نے انکار کر دیا۔ دہ خود تو کچھ نہ بولی لیکن اپنے بیٹے جگن ناکھ کو اشارہ کر دیا۔ جس نے بڑے پیار کے ساتھ گوتھ سے کہا... ”بہل نہیں میٹا... ہم تیاگی ذرا اپر انے خیل کے لوگ ہیں۔ تو اسے گھر لے جانا۔ پھر جو جی چاہے کرنا؟“ اور گوتھ خاموش ہو گیا۔

اچھی سوری کو گوتھ کا باپ، گوتھ اور برات میں آئے ہوئے سب آدمی ڈیکا پور جانے کے لیے روانہ ہونے والے تھے۔ پہنچے لکھتے جانا تھا۔ اس میں ریت لختی کیونکہ بھائی ہونے کے ناط دیوینہ رہی کو مُسٹی کو ڈولی میں ڈالنا تھا... کسی کتاب میں تھا ہے کہ مرد کو شادی اس وقت کرنی چاہئی جب وہ عورت کو اپنے پھوٹ کے زور سے ایک ری ہاتھ سے اٹھا سکتا ہے۔ دیوینہ شادی شدہ آدمی تھا لیکن اس سے کنواری بہن کو اٹھا باندھ گیا۔ مُسٹی یوں اس سے پہنچی۔ مہنی ڈولی میں بابیٹھی کہ اس کے اٹھنے ہونے کا گمان ہو۔ حالانکہ وہ بیج بیج میں حلپتی جاری تھی۔ مُسٹی نے ایک ہی تھنھی چاولوں کی سر کے اوپر سے چھینکی۔ لیکن دادی جو تھی... جس نے پوری بوری خالی کر دی۔ پھر ڈولی، تھنھی، سُسرے نے ڈولی کے اوپر سے نئے پیسوں کی چھٹ کی۔ چونکہ وہ خود جا کر بینک سے دش روپے کے نئے نئے پیے لایا تھا، اس لیے وہ ڈولی پر سے گرتے ہوئے سو درج کو۔ دُسٹی میں چمک رہے تھے اور سچ مچ کی چھوٹی چھوٹی مہریں معلوم ہو رہے تھے... لگی بازار کے پچھے پیے اٹھانے ڈولی کی راہ روکنے لگے۔ دادی رہ رہی تھی اور بچوں سکبھے بھی رہی تھی۔ ”پتو، شہیدو... جانے دو، اسے قعلی

کو تو جانے دو۔ ” جیسے ڈولی اب بھی داپس سکتی تھی۔

داری کے اشارے پر دیوبندر بچوں کو مار مار کر راستے سے ہٹانے لگا۔ ایک چھوٹ اور ہمیں اور ارزتے ہونے پیسے سلمانے زمین پر گئے۔ دیوبندر کے من د بجے ابھر آیا۔ اس کا جی چاہا کہ وہ بھی پیک اور چمکتے رکھتے ہوئے پیسے انھوں کے اور ان پیروں کو جلی ہوئی مٹی اور دھواں سے سرف کر کے جیب میں ڈال دے۔ لیکن — اندر یہ اندر وہ مسکرا دیا!

شیلا حسبِ معمول جھوٹ موت کے آنسو بہاری تھی۔ اس کے آنسوؤں سے پچھے تو گوراں، گلوگی مان، جمنا اور ترمبلکا کے آنسو تھے، جو اپنے پتنے میں میں جھپڑے ہوئے یا جھپڑے جانے والے بھائیوں اور باپوں کو دیکھ رہی تھیں — پھر بہنوں کو، بھایوں کو۔ جیسے سرال کے سب رشتے جھوٹے ہوں، کیا نہیں اور کیا ساسیں اور کیا سسرے... شادی کے وقت وہ سب کیسے ایک پیک رک کر رذہن ہیں آرہے تھے...

شیلا کو اندر ایک بہت ہی تسلیم ایک بہت بڑی چھٹی کا احساس ہوا۔ جبھی اس کی نظر دادی پر پڑی جو تھڑے پر کھڑی اپنی دھنڈلی آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر ڈولی کو دوڑپی ددر، نگاہوں سے دُور، دل سے دُوز بھیجنے کی کوشش کر رہی تھی۔ دادی کو دیکھتے ہی اس کے ماتھے پر تیور آگئے۔ اور اس نے کہا — ” یہ دوسری ڈولی نہ جانے کہ آئے گی — ہے ”

دیوبندر نے دادی کی طرف دیکھا نہ جانے اس کے من میں کیا آئی کہ وہ ردڑ کر اس سے لپٹ گیا اور بولا — ” ماں! ” اور پھر وہ بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر، باکس بلک کر رونے لگا۔ دادی نے اسے چھاتی میں چھپا لیا۔ وہ گرنے بھی دالی تھی کہ دیوبندر نے دادی کو اپنے بازوؤں میں اٹھا لیا اور کسی ڈولی کی طرف نہ کر چل نکلا...

مُسْتَنی کیا گئی کہ شایام گلی اور نسلی محلے کی رونق بھی ساتھ ہی لیتی گئی۔ ہر چھوٹا بڑا پوچھتا تھا  
— مُسْتَنی کی کوئی چھٹی آئی ہے یا نہیں اور سہیشہ جواب ملتا — آئی تو نہیں، پر آجائے گی  
مہینے دو مہینے کے بعد تو وہاں چھٹی تھی ہے۔

لیکن دادی رقنس بھیرت سے ڈری ہوئی تھی — وہاں ضرور چھکڑے ہو گئے  
ہوں گے۔ ہنہ وہ اخنوں نے میری مُسْتَنی کو گھر سے نکال دیا ہو گا اور وہ کہیں جنگلوں میں خاک  
چھانتی پھر رہی ہو گی۔ ان جنگلوں میں جہاں سانپ سانپ جتنی بڑی جونکیں ہوتی ہیں۔ پر دل  
سے چمٹ جاتی ہیں اور ہوئے ہوئے یوں خون چوتی ہیں کہ انسان کو پتہ بھی نہیں چلتا۔ وہ  
یوہی جیسے تھک کر آرام کرنے کے لیے بیٹھتا ہے تو پھر نہیں اٹھتا... .

ضرور مُسْتَنی کو کوئی مشیر چلتی کھا گیا ہو گا۔ ورنہ مہینوں سے چھٹی نکھنے کا کیا مطلب

اور پھر بیچ میں ایک آدھھی آہی جاتی جسے دادی پہلے دیوبندی رے پڑھواتی۔ پھر شاہد  
میاں اور پھر شہزادگانہر سے... . تب کہیں جا کے اس کی نسلی ہوتی۔ نسلی کہاں؟ اگر مُسْتَنی لم  
خط نکھنی تو دادی کو یہ معلوم ہوتا جیسے کوئی رونے رورہی ہے الفاظ جن کا ساتھ نہیں دیتے  
اگر چھوٹی نکھنی تو کہتی — دیکھانا! میں تو پہلے ہی کہتی تھی؛ اسے کوئی صندھ نہیں لگا تھے۔

کوئی لبی بات ہے جو مُسْتَنی چھپا رہی ہے ورنہ مجھے ایسے دو اکھر لکھ کے بیچ دیتی؟ —

بھی ہے نا، اپنے دلش کی بیٹیوں کا۔ مرتنی مر جاتی ہیں۔ پرشکایت کا نفظ بھی سندھ پہ نہیں  
لاتیں... . ہے رام! اب کیا ہو گا؟ کہیں میں اڑ کر دیکھا پورچلی جاؤں۔ ایک بار میں:  
سرہی کی بنستے، بننے پوئے دیکھوں۔ تب جھوٹ کہتے ہو۔ ضرور وہاں کوئی گڑ بڑ  
پرمیری بنتی کو جس نے تنگ کیا، بعکوان، اس کا بھی بعداً نہیں کرے گا... . میں مرنا چاہتا  
تھی۔ ہاں اب اس دنیا میں رہ بھی کیا گیا ہے؟ لیکن یہ مجھے مر نے، آرام سے جانے۔

نہیں دیتی۔ ہے بھگوان! انسان دنیا میں جس کو سمجھ سمجھتا ہے، وہ کتنا بڑا دشمن ہوتا ہے...  
 اور پھر! — یہ ہو کیسے سکتا ہے، چھٹے فٹ کی رُلکی سے کوئی پائیخ فٹ کا لڑکا بیاہ  
 کرے؟ اور ہمرا سے بسا بھی لے؟ ... اب تک تو گوڑو کو پتہ بھی چل گیا ہو گا اور دادی یوں  
 بات کرتی جیسے شاید نہ بھی پتہ چلا ہو۔ وہ اپنی آنکھیں بند کر لیتی اور من ہی من میں کئی پرداختنا  
 کرتی۔ ہے بھگوان! کیا یہ نہیں ہو سکتا جب گو تو سُنی کی طرف دیکھے تو وہ اُسے چھوٹی لگے؟ ...  
 ایک دن جگن ناٹھے گھر میں آیا تو کچھ دیرے سے ... شاید دیز تک شاستر ارتھ ہوتے  
 رہے۔ گھر پہنچنے پر شیلا سوہنی تھی۔ جگن ناٹھے چپکے دبکے رسولی میں گیا تاکہ ہپو کو جگانا نہ پڑے۔  
 انہوں نے اُپر نیچے ہاتھ مارے، سر بھی چھینکے سے ٹکر اکر ہو گیا کیا لیکن کہیں کھانا ہوتا  
 تو ملتا۔ اس بات کا علم سزادی کو ہوا اور نہ دیوبند کو۔ سب یہی سمجھتے رہے کہ شیلانے  
 حسبِ عمول کھانا پکایا ہو گا اور طان میں رکھ دیا ہو گا —

طان میں پالی کا ایک گلاس پڑا تھا جو جگن ناٹھ کا ہاتھ لگنے سے گرنے لگا۔ لیکن جگن ناٹھ  
 نے سنبھال لیا اور وہ سمجھ گیا۔ اس نے گلاس اٹھایا اور ایک ہی سانس میں پینے کے بعد بولا۔  
 ”تیرا شکر ہے ماںک!“

اور پھر وہ اندھا جا کر لیٹ گیا۔ ہانی اس کے کلیجے کو لگ گیا تھا۔ اتفاق کی بات۔  
 جگن ناٹھ نے صبح سے کچھ نہ کھایا تھا۔ بھوکے پیٹ ہی وہ شاستر ارتھ کرتا رہا۔ حلا مکہ شاستر پر  
 ہی نے شریک کو ہری مند قرار دے کر اس کی رکھشا مانس کا پرم دصرم لکھا ہے ... دراصل  
 جگن ناٹھ نیاگی پرم اور اس ہو چکا تھا اور دنیا کی کوئی چیز اس کے چہرے پر مسکراہٹ نہ  
 مان سکتی تھی۔ اپنی سمجھ میں وہ بھگوان کی پرستش کر رہا تھا لیکن بھگوان تو سمجھتے تھے کہ وہ افسانے  
 کی پوچا کر رہا ہے — اپنی مر جوں بیوی کی جسے محبت اور صرف محبت نہ کی وجہ سے وہ  
 پیش کرتا تھا لیکن اس پر بھی بھگوان نے جگن ناٹھ کی حاضری مکالی۔ بھگوان جانتے تھے ناکہ  
 مکن تک پہنچنے کے لیے جس مُبّت کی پوچا کی جاتی ہے، وہ خود کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔ صرف مجھے تک

”ہمچنے کا ایکس ابھانہ تھے۔

پہٹ میں درد ہونے کے باوجود عکن ناکھ دھیان میں بیٹھ گئے، تمجھی ادمی کہ آواز آئی  
”بلیا!“

جنمن ناکھ نے ذہیرہ بی میں مُسخ آواز کی طرف کر دیا اور بولا۔ ”ہاں ماں“  
”میں نہیں آتی؟“

”ہاں ماں۔ نیند نہیں آتی۔“

”کھانا کھائیو؟“

”ہاں ماں۔ بہت کھایا...“

”کوئی چون پھلی لاد، ہوڑ جگاؤں؟“

”نہیں مل۔ میں ایسے ہی سمجھ دیں گا۔  
اور جگن ناکھ ایسے ہی سوگیا۔

سویرے بہت شور مجا۔ شیلا تو جانی تھی کہ اس نے جانتے تھے سسر جی کو کھانا بھی  
نہیں کھلایا۔ اس لیے وہ رب سے زیادہ اُپنچی آواز میں بین کر رہی تھی اور بار بار اپنے مرے  
ہوئے سُسرا کے پیروں پر سرخ رہی تھی۔ درحقیقت اس بات کا علم شیلا اُبھی نہ تھا کہ اس  
کے پتی دیوب کے پتا، نئی سی بات پر اتنے خف ہو جائیں گے۔ جھپٹی سی کھینکی کی اتنی بڑی سہنڑیں گے  
وہ ہرگز یہ نہیں چاہتی تھی کہ گھر میں آبامپا پشن کا یہی بند ہو جائے۔ پتہ نہیں کھبگوان نے کس  
کی کرنی کی سزا کس کو دی۔ اس کی رمزیں وہی جانے۔ ... شیلا جسے اس دنیا سے بھیجا چاہتی  
بنتی دہ نوجی رہی تھی۔

دادی کی وہی عنالت ہوتی جو مار کی ہو سکتی ہے۔ جب جگن ناکھ نیاگی کو لے جانے لگے  
اڑتھی اٹھائی گئی۔ تو دادی یہ کہتے ہوئے۔ بے ہوش ہو گئی۔ ”ارے! تجھے شرم نہ آئی  
جگنا۔ میں بورڈی تیر سے کامنڑھے پر سوانہ ہو کر جاتی۔ تو جوان ہو کر میرے سندھوں پر جا رہا ہے۔“

فی کا ایک آدمی جو دیکھ رہا تھا، شاہد نے بولا۔ —

”کیا فقرہ ہے... کوئی لکھ دست تو لوگ رو رکر پانگل ہو جائیں۔“

شاہد نے ایک تسلیک یہی نظر سے اس آدمی کی طرف ریجھتے ہوئے کہا۔ ”لیکھے لکھ دین، کھائی... س فقرے کو لکھنے کے لیے بیٹا دینا پڑتا ہے؟“

شیلا تو سمجھتی ہو گی، شسر تو گئے اب دادی بھی نہ بھک سکے گی۔ دادی کوں ون سکتے میں رہی۔ دیوبند رکھر سے نہ گیا۔ میں سے دکھ نے کے لیے تو شیلا کو بڑا ہیکی دیکھ رکھ کرنا ہیں پڑتی تھی۔ پہلے تو شیلا نے پاٹھ کر سے کی پروانہ کی۔ لیکن جب اس نے دادی کا لند مرد دلگھ پڑتے دیکھا تو پاٹھ بھی کیا۔ لیکن دادی پھر وہیں کی وہیں تھی۔ شاید وہ اس نے دل پر تھی تھاں گیتا کے یا لکھ بھی اثر نہیں کرتے۔

بوش میں آتے ہی جو پہلا سوال دادی نے کیا، وہ تھا۔ — ”مُنْتَیٰ کی چھپتی ہے؟“

دیوبند نے دادی کے سر پر ہاتھ پھیرتے چکارتے ہوئے کہا ”نہیں دادی آج لے گی تو کیون فکر کرتی ہے؟“

دقیقی دبی ہوا۔ پتا کے مرنے کی خبر مُنْتَیٰ سوبی کو کہیں ایک دبیرہ ہیجنے کے بعد ملی جبکہ داہشکار تو ایک طرف، بُبُول کھی گنجائیں بھائی جا چکی تھیں۔ شاید اسی لینے بھی بھاگ کر کالے کوسوں سے دنیا پور آنا اور آسام کی جونکیں لانا، بیکار کی بات تھی۔ اور جب بپ کی مت کے بعد مہینوں بعد تک بھی تھی نہ آئی تو دادی نے بذرا کتے ہونے لہا۔ — ”ارے! مُنْتَیٰ ہونو ہے...“ جیسے دہیں کسی نے مُنْتَیٰ کا گلا گھونٹ دالا۔

دادی کو دل کی انند دل نرین گھر ایوں سے اس بات کا یقین تھا کہ مُنْتَیٰ اور جو تم کی انہیں بے جوڑ شادی کی جی بھی نہ ہی نہیں سکتی۔ مُنْتَیٰ بھی لوت کے سہی کر آئی۔ روئی چلاتی اسر پسیٹی ہوئی۔ —

برسات ہو کے ہٹی بھتی۔ سورج کی گرمی کے راستے میں ایک بھی تو خاکی ذرہ حاصل نہ ہوتا تھا۔ کرنیں زمین کھود کر اس پر کھمیں نکال رہی تھیں۔ کچھار کا پیر تر سامنے مکان کے سامنے تھا۔ کرنیں کھود کر اس پر کھمیں نکال رہی تھیں۔ کچھار کا پیر تر سامنے مکان کے سامنے تھا۔ اس لیے اس پر گرمی کا کوئی اثر نہ ہوتا تھا۔ برسات کی پہلی ریزش اور آخری ریزش بھی میں تھا۔ اس لیے اس پر کچھ نہ بگاڑ سکی۔ اٹا اس نے لکھوں کے منہ بھی کھول دیے کا وہ بپیر پر لگے ہوئے لکھوں کا کچھ نہ بگاڑ سکی۔ اٹا اس نے لکھوں کے منہ بھی کھول دیے کا وہ بپیر پر لگے ہوئے لکھوں کا کچھ نہ بگاڑ سکی۔ اس کی ایک ڈال سامنے کھڑیوں کے سکان کی کھڑکی میں جاگئی پہلا کچھار ہنستا ہوا نظر آ رہا تھا۔ اس کی ایک ڈال سامنے کھڑیوں کے سکان کی کھڑکی میں جاگئی پہلا کچھار ہنستا ہوا نظر آ رہا تھا۔ اس کی بہرہ کھڑی بھتی جسے چندہری دن پہنچنے والے لکھنؤں سے بیاہ کر لائے تھے۔ لال لال کپڑے متحملی۔ کپڑے پہنچنے ہوئے وہ بیر بہوی معلوم ہو رہی تھی جو برسات اور اس کے بعد کے تراکے میں سے کہیں سے اپنے آپ نکل آتی ہے۔

شادی کی بہن، فردوس مسٹنی کی شادی پر تو نہ آ سکی تھی۔ اب آئی تو مسٹنی کے بارے میں پوچھے پوچھنے کے سب کا جینا حرام کر دیا۔ فردوس خادی رقمن کے پاس ملٹھی ہوئی ادھر ادھر کی پانیں کر رہی تھیں کہ گوراں بھاگی آئی —

”دادی... دادی“ وہ بھی مُنی آئی؟  
شیام گلی پوری کی پوری الٹ پڑی اور مُنی کو لینے کے لیے ترکے بڑھی۔ مُنی تا نگے پر سے  
اتری اور کو تم کے ساتھ دپٹی بھولن کی طرف آنے لگی۔ اب ادھر چھوٹ کی کھنچی اور اس کے ساتھ  
اس کا پتی گونم جو سچ مچ تر مبکا اور گلوکی ماں کے کہنے کے مقابل پہلے سے بھی لھگنا اور بونا معلوم  
ہو رہا تھا... وہ دونالد آر ہے تھے... ایک دسر سے کے وجود سے بے خبر، کسی بھی احسان  
ذات سے عاری۔ جبھی مُنی اپنے گھر کے پاس آپنی تو دھپ سے ایک با تھا اس کے سفر پر پڑا۔  
”بنجی، مُونی — بنجی“

اور مسٹنی نے بلپلا کر دیکھا — دادی تھڑے پر کھڑی تھی اور اس کا عضو عضو کا نہ رہا تھا۔ مسٹنی نے ایک ایک چلاتے ہوئے کہا — ”دادی کی کی کی“ اور اس سے لپٹ گئی اور بھسختے ہوئے بولی — ”باؤ کہاں جسکو دیئے دادی؟“

دادی نے جگن ناتھ کے بارے میں کچھہ منہنا۔ بولی "گوتم آیا ہے؟" جبھی گوتم نے آکر دادی کے پریوں پر سر رکھ دیا۔

دادی رقمنے مسٹھ قریب کر کے، آنکھیں سکوڑ کر دیکھا اور بولی — "جیتے رہو، جیتے رہو بیٹا، پرماتما —" اور پھر اندر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہنے لگی "داؤ... آؤ میں داری، آؤ..."

ماتم تو کچھہ ہی دیر میں ختم ہو گیا — دراصل ماتم بھی اُداس پیگیا تھا اور اب ڈپٹی بھون میں چھپتے لگ رہے تھے۔ صرف شیلاحتی جسے شسری موت کے بعد اتنی جلدی ہنسنا اچھا نہ لگتا تھا،

دادی نے دیکھا، مُنتی خوش بہت خوش ہو رہی تھی۔ گوتم اس کی ماں اس کے باپ اسے ہاتھوں سے چھاؤں کرتے تھے۔ ہاں، چھاؤں کرنے والے اہنیں یہ صری ضرور لگانا پڑتی تھی۔ دادنی کو یہ بھی سپہ چلا منڈو کو ساتواں مہینے ہے۔

گوتم جتنے دل بھی رہا۔ بہت خوش بہت نہست رہا۔ وہ دادی کے ساتھ مذاق کرتا رہا۔ نہ لمبے ہونے کی بات سامنے آئی، نہ چھوٹے ہونے کی... اور پھر وہ مُنتی بوز چُلی کے پیے — مانیکے چھوڑ کر دادی مال کے پر چھوٹنا مو اچلا گیا۔

دادی کی بیماری توٹ آئی۔ ایک دن رات کے دُو بجے تھے نسی جو آئی تو کنتی دیز نک دم ہی والپس نہ آیا۔ شیخ اور مُنتی پہ دوڑے۔ شیخ اسہ ان سبب باقول کوئے کا رسم بھتی تھی لیکن مُنتی سوپی کا بھگوان پہ نُورا، شیاس تھا۔ اس نے گوراں کی مدد سے دادی کو نیچے فرش پر آتا را اور اس کے کان نے پاس مٹھنے کر۔ بڑی شرداہ کے ساتھ صہوت گیتا کا ستر ھواں اور ھیا شے بلکہ مہاتم بھی پڑھا۔ اور اس کا پورا اپنی دادی کے نہت دیا لیکن دادی ابھی تک جی رہی تھی... اس کے چہرے سے ایک عجیب قسم کی نُر انی مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ پھر بچوں کی سی شراب پہلی آئی۔ اس نے مر گھٹے سے اندزاد میں دامیں اور

دیکھا جس طرف مُمنی میکھی بختی جو گیتا کو تپائی پر رکھتے ہوئے بڑے غور سے دادی کی سبک  
سی پر داد دیکھو رہی بختی —————

”مُمنی“ دادی نے خیافت سی آداز میں کہا۔

”باں دادی ماں“ مُمنی بولی اور دادی کے مخند نے پاس کان کر دیا۔

دادی نے کچھ کہا۔ مُمنی ایک دم شرمائی اور تیچھے سہٹ گئی۔ شیلا پاس کھڑی بختی۔

بائیں طرف گوراں —————

”کیا پُچھا دادی نے؟“ گوراں بولی۔

”کچھ نہیں، مُمنی نے کہا اور پھر اور بھی شرمائی۔ رنگ لال ہو گیا۔

گوراں نے ہند پیراٹی تو مُمنی بولی ”کہہ رہی بختی“ ”ہاشم ری منو! ... دھجھے  
سے پیار کیسے کرتا ہو کا؟“

اوہ پھر سب نے مہنگا دیکھا دادی رُتھن چیز پہنچے مُسرا رہی بختی دیسے ہی اب  
بھی مُسرا رہی ہے ...

اس کے بعد ونڈاون میں ہوا کا شتو پربل ہو گیا اور تپائی پر پڑی ہیٹی گیتا کے  
پتے اڑ نے لئے اور اڑتے اڑتے رہا آکر رُک، جسے جماں شبد سما پت لکھا ہوتا ہے!

# پہنچ دکھ دے دو

شادی کی رات بالکل ورنہ پوا جو مدن نے سوچا تھا۔

جب حکلی بھائی نے ٹھپٹلا کر مدن کو بیج دنے کرے میں دھکیل دیا تو انہوں نے منے  
شاو میں لپٹی ہوئی اندھیرے کا بھاگ بنی جا رہی تھتی۔ ماہر حکلی بھائی اور یاہاد والی بھپوچھی اور  
دسری عورتوں کی نہیں رات کے خاموش پانیوں میں مصری کی طرح دھیرے دھیرے گھل رہی  
تھتی۔ عورتیں سب یہی سمجھتی تھیں، اتنا بڑا ہو جانے پر بھی مدن کچھ نہیں جانتا۔ کیونکہ جب  
اسے بیج رات کے نیند سے جگایا گیا تو وہ ہڑ بڑا رپا تھا۔ تکہاں کہاں لیے جا رہی ہو  
مجھے؟

ان عورتوں کے اپنے دن بیت چکے تھے۔ پہلی رات کے بارے میں ان کے شریروں  
شوہر دل نے جو کچھ کہا اور مانا تھا، اس کی گوئی تک ان کے کافلوں میں باقی نہ رہی تھتی۔ وہ خود  
اس سکھی تھیں۔ دداب، یعنی ایک اور بین کو بسانے پر تسلی ہوئی تھیں۔ دصرتی کی یہ بیٹیاں  
وکوئی سمجھتی تھیں جیسے بادل کا لکڑا ہو، جس کی طرف بارش کے لیے منہ اٹھا کر دیکھنا ہے۔

پڑتا ہے۔ نہ برسے تو متیں ماننی پڑتی ہیں، چڑھادے پڑتے ہیں، جاؤ و ٹوٹے کرنے پڑتے ہیں۔ حالاں کہ مدن کا لکا جی کی اس نمی آبادی میں گھر کے سامنے کھلی جگہ پر پڑا اسی وقت کا مستظر تھا۔ پھر شامست احوال پڑ دی سبیل کی بحیثیں اس کی کھات بی کے پاس بند گئی تھی جو بار بار بھنکار تی ہوئی ملنگوں کو سونگھے لیتی اور وہ ہاتھ، اٹھا اٹھا کر اسے دور رکھنے کی لکوشش کرتا۔ ایسے میں بھلا نیند کا سوال ہی کہاں تھا؟

سمندر کی لمبیں اور عورتوں کے خون بکھدا استہ بلانے والا چاند، ایک کھڑکی کے راستے انسان بھلا اپنا تھا اور وہ بیکھر رہا تھا، دروازے سے کے، س طرف کھڑا مدن انگلا قدم کہاں رکھتا ہے؟ مدن کے اپنے اندر ایک گھن گرج سی ہو رہی تھی، دراۓ اسے اپنا آپ لیاں معلوم ہو رہا تھا جیسے بھلی ٹھکانہ بھیجا ہے، جسے کان لگانے سے اسے اندر لگی سنتا ہے۔ سنا ہٹ سنا ہٹ دے جائے گی۔ پچھے دیر یونہی کھڑک سر بھٹکنے کے بعد اُس نے آجے بیڑھکھ ملپنگ کو کھینچ کر چاہئی میں کر دیا تاکہ دلپن کا چیزوں تو دیکھے سکے۔ پھر دھمکھ لی۔ جھیجھی، اس نے سوچا۔ اندہ دیری یوں ہے، کوئی پرانی عورت تو ہنیں جسے نہ چھوٹے کا سیچ بچپن ہی سے پڑھتا ہیا ہوں۔ شالیں پیٹی ہوئی دلپن کو دیکھتے ہوئے اُس نے فرض کر لیا ملی یہاں اندہ کا صفحہ چوگا، اور جب ہاتھ بردا کر اس نے، اس پڑی کھڑی کو چھوڑا تو دیہیں اندہ کا صفحہ تھا۔ مدن نے سوچا تھا وہ آسلی سے مجھے اپنا آپ نہ دیکھنے دے گی، لیکن اندہ نے ایسا کچھ نہ کیا۔ جیسے پچھلے کئی سالوں سے دہ بھی اسی لمحے کی منتظر ہو۔ اور کسی خبیلی بھیں کے سوچنے رہنے سے اُسے بھی میند نہ آرپی ہو۔ غائب نیند، اور بندہ ملکھوں کا کرب اندھیرے کے باوجود سامنے پھر پھر آتا ہوا نظر آرہا تھا۔ مھڈڑی تجھ پہنچے ہوئے عام طور پر چہرہ لمبڑہ ہو جلتا ہے۔ لیکن یہاں تو سبھی گول تھا۔ شاید اسی نیت پہاندنی کی طرف گال اور ہونٹوں گئی زیج ایک سایہ دار مکروہ سی بنی ہوئی تھی، جیسی دوسرا بزرگ اور شداب ٹیلوں کے زیج ہوتی ہے۔ ما تھا کچھ تناگ تھا لیکن اس پر سے ایکا ایک اٹھنے والے گھنگریاے بال۔

جبھی انہوں نے اپنا چہرہ چھڑایا جیسے وہ دیکھنے کی اجازت تو دیتی ہو لیکن اتنی دیر کے لیے ہنسی۔ آخر شرم کی بھی تو کوئی حد ہوتی ہے مدن نے خلاف سخت ہاتھوں سے یہاں ہی سی ہوں ہاں کرتے ہوئے دہن کا چہرہ پھر سے اُپر کو اٹھالیا اور شرما بی کی سی آوازیں کہا۔

”اندو!“

اندو کچھ ڈسی کھی۔ زخمی میں ہمی با رکسی اجنبی نے اس کا نہم اس انہوں نے پکارا۔

لتحا اور وہ اجنبی کسی خدائی حق سے رات کے اندر صیرے میں آبستہ آپستہ اس الکلی بے بیار دھو گوار عورت کا اپنا ہوتا جا رہا تھا۔ انہوں نے ہمی با را یک نظر دی پر دیکھتے ہوئے پھر انکھیں بند کر لیں اور اتنا سا کہا۔— ”جی“... اسے خود اپنی آواز کسی پاتال سے آتی ہوئی سنائی ذہی۔

دیر تک پکھوا لیسا، ہی ہوتا رہا اور چھر ہر لے ہوئے بات چل مٹلی۔ اب جو چلی سوئیں۔

وہ نہیں بھی میں نہ آتی تھی۔ انہوں کے پتا، انہوں کی ماں، انہوں کے بھائی، مدن کے بھائی بہن، باپ، ان کی ریلوے میل سر دس کی نوگری ان کے مراجح پکڑ دل کی پسند، کھانے کی عادت بھی کچھ کا جائزہ لیا جانے لگا۔ یعنی میں مدن بات چیت کو توڑ کر کچھ اور بھی کرنا چاہیا ہے۔

لیکن انہوں طرح وے جاتی تھی۔ انہوں مجبری اور لاچاری میں مدن نے اپنی ماں کا ذکر چھپ دیا جو، اسے رہائش سل کی عمر میں چھوڑ کر وزن کے عارضے سے چلتی تھی۔

”جنتی دیز نہ دہ، ہی سچ ری“ مدن نے کہا۔ بال بھی کے ہاتھ میں دوائی کی شیشیاں ہی تھیں۔

ہم اسپاٹ کی سڑھیوں پر، اور چھوٹا پاشی گھر میں چوٹھیوں کے بل پر سوتے رہتے اور آخر ایک دن۔۔۔

”دھر مارج کی شہ اہم...“ در مدن چیپ ہو گیا۔ چند ہی لمحوں میں دہروں سے ذرا ادھرا دھنگھی سے ذرا ادھر ہیجھ گیا۔ انہوں نے بھر کر ہلن کا سرماق جھپاتی سے لگایا۔ اس رونتے نے ہمیں بعد میں انہوں کو بھی اپنے پن سے ادھرا دھنگھی کے بارے میں کچھ اور بھی جاننا چاہتا تھا لیکن انہوں نے اس کے ہاتھ مکر لیے اور کہا۔۔۔ میں تو ہمیں جی لکھی ہنہیں ہوں جی۔ پر میں نے ماں

باپ دیکھئے ہیں، نبھائی اور بھا سیاں و مکھی ہیں، بسیوں اور لوگ دیکھئے ہیں۔ اس لیے میں کسی محنتی بوجھتی ہوں ۰۰۰ جس اسب تجھاری ہوں۔ اپنے بد لے میں تم سے ایک سماں ہیچ پڑھانٹھ ہوں۔"

روستے وقت تھا: اور اس کے بعد بھی ایک لشہ ساھتا مدن نے کچھ بے صبری در کچھ در پادلی کر کے ملے جعلے شبد والی میں آئی۔

"کیا ماں گتی ہو؟ تم جو بھی تہو گی میں دوں گا؟"  
"کی بات؟" اند ولی۔

مدراں نے کچھ انداز لے ہو کر کہا۔ "ہاں ہاں کہا جو پکی بات؟"

لیکن اس بیج میں مدن کے میں ایک دسمہ آیا۔ میرا کارہ پاہ پہلے ہی مندا ہے اگر اند ولی ایسی چیز مانگ لے جو میری پہنچ سی سے باہر ہو تو پھر کیا ہو گا؟ لیکن اند ول نے مدن کے سخت اور پھیلے ہونے ہاتھوں تو اپنے ملکم ہاتھوں میں سمیٹنے اور ان پر اپنے گال رکھتے ہوئے کہا۔

"تم اپنے دکھ مجھے دے دو"

مدن سخت جیرا ہوا۔ سانکھ ہی آسے اپنے آپ پر سے ایک بوجھ بھی اترنا ہوا محسوس ہوا۔ اس نے پھر چاندنی میں ایک پر اند ول کا چہرہ دیکھنے کی کوشش کی لیکن وہ کچھ نہ جان پایا۔ اس نے سوچا۔ یہ ماں یا کسی ہیلی کوارٹا ہوا فقرہ ہو گا جو اند ول نے کہہ دیا۔ جبھی ایک جلتا ہوا آنسو مدن کے ہاتھ کی لپٹت پر گرا۔ اس نے اند ول کو اپنے سانکھ لپٹتے ہوئے کہا۔ "دیسے" لیکن ان سب باتوں نے ان سے اس کی ہمہیت چھین لی تھی۔

ہمہان ایک ایک کر کے سب خصوت ہوئے۔ چکلی بھابی دو بچوں کو انگلیوں

تے لگائے پیر میوں کی اونچی بیجے تیرا پیٹ سنبھالتی ہوئی چلی دی۔ دریا بادوالی پہنچی جو اپنے نوکھے ہار کے گم ہو جانے پر شور مچاتی، واولیا کرتی ہوئی بے ہوش بکھی تھی اور جو غسل خانے میں پڑا مل گیا تھا، چیزیں ساپنے حصے کے قین کپڑے لے کر چلی گئی۔ پھر چاچا گئے جن کو ان کے بھے پلی ہونے کی خبر تار کے ذریعے سے مل گئی تھی جو شاید بد حواسی میں مدن کی بجائے دلہن کا منہ پومنے چلے تھے ...

گھر میں بڑھا باپ رہ گیا تھا اور چھوٹے بہن بھائی۔ جھوٹی دلاری تو مرفقت بھائی کی لغبل ہی میں گھسی رہتی۔ گلی محلے کی کون سی خورست دلہن کو دیکھے یا نہ دیکھے دیکھتی دیر دیکھے، یہ سب اس کے اختیار میں تھا۔ آخر یہ سب ختم ہوا اور آندو آئنہ ہستہ پر انی ہوئے گلی لیکن کالکاجی کی اس نئی آبادی کے لوگ آج بھی آتے جلتے مدن کے سامنے رُک جاتے اور کسی بھی بہانے سے اندر چلے آتے۔ آندوانہیں دیکھتے ہی ایک دم گھونگھٹ کھینچ لیتی۔ لیکن اس چھوٹے وقفے میں، نہیں جو کچھ دلکھی دے جانا و دینا گھونگھٹ کے دکھائی ہی نہ دے سکتا تھا

مدن کا کارڈ بار گندے بروزے کا تھا۔ کہیں بڑی سپلائی دے سے دو تین جنگلوں میں پیڑ اور دیلوار کے پیڑوں کو جگل کی آگ نے آ لیا تھا اور دہ دھڑ دھڑ جلتے ہوئے خاک ریاہ ہو کر رہ گئے تھے۔ میسور اور آسام کی طرف سے منگوایا ہوا بروزہ مہنگا پڑتا تھا اور لوگ اسے مہنگے دار مرن خریدنے پر تیار رہتے۔ ایک تو آمدی کم ہو گئی تھی۔ اس پرہان جلد تی دکان اور اس کے سامنہ والا دفتر بند کر کے گھر چلا آتا۔ — گھر ہیچ کراس کی ساری کوشش ہی ہوتی کہ سب کھائیں پیپیں اور اپنے اپنے بستروں میں دیکھ جائیں تھیں دو ہفتے وقت خود تھانیاں اٹھا کر باپ اور بیوں کے سامنے رکھتا اور ان کے کھا چکنے کے بعد جھوٹے بڑتوں کو سمیٹ کر نل کے نیچے رکھ دیتا۔ سب سمجھتے ہو۔ — بھائی نے مدن کے کان میں کچھ پھونکا پے اور آج دہ گھر کے کام

کلچ میں دھپی لیئے گئے ہے۔ ملن سب سے بڑا تھا۔ کنڈ اس سے چھوٹا اور پاشی سب سے بھوٹا۔ جب کنڈ بھابی کے سواگت میں سب کے ایک ساتھ بیٹھ کر کھانے پر اصرار کرتا تو باپ و صنی رام دہی ٹرانٹ دیتا۔ — ”کھاؤ تم“ — وہ کہتے۔ وہ بھی کھائیں گے، اور پھر رسول میں ادھر ادھر دیکھنے لگتا۔ وہ جب بہو کھانے پیئے سے فارغ ہو جاتی اور برتنوں کی طرف متوجہ ہوتی تو بالوں صنی رام اسے روکتے ہوئے کہتے۔ وہ رہنے والوں پر بننے صبح ہو جائیں گے۔ اندو کبھی۔ نہیں۔ باجوہی میں ابھی کیسے دیتی ہیں، جھپپکے سے؟۔ تسبیب بالوں صنی رام ایک ملزتی ہوئی آواز میں کہتے۔ — ”ملن کی ماں ہوتی بہو، تو یہ سب تمہیں کرنے دیتی؟“ ... اور انہوں ایک دم اپنے ہاتھ رونک لیتی۔

چھوٹا پاشی بھابی سے خریدتا تھا۔ اس خیال سے کہ ڈین کی گودھجٹ سے ہری ہو، چکلی بھانی اور دریا باد دالی چھوپی نے ایک رسم میں پاشی ہی کو انہوں کی گود میں ڈالا تھا۔ جب سے انہوں سے نہ صرف ویور بلکہ اپنا بچپہ سمجھنے لگی تھی۔ جب بھی وہ پیار سے پاشی کو اپنے پازوؤں میں لیںکر کو شرش کرتی تو وہ کھراً اٹھتا اور اپنا آپ چھڑا کر دو ہاتھ کی دوری پر کھرا ہو جاتا، دیکھتا اور نہستا، پاس آتا نہ دُور ہوتا۔ ایک عجیباتفاق سے، ایسے میں باجوہی ہمیشہ وہیں موجود ہوتے اور پاشی کو ڈانتھتے ہوئے کہتے۔ اسے جانا۔ — بھابی پیار کرتی ہے، ابھی سے مرد ہو گیا ہے تو؟ ... اور دلاری تو پیچھا ہی نہ چھوڑتی۔ اس کے ”میں تو بھابی کے ساتھ ہی سوؤں گی“ کے اصرار نے باجوہی کے اندر کوئی جنادری جگا دیا تھا۔ ایک رات اسی بات پر دلاری کو زدستے چھپت پڑی اور وہ گھر کی آدھی کچی آدھی پکی نالی میں جا گئی۔ انہوں نے لپکتے ہوئے پکڑا تو سر پر سے دو پہاڑ گیا بالوں کے پھول اور چڑیاں، مانگ کا سیندھر، کانوں کے کرن پھول سب نگئے ہو گئے۔ ”باجوہی؟“ انہوں نے سانس کھینچتے ہوئے کہا۔ — ایک ساتھ دلاری کو پکڑنے اور سر پر دو پہاڑ میں انہوں کے پیئے چھوٹ گئے۔ اس بے ماں کی بچی کو چھاتی کے ساتھ

نگاہے پڑنے اندو نے اسے ایک بیٹر میں ملا دیا جہاں سر رہا تھے تھی سر پلانے کی سمجھیے ہی تھی  
تھے۔ نہ کہیں بلکہ اپنی تھی۔ کاٹ کے پاؤں۔ چوت تو ایک طوف، کہیں کوئی چھبھنے والی چیز  
بھی نہ تھی۔ پھر انہوں کی انگلیاں دولا رہی کے پھر اسے ایسے سر پر چلتی ہوئی اُسے دُکھا بھی ہی  
تھیں، اور مزا بھی دے رہی تھیں۔ دولا رہی کے گالوں پر بڑے بڑے اور پیارے سے  
گردھے پڑتے تھے۔ اندو نے ان گردھوں کا جائز دلیتے ہوئے کہا۔ ”لیتے رہی تھی!  
تیری ساس مرے۔ کیسے گردھے پڑ رہے ہیں تیرے گالوں پر۔۔۔“ اپنی نے تھی، ہی کی  
طرح کہا۔ گردھے تمہارے بھی تو پڑتے ہیں بھابی!“

”ہاں مُنڈا!“ اندو نے کہا اور ایک لٹھنڈا صافس لیا۔  
مَن کو کسی بات پر غصہ نہ تھا۔ وہ پاس پری کھڑا سب کچھ سن دے رہا تھا۔ بولا۔۔۔ میں  
تو کہتا ہوں ایک طرح سے اچھا ہی ہے۔“

”کیوں، اچھا کیوں ہے؟“ اندو نے پوچھا۔

”ہاں۔ نہ اُنگے بائس نہ بجے بافسری... ساس نہ ہو تو کوئی حججگارا ہی نہیں رہتا۔“

اندو نے ایکاں کی خفا ہوتے ہوئے کہا۔۔۔ ”تم جاؤ جی سور ہو جا کے، بڑے  
آئے ہو... ہو جیتا ہے تو لڑتا ہے تا؟“ مرگھٹ کی چپ چاپ سے حججگڑے بھلے۔  
جاڈنا، رسوئی میں تمہارا کیا کام؟“

من کھسیانا ہو کر گیا۔ ہالو دھنی رام کی ڈانٹ سے باقی بچے تو پہلے ہی سے  
اپنے اپنے بستروں میں گیوں جا پڑے تھے جیسے ڈاک گھر میں چھسیاں سارٹ ہوتی ہیں لیکن  
من وہیں کھڑا رہا۔ احتیاج نے اسے ڈھیٹ اور بے شرم بنادیا تھا۔ لیکن اس وقت  
جب اندو نے بھی اسے ڈانٹ دیا تو وہ رو بانسا ہو کر اندر چلا گیا۔

دیر تک من بستر میں پڑا کسما تارہا۔ لیکن باجو جی کے خیال سے اندو کو آواز دینے کی  
ہمت نہ پڑتی تھی۔ اس کی بے صبری کی حد ہو گئی چب مُنڈی کو سلانے کے لیے انہوں کی لوری

مُسَانِیٰ دی۔ تو آندہ بارانی، بورائی مستانی، ...

— دبی لوری جو دلاری مُسَانِیٰ کو سلام رہی تھی۔ مدن کی فینڈ بھکاری تھی۔ اپنے نپتے بیزار ہو کر اس نے زور سے چادر کھینچنے سے سفید چادر کے سر پر لینے اور سانس کے بند کرنے سے خواہ مخواہ ایک مردے کا تصور پیدا ہو گیا۔ مدن کو ٹیک لگا جیسے ددم چکا ہے اور اس کی دلہن انہوں داں کے پاس میجھی زور زور سے تھے۔ بیٹھ رہی ہے، دیوار کے ساتھ کلامیاں مار کر چڑھاں توڑ رہی ہے، اور پھر گرفتار ہوئی۔ اردنی چلاقی رسونی میں جاتی ہے اور چوڑھے کی راکھ سر پر ڈال لیتی ہے، پھر باہر لپک جاتی ہے اور بانہیں اٹھا اٹھا کر گھنی محتکے کے لگوں سے فریاد کرتی ہے۔ — ”لوگو! میں لٹٹ گئی۔“ اب اُسے دوپٹے کی پرواہیں قیص کی پروانیں، مانگ کا سین درہ بالوں کے پھول اور چڑھاں سب نشکے ہو چکے ہیں، جذبات اور خیالات کے طوطے تک اڑ چکے ہیں۔

مدن کی آنکھوں سے بے نحاشا آنسو بپہر ہے تھے۔ حالانکہ رسونی میں انہوں نہیں رہی تھی۔ پہل بھر میں اپنے سہاگ کے اجر نے اور پھر بس جانے سے بے خبر۔ مدن جب خفائن کی دنیا میں آیا تو آنسو پوچھتے ہوئے اپنے اس رو نے پر بننے لگا۔ ... ادھر انہوں نہیں تو رہی تھی لیکن اس کی ہنسی دبی دبی تھی۔ باوجی کے خیال سے وہ کبھی اُوچھی آواز میں نہ پستی تھی، جیسے کھکھلا ہٹ کوئی نشگاپن ہے، خاموشی دوپٹہ اور دبی دبی میں ایک ایک گھونگھٹ۔ پھر مدن نے اندر کا ایک خیالی بُت بنایا اور اس سے بیسیوں باتیں کر ڈالیں۔ یوں اُس سے پیار کی جیسے ابھی تک نہ کیا تھا۔ ... وہ پھر اپنی دنیا میں ٹوٹا جس میں ساتھ کا بستر خالی تھا۔ اُس نے ہو لے سے آواز دی ”آندو“... اور پھر چُپ ہو گیا۔ اس اُصیڑوں میں وہ بورائی مستانی نندیا اُس سے بھی لپٹ گئی۔ ایک اونگھہ سی آئی لیکن ساتھ ہی یوں لگا جیسے شادی کی رات دالی پڑ دسی سبطے کی بھیں مشکل کے پاس پہنکارنے لگی ہے۔ وہ ایک بے کلی کے عالم میں اٹھا، پھر رسونی کی طرف دیکھتے، سر کو کھجاتے دُتیں جمایاں لے کر لیٹ گیا۔

سو گیا۔

مُن جیسے کانوں کو کوئی سند بیسہ دے کر سویا تھا۔ جب اندوں کی چوریاں بستر کی سلوٹیں درست کرنے کے لیے کھنک اٹھیں تو وہ بھی ہڑبردا کر رائٹھ پیٹھا۔ یوں ایک دم جا گئے میں محبت کا جذبہ اور بھی تیز ہو گیا تھا۔ پیار کی کروں کو توڑے بغیر آدمی سو جائے۔ اور ایکاںکی اٹھے تو محبت دم توڑ دیتی ہے۔ مدن کا سارا بدن اندر کی آگ سے پھنک رہا تھا اور یہی اس کے غصتے کا کامن بن گیا جب اس نے کچھ بوکھلائے ہوئے ہوئے انداز میں کہا۔

”سو، تم — آگئیں؟“  
”ہاں!“

”منی — سو مر گئی؟“

اندوں جیکی جیکی ایک دم سیدھی کھڑی ہو گئی۔ ”ہائے رام!“ اُس نے تاک پر انگلی رکھتے، ہاتھ ملتے ہوئے کہا۔ ”کیا کہہ رہے ہو؟ ... مرے کیوں بے چاری؟ ... ماں باپ کی ایک بیٹی؟“

”ہاں!“ مدن نے کہا۔ ”بھاولی کی ایک ہی نند۔“ اور پھر ایک دم تکما نہ اچھا افظیر کرتے ہوئے بولا۔ ”دیادہ مُنھ مت لگاؤ اس چڑیل کو!“  
”کیوں، اس میں کیا پاپ ہے؟“

”یہی پاپ ہے“ مدن نے اور چڑتے ہوئے کہا۔ ”یہیں ہو گئی جھپورتی تھیا۔ جب دمکھو جونک کی طرح چیٹی ہوئی ہے، دفان ہی ہیں بوتی۔“

”ہا۔“ اندو نے مدن کی چارپائی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ ”بہنوں اور بیٹیوں کو نہیں تو دھتکارنا ہیں چاہیے۔ بے چاری دن دن کی بہان۔ آج ہمیں تو کل، مل نہیں تو پرسوں ایک دن پل بھی دے سے گی۔“ اس کے بعد اندو کچھ کہنے پاہستی تھی میں وہ چُپ

ہو گئی۔ اس کی آنکھوں کے سامنے اپنی ماں، باپ، بھائی بہن، چھپا، تایا بھی گھوم کئے۔ کبھی وہ بھی ان کی دلاری ستی جو ملک چھپکتے ہی نیاری ہو گئی اور پھر دن رات اس کے نکالے جانے کی باتیں ہونے لگیں، جیسے گھر میں کوئی بڑی سی بابی ہے جس میں کوئی ناگن رہتی ہے۔ اور جب تک وہ پکڑ کر چنکوائی نہیں جاتی گھر کے لوگ آرام کی بنند سو نہیں سکتے۔ وہ دُور سے کیلئے والے ناخن کرنے والے دانت پھوڑنے والے ماندہی بلوائے گئے۔ بڑے بڑے دھنونتی اور موتوی ساگر۔۔۔ سخراً بدن اُتر پچھم کی طرف سے لال آندھی آئی جو صاف موئی تو ایک لاری گھر بھی ناخن جس میں گوٹے کناری میں لپٹی ہوئی ایک دلہن بلیخی تھی۔ پیچھے گھر میں ایک شرپ بجتی ہوئی شہنائی بین کی آواز معلوم ہو رہی تھی۔ پھر ایک دھنچکے کے ساتھ لاری چل دی۔۔۔

مدن نے کچھ برادر ختنگی کے عالم میں کہا۔۔۔ ”تم عورتیں بڑی چالاک ہوتی ہوں۔۔۔ بھی گل ہی اس گھر میں آئی ہو اور یہاں کے سب لوگ تمہیں ہم سے زیادہ پیارے کئے لگے؟“

”ہاں!“ اندو نے اثبات سے کہا۔

”یہ سب جھوٹ ہے۔۔۔ یہ ہو ہی نہیں سکتا۔“

”تمہارا مطلب ہے میں۔۔۔“

”دکھادا ہے یہ سب۔۔۔ ہاں!“

”اچھا جی؟“ اندو نے آنکھوں میں آنسو لاتے ہوئے کہا۔۔۔ یہ سب دکھادا ہے میرا؟“ اور اندو اٹھ کر اپنے لبتر پر چلی گئی اور سر ہانے میں مُخہ چھپا کر سسکیاں بھرنے لگی۔ مدн اُسے منے ہی والا تھا کہ اندو خود پری اٹھ کر مدن کے پاس آگئی اور سختی سے اس کا ہاتھ پکڑتے ہوئے بولی۔۔۔ ”تم جو ہر وقت جی کٹی کہتے رہتے ہو۔۔۔ ہوا کیا ہے تمہیں؟“۔۔۔

شہر ان رعب و اب کے لیے مدن کے ہاتھ بہانہ آگیا۔ ”جادو جاؤ— سو جاؤ  
جا کے“ مدن نے کہا۔ ”مجھے تم سے کچھ نہیں لینا۔“

”نہیں کچھ نہیں لینا، مجھے تو لینا ہے۔“ اندو بولی۔ ”زندگی بھر لینا ہے“ اور وہ چھینا جب پڑی کرنے لگی۔ مدن اسے دھنکارتا تھا اور وہ اسے لپٹ لپٹ جاتی تھی۔ وہ اس بھلی کی طرح تھی جو بہاؤ میں بہہ جانے کی بجائے انسان کے تیز دھارے کو کاٹتی ہوتی اور ہی اور پہنچنا چاہتی ہے۔ چھکیاں لیتی، ہاتھ پکڑتی، روٹی نہستی وہ کہہ رہی تھی۔

”پھر مجھے، پھاپھا کئٹی کہو گے؟“

”وہ تو سبھی عورتیں ہوتی ہیں۔“

”شہر— تھاری تو—“ یوں معلوم ہوا جیسے اندو کوئی گالی دینے دالی ہو۔ اور اس نے سُنھ میں کچھ منمنایا بھی۔ مدن نے مُڑتے ہوئے کہا۔ ”کیا کہا؟“ اور اندو نے اب کے سناٹی دینے والی آواز میں دھرا دی۔ مدن کھل کھلا کر ہنس پڑا۔ اُنکے ہی لمحے اندو مدن کے بازوؤں میں تھی اور کہہ رہی تھی۔

”تم مردوگ کیا جانو؟— جس سے پہاڑ ہوتا ہے اس کے سبھی چھوٹے بڑے پیارے معلوم ہوتے ہیں۔ کیا باپ، کیا بھائی اور کیا بہن۔“ اور پھر ایکابھی دُور دیکھتی ہوئی بولی۔

”میں تو دلداری مُتنی کا بیاد کروں گی۔“

”حدہ ہو گئی؟“ مدن نے کہا۔ ابھی ایک ہاتھ کی ہوئی نہیں اور بیاہ کی بھی سوچنے لگیں؟“  
”نہیں ایک ہاتھ کی دکستی ہے نا؟“ اندو بولی اور پھر اپنے دونوں ہاتھ مدن کی آنکھوں پر رکھتی ہوئی کہنے لگی۔ ”ذرا آنکھیں بند کر دا اور پھر کھلو۔“ مدن نے سچھ جھ جھ ہی آنکھیں بند کر لیں اور پھر جب کچھ دیر تک نہ کھولیں تو اندو بولی۔ ”اب کھلو بھی، اتنی دیر میں تو میں بُڑھی ہو جاؤں گی۔“ جسمی مدن نے آنکھیں کھولیں۔ لمحہ بھر کے لیے اُسے

یوں لگا جیسے سامنے اندو ہنیں، کوئی اور بیٹھی ہے۔ وہ کھوسا گیا۔

میں نے تو ابھی سے چار سوٹ اور کچھ برتن الگ کر دا لے ہیں اس کے لیے؟  
اندو نے کہا اور جب مدن نے کوئی جواب نہ دیا تو اسے جھینجھوڑتے ہوئے یوں۔  
تم کیوں پر لیٹاں ہوتے ہو؟ ... یاد ہنیں اپنا دھن؟ — تم اپنے دکھ مجھے  
رسے چکے ہو؟

"ایں؟" مدن نے چونکتے ہوئے کہا اور جیسے بے فکر سا ہو گیا لیکن اب کے  
جب اس نے اندو کو اپنے ساتھ لٹپایا تو وہ ایک جسم ہی ہنیں رہ گیا تھا، ساتھ ساتھ  
ایک روح بھی شامل ہو گئی تھی۔

مدن کے لیے اندو روح ہی روح تھی۔ اندو کے جسم بھی تھا لیکن وہ ہمیشہ کسی  
نہ کسی وجہ سے مدن کی نظر دل سے او محبل ہی رہا۔ ایک پر دو تھا۔ خواب کے تاروں  
سے بننا ہوا، آہوں کے دھوٹیں سے زنگیں، تہقیتوں کی لدتاری سے چکا پونڈ جو پر وقت  
اندو کو ڈھلنے پے رہتا تھا۔ مدن کی نگاہیں اور اس کے ہاتھوں کے دوستاں صدیوں سے  
اس درد پدی کا چیرہ ہرن کرتے آئے تھے جو کہ عرف عام میں بیوی کہلاتی ہے لیکن ہمیشہ  
اس سے آسمانوں سے تھانوں کے تھان، گزنوں کے گز کپڑا نگاپن ڈھلنے کے لیے ملا آیا  
تھا۔ دو شماں تھاں بار کے بہاں وہاں گرے پڑے تھے لیکن درد پدی وہیں کھڑی تھی۔  
عزمت اور پاکینگی کی سفی یساری میں ملبوس وہ دبیوی لگ رہی تھی اور —

.... مدن کے دوستے ہوئے ہاتھ خجالت کے پیسے سے ترہتے جنہیں سکھانے  
کے لیے دو انھیں اُپر ہوا میں انھا دیتا اور پھر ہاتھ کے پنجوں کو پورے طور پر چھیلانا

ہوا ایک تشنی کیسٹ میں اپنی آنکھوں کی کھلیتی پھٹتی ہوئی تپلیوں کے سامنے رکھ دیتا۔ اور پھر انگلیوں کے نیچے میں سے جھانکتا۔ — انہوں کا مرمری جسم، خوش رنگ اور گداز سامنے پڑا ہوتا۔ استعمال کے لیے پاس، ابتداء کے لیے دور... کبھی انہوں کی ناکہ بندی ہو جاتی تو اس قسم فقرے ہوتے —

”ہائے جی! گھر میں چھوٹے بڑے سمجھی ہیں، وہ کہا کہیں گے؟“  
مدن کہتا۔ — ”چھوٹے سمجھتے ہیں۔ بڑے سمجھ جاتے ہیں —“

اسی دوران میں بال بودھی رام کی تبدیلی سہار پور ہو گئی۔ دہاں وہ ریلوے میل سروس میں سلیکشن گریڈ کے ہیڈ کلک ہوتے ہیں۔ اتنا بڑا کوارٹر ملا کہ اس میں آٹھ کنبے رہ سکتے تھے لیکن بال بودھی رام اس میں اکیلے ہی ٹانگیں کھپیلا ٹھے پڑے رہتے۔ زندگی بھروسہ بال بچوں سے کبھی علیحدہ ہیں ہوئے تھے۔ سخت گھر بیوی تسم کے آدمی، آخری زندگی میں اتنی ہائی نے ان کے دل میں دھشت پیدا کر دی لیکن مجبوری تھی۔ نچے سب ولی ہیں مدنا اور انہوں کے پاس تھے اور وہیں اسکولوں میں پڑھنے تھے۔ سال کے خلتے سے پہلے انہیں نیچے میں سے اٹھانا ان کی پڑھائی کے لیے اچھا نہ تھا۔ باجوہ کو دل کے دورے پڑنے لگے۔

بارے گرمی کی چھٹیاں ہوئیں اور ان کے بار بار لکھنے پر مدن نے انہوں کو کندن، پاشی اور دلاری کے ساتھ سہار پور بیج دیا۔ دھنی رام کی دنیا چک ٹھی۔ کہاں نہیں دفتر کے کام کے بعد فرستہ ہی فرستہ تھی اور کہاں اب کام ہی کام تھا۔ نچے بچوں ہی کی طرح، جہاں کپڑے آثارتے وہیں پڑے رہنے دیتے اور باجوہ انجینئرنگی سماں پھرتے پہنچنے سے دور، السائی ہوئی رہی، انہوں تو پہنچنے پہناد سے تک سے غافل ہو گئی تھی۔

دہرسوئی میں یوں پھرتی رہتی جیسے کہ بجی ہاؤس میں گائے باہر کی طرف منہ اٹھا، اٹھا کر اپنے ماک کو ڈھونڈا کرتی ہے۔ کام دھام کرنے کے بعد وہ کبھی اندر ڈنکھوں پر لیٹ جاتی۔ کبھی باہر کنپر کے بوٹے کے پاس اور کبھی آدم کے پیڑتکے جو آنگن میں سینکڑوں ہزاروں دلوں کو نخاں سے کھڑا تھا۔

ساون بھاروں میں ڈبلنے لگا۔ آنگن میں سے باہر کا دریچہ کھلتا تو کنواریاں نئی بیا، ہی ہوئی لڑکیاں پینگ بڑھاتے ہوئے گاتیں۔ جھو لاکن نے ڈار در سے امرا یا۔ اور پھر گیت کے بول کے مطابق دو جھولیتیں اور دو جھلاتیں اور کہیں چار مل جاتیں تو بھول بھلیاں ہو جاتیں۔ او ہیر ڈعمر کی اور بورڈھی عورتیں ایک طرف کھڑی تکا کرتیں۔ اندو کو معلوم ہوتا جیسے وہ بھی ان میں شامل ہو گئی ہے۔ جبھی وہ منہ پھیر لیتی اور ٹھنڈی سانسیں بھرتی ہوتی سو جاتی۔ با بوجی پاس سے گزرتے تو اسے جگانے اور اٹھانے کی ذرا بھی کوشش نہ کرتے بلکہ قلعہ پار اس کی شلوار کو جو بہر دھوتی سے بدل آتی اور جسے دو سہیثہ اپنی ساس دائے پرانے صندل کے صندوق پر پھینک دیتی۔ اٹھا کر کھونٹی پر لٹکا دیتے۔ ایسے میں انھیں سب سے نظریں بچانا پڑتیں لیکن ابھی شلوار کو سمیٹ کر مرتے، تو نگاہ نیچے کرنے بیس بھوکے محروم پر جا پڑتی تب ان کی بمت جواب دے جاتی اور وہ یوں شتابی کرے سے نکل بھاگتے جیسے کہیں سانپ کا بچپن سے باہر آگیا ہو پھر برآمدے میں ان کی آواز سنائی دینے لگتی۔ ادم نمو بھلوتے واسو دیوا —————

اڑوس پڑوس کی عورتوں نے با بوجی کی بھوکی خوبصورتی کی داستانیں دوڑ دوڑ تک پہنچادی تھیں۔ جب کوئی عورت با بوجی کے سامنے بھوکے پیارے پن اور سڈوں حبیم کی باتیں کرتی تو وہ خوشی سے پھوٹ جاتے اور کہتے۔ ”ہم تو دھنیتی ہو گئے“ ای چند کی ماں! شکر ہے ہمارے گھر میں بھی کوئی صحت والا جیو آیا“ اور یہ کہتے ہوئے ان کی نگاہیں کہیں دوڑ پہنچ جاتیں جہاں دق کے عار نہیں تھے۔ دوائی کی شیشیاں، اسپیال کی سیڑھیاں یا چیزوں کے

بل۔ نگاہ قریب آتی تو انہیں مونے موٹے گردائے ہوئے جسم دالے کئی بچے بینل میں جانکھ پڑ، گردن پر چڑھتے اُترتے ہوئے محسوس ہوتے اور ایسا معلوم ہوتا جیسے ابھی اور آرہے ہیں۔ پہلو پر لیٹی ہٹھوکی کمرز میں کے ساتھ اور کولھے چھپت کے ساتھ لگ رہے ہیں اور وہ دھڑادھڑا نچے جنتی جارہی ہے اور ان بچوں کی عمر میں کوئی فرق نہیں۔ کوئی بڑا ہے نہ چھوٹا، سبھی ایک سے جڑواں — توام ... ادم نموجنگوتے —

اس پاس کے لوگ سب جان گئے رکھتے اندو بابو جی کی چھپتی بپڑے ہے۔ چنانچہ دودھ اور چھاچھ کے مشکلے حصی رام کے گھر آنے لگے اور پھر ایک دن سلام دین گو جرنے فرمائیش کر دی۔ اندو سے کہا ”نبی امیرا بیٹا آر۔ ایم۔ ایس میں قلی رکھوادو اللہ تم کو اجر دے گا“ اندو کے اشارے کی دیر تھی کہ سلام دین کا بیٹا نو کر پڑ گیا، وہ بھی سارٹر — جونہ ہو سکا اس کی قسمت، آسامیاں ہی زیاد دن تھیں۔

بھٹو کے کھانے پینے اور اس کی صحت کا بابو جی خاص خیال رکھتے تھے۔ دودھ پینے سے اندو کو چڑھتی۔ وہ رات کے وقت خود دودھ کو باٹی میں کھینٹ گلاس میں ڈال، بھٹو کو پلانے کے لیے اس کی کھٹیا کے پاس آ جاتے۔ اندو اپنے آپ کو سمجھتے ہوئے اٹھتی اور کہتی — ”نہیں بابو جی! مجھ سے نہیں پیا جاتا؟“

”تیرا تو سسر بھی پیے گا“ وہ مذاق سے کہتے۔

”تو پھر آپ پنی لیجیے نا“ اندو نہیں ہوئی جواب دیتی اور بابو جی ایک مصنوعی غصہ سے برس پڑتے۔ ”تو چاہتی ہے بعد میں تیری بھی دی حالت ہو جو تیری سس کی ہوئی؟“

”ہوں — ہوں — اندو لاڈ سے روٹھنے لگتی۔ آخر کیوں نہ رُٹھتی۔ وہ لوگ نہیں روٹھتے جنہیں منانے والا کوئی نہ ہو۔ لیکن یہاں تو منانے والے سب تھے، روٹھنے والا صرف ایک۔ جب اندو بابو جی کے ہاتھ سے گلاس نہ لیتی تو وہا سے کھٹیا کے پاس ملنا نے

کے نیچے رکھ دیتے — اور ”لے یہ پڑا ہے — یتری مرضی ہے پلی — نہیں مرضی  
نہیں پی“ — کہتے ہوئے چل دیتے۔

اپنے بستر پر سچ کر صنی رام دُلاری مُمنی کے ساتھ کھیلنے لگتے۔ دُلاری کی بابوجی کے نجی  
پنڈ سے کے ساتھ بینڈ اگھسانے اور پیٹ پر مسخہ رکھ کر کھپکڑا چھلانے کی عادت تھی۔ آج جب  
بابوجی اور مُمنی یہ کھیل کھیل رہے تھے، ہنس ہمارا ہے تھے تو مُمنی نے بھابی کی طرف دیکھتے  
ہوئے کہا — ”ددھ تو کھراب ہو جائے گا بابوجی — بھابی تو میتی ہی نہیں“۔  
”پیسے گی، ضرور پیسے گی بیٹا!“ بابوجی نے دوسرے ہاتھ سے پاشی کو لپٹتے  
ہوئے کہا — ”عورتیں گھر کی کسی چیز کو خراب ہوتے نہیں دیکھ سکتیں“، ابھی یہ فقرہ بابوجی  
کے مسخہ بی میں ہوتا کہ ایک طرف سے تُش — ہے خصم کھانی“ کی آواز آنے لگتی۔ پتہ چلتا۔  
بہنو بی کو بھگارہی ہے — اور پھر کوئی غٹ سی سنائی دیتی اور سب جان لیتے ہوئے  
— بھابی نے دو فھری لیا۔ کچھ دیر کے بعد کندن، بابوجی کے پاس آتا اور کہتا —  
— ”بوجی — بھابی رورہی ہے“

”بایس؟“ بابوجی کہتے اور پھر اٹھ کر انڈھیرے میں دُور اسی طرف دیکھنے لگتے جو صدر  
بہنو کی چاپائی پڑی ہوتی۔ کچھ دیر یونہی میٹھے۔ ہنسنے کے بعد وہ پھر لیٹ جاتے اور کچھ سمجھتے  
ہوئے کندن سے کہتے — ”جا — تو سو جا — دبھی سو جائے گی، اپنے  
آپ“۔

اور پھر سے لیٹتے ہوئے بابو د صنی رام آسمان پر کھلے ہوئے پر ما تما کے گلزار کو دیکھنے  
لگتے اور اپنے من کے بھگوان سے پوچھتے — ”چاندی کے ان کھلتے“ بند ہوتے ہوئے  
کچھ لوں میں سیرا پھول کھاں ہے؟“ اور پھر پورا آسمان انھیں درد کا ایک دریا دکھائی دیتے  
لگتا اور کافوں میں ایک مسلسل صادر ہو کی آواز سنائی دیتی جسے سُستے ہوئے دہ کہتے —  
”جب سے دنیا بی ہے انسان کتنا رہیا ہے؟“ اور وہ رد تے رد تے سو جاتے۔

اند و کے جانے کے میں ۲ پچیس<sup>۲۵</sup> روزہ میں مدن نے دادیا شروع کر دیا۔ اس نے لکھا۔  
 میں بازار کی روٹیاں کھاتے کھاتے تنگ آ گیا ہوں۔ مجھے قبض ہو گئی ہے، گردے کا درد  
 شروع ہو گیا ہے۔ پھر جیسے دفتر کے لوگ چھپی کی عرضی کے ساتھ ڈاکٹر کا سرفیکٹ بھیج دیتے  
 ہیں، مدن نے باجوہی کے ایک دوست سے تصدیق کی ہوئی چھپی لکھوا گئی۔ اس پر بھی جب  
 کچھ نہ ہوا تو ایک ڈبل تار۔ جوابی —

جوابی تار کے پیسے مارے گئے لیکن بلا سے۔ اندو اور پچھے نوٹ آئے تھے۔ مدن نے  
 اندو سے دو دن سیدھے مٹھے بات ہی نہ کی۔ یہ دکھ بھی اندو ہی کا تھا۔ ایک دن مدن کو اکیلے  
 میں پا کر دیجھی اور بولی — ما تنا منہ پھلا سے میٹھے ہو، میں نے کیا کیا ہے؟  
 مدن نے اپنے آپ کو چھڑانے ہونے کہا۔ چھوڑ — دور ہو جا بیری آنکھوں  
 سے — کمینی —

"یہی کہنے کے لیے اتنی دُدد سے بُلوایا ہے؟"

"ہاں!"

"ہشاد اب"

"خبردار — یہ سب تمہارا کیا دھرا ہے۔ تم جو ہنا چاہتیں تو کیا باجوہی روک لیتے؟"  
 اندو نے بے لبی سے کہا — "ہائے جی — تم تو بچوں کی سی باتیں کرتے ہو۔ میں  
 کھلا انھیں کیسے کہہ سکتی تھی؟ سچ پوچھو تو تم نے مجھے بلکہ باجوہی پر بڑا جلم کیا ہے؟  
 "وہ کیا مطلب؟"

"ظللب کچھ نہیں — اُن کا جی بہت لگا ہوا تھا بال بچوں میں!"

”ادر میرا جی؟“

”تمہارا جی؟—— تم تو کہیں بھی لگا سکتے ہو۔“ اندو نے شرارت سے کہا اور پچھے اس طرح سے مدن کی طرف دیکھا کہ اس کی مدافعت کی ساری قوتیں ختم ہو گئیں۔ یوں بھی اسے کسی اچھے سے بہانے کی تلاش نہیں۔ اس نے اندو کو مکپڑا کر اپنے سینے سے لگا لیا اور بولا۔ ”بابو جی تم سے بہت خوش تھے؟“

”ہاں!“ اندو بولی۔ ”ایک دن میں جائی تو دیکھا تو سرہانے کھڑے مجھے دیکھ رہے ہیں۔“

”یہ نہیں ہو سکتا۔“

”اپنی قسم؟“

”اپنی نہیں، میری قسم کھاؤ۔“

”تمہاری قسم تو میں ناکھاتی۔—— کوئی کچھ بھی دے۔“

”ہاں!“ مدن نے سوچتے ہوئے کہا۔ ”کتابوں میں اسے سیکھ کہتے ہیں۔“

”سیکس؟“ اندو نے پوچھا۔ ”وہ کہا ہوتا ہے؟“

”دہی جو مرد اور عورت کے بیچ ہوتا ہے۔“

”ہاٹے رام!“ اندو نے ایک دم پیچھے ہٹتے ہوئے کہا۔ ”گندے کہیں کے شرم نہیں آئی با بوجی کے بارے میں الیسا سوچتے ہوئے؟“

”باجو جی کو شرم نہ آئی تجھے دیکھتے ہوئے؟“

”یکیوں؟“ اندو نے با بوجی کی طرفداری کرتے ہوئے کہا۔ ”وہ اپنی بہو کو دیکھ کر خوش ہوا ہے ہوں گے۔“

”وکیوں نہیں۔ جب ہو تو ایسی ہو۔“

”تمہارا من گندہ ہے۔“ اندو نے نفرت سے کہا۔ ”اسی لیے تو تمہارا کار و بار

بھی گنے سے بردزے کا ہے۔ تمہاری کتابیں سب گندگی سے بھری پڑی ہیں۔ تمہیں اور تمہاری کتابوں کو اس کے سروکھ دکھائی نہیں دیتا۔ ایسے تو جب میں پڑی ہو گئی تھی تو میرے پناجی نے مجھ سے ادھک پیار کرنا شروع کر دیا تھا تو کیا وہ بھی ... دہ تھا گوڑا جس کا نتم ابھی نام لے رہے تھے؟ اور پھر اندر بولی تھی بابو جی کو یہاں بُلا لو۔ ان کا دہاں بھی بھی نہیں لگتا۔ وہ دکھی ہوں گے تو کیا تم دکھی نہیں ہو گے؟

مدن اپنے باپ سے بہت پیار کرتا تھا۔ مگر میں ماں کی موت نے مدن کے بڑا ہونے کے کارن سب سے زیادہ اثر اسی پر کیا تھا۔ اسے اچھی طرح سے یاد تھا۔ ماں کے بیمار رہنے کے باعث جب بھی اس کی موت کا خیال مدن کے دل میں آتا نزدہ آنکھیں ٹوٹنے کر پر ارتھنا شروع کر دیتا۔ ادم نزو بھگو تے دا سو دیوا۔ ادم نزو ... اب وہ نہیں چاہتا تھا کہ باپ کی چیز چھایا بھی سر سے اٹھ جائے۔ خاص طور پر ایسے میں جبکہ وہ اپنے کار دبار کو بھی جما نہیں پایا تھا۔ اس نے غیر یقینی ہیجے میں اندر سے صرف اتنا کہا۔ ابھی رہنے درد بابو جی کو۔ شادی کے بعد ہم دنوں پہلی بار آزادی کے ساتھ مل سکے ہیں۔

میرے چوتھے روز بابو جی کا آنسوؤں میں ڈوبا ہوا خط آیا۔ میرے پیارے مدن کے تھا طب میں میرے پیارے کے الفاظ شور پانیوں میں دصل گئے تھے۔ لکھا تھا۔ ہپو کے یہاں ہونے پر میرے تو دہی پڑانے دن لوٹ آئے تھے۔ تمہاری ماں کے دن، جب ہماری نئی نئی شادی ہوئی تھی۔ نزدہ بھی ایسی ہی الھڑتھی۔ ایسے ہی آنارے ہوئے کپڑے ادھر ادھر پھینک دینی اور پناجی سکھیتھے پھرتے۔ دہی صندل کا صندوق، دہی بیسیوں خلچکن ... میں بازار جا رہا ہوں، آرہا ہوں، کچھ نہیں تو دہی بڑے یار بڑی لارہا ہوں۔ اب گھر میں کوئی نہیں۔ وہ جگہ جہاں صندل کا صندوق پڑا تھا، خالی ہے ... اور پھر ایک آدھ سطر اور دصل گئی تھی۔ آخر میں

لکھا تھا۔— دفتر سے لوٹتے سئے یہاں کے بڑے بڑے اندھے کمروں میں داخل ہوتے ہوئے میرے من میں ایک ہوول سا اٹھتا ہے... اندھر پر۔۔۔ ”بہو کا خیال رکھنا“ اسے کسی ایسی دیسی دایہ کے حوالے مت کرنا۔“

اندوں نے دونوں ہاتھوں سے چھپی پکڑ لی، سانس کھینچنی، ہنگھیں پھیلاتی شرم سے پانی پانی ہوتے ہو شے بولی۔۔۔ ”میں مر جائی، بالوجی کو کیسے پتہ چل جیا؟“  
من نے چھپی چھڑاتے ہو شے کہا۔۔۔ ”بالوجی کیا نچے ہیں؟“۔۔۔ دنیا دیکھی ہے۔۔۔ سبیں پیدا کیا ہے؟“

”ہاں مسگر“ اندو بولی ”ابھی دنی ہی کے ہو شے ہیں؟“

اور پھر اس نے ایک تیز سی نظر اپنے پیٹ پر ڈالی جس نے ابھی بڑھنا بھی نہیں شروع کیا تھا اور پھر بالوجی یا کوئی اور دیکھ رہا ہو اس نے ساری کاپلواس پر کھینچ لیا اور کچھ سوچنے لگی۔ جبھی ایک چمک سی اس کے چہرے پر آئی اور وہ بولی۔۔۔ ”تمہاری سُسرال سے شیرینی آئے گی؟“

”میری سُسرال؟۔۔۔ اوہاں“ من نے راستہ پاتے ہو شے کہا۔۔۔ مکتنی شرم کی ہات ہے۔۔۔ بھی کچھ آٹھ ہمینے شادی کو ہوئے ہیں اور چلا آیا ہے“ اور اس نے اندو کے پیٹ کی طرف اشارہ کیا۔

”چلا آیا ہے یا تم لا شے ہو؟“

”تم۔۔۔ یہ سب تصور تمہارا ہے۔۔۔ کچھ عورتیں ہوتی ہی ایسی ہیں۔۔۔“

”تمہیں پسند نہیں؟“

”ایک دم نہیں؟“

”کیوں؟“

”چار دن نوزمر سے لے لیتے زندگی کے؟“

”کیا یہ جنگی کا نجات ہے؟“ اندو نے صدر مہ زدہ پہچے میں کہا۔ مرد غورت شادی کس لیے کرتے ہیں؟ سمجھو ان نے بنانے دے دیا؟ پوچھو ان سے جن کے ہے ہوتا۔ پھر وہ کیا کچھ کرتی ہے؟ پیر مل فیکر دل کے پاس چاتی ہے۔ سادھیوں، محاربوں، ہر چوٹیاں باندھتی، مژرم حیا کو تنج کر، دریاؤں کے کنارے نگی ہو کر سر کندھے کاٹتی۔ شمشانوں میں مسان جگاتی۔

”اچھا! اچھا!“ مدن بولا۔ تم نے بھان ہی شروع کر دیا۔ اولاد کے لیے تھوڑی عمر پڑی تھی؟“

”ہو گا تو!“ اندو نے سرزنش کے انداز میں انگلی اٹھتے ہوئے کہا۔ جب تم اسے ہاتھ بھی مت لگانا۔ وہ تھارا ہے میرا ہوگا۔ نہیں تو اس کی جرودت ہے۔ پر اس کے دادا کو بہت ہے۔ یہ میں جانتی ہوں۔“

اول پھر کچھ بجل، کچھ صدر مہ زدہ ہو کر اندو نے اپنا سکھ دلوں ہاتھوں میں چھپا لیا۔ وہ سوچتی تھی پیٹ میں اس نئی سی جان کو پالیئے کے سلسلے میں، اس جان کا ہوتا سوتا تھوڑی بہت ہمدردی تو کرے گا ہی لیکن مدن چپ چاپ بیٹھا رہا۔ ایک لفڑ بھی اس نے مٹھ سے نہ نکالا۔ اندو نے چہرے پر سے ہاتھ اٹھا کر مدن کی طرف دیکھا اور ہونے والی پہلوش کے خاص انداز میں بولی ”وہ تو جو کچھ میں کہہ رہی ہوں سب یقین ہو گا پہلے تو میں سچوں گی، ہی ہے۔ مجھے بچپن ہی سے دہم ہے اس بات کا!“

مک جیسے خالف ہو گیا۔ یہ خوبصورت چیز جو حاملہ ہونے کے بعد اور بھی خوبصورت ہو گئی ہے، مر جائے گی؟ اس نے پیٹ کی طرف سے اندو کو نھامہ لیا اور پھر کھنچ کر اپنے باز دوں میں لے آیا اور بولا۔ تجھے کچھ نہ ہو گا اندو۔ میں تو موت کے مٹھ سے بھی چھپیں کے لے آؤں گا تجھے۔ اب سادتری کی ہے۔

ستیہ دلنگی باری ہے ۔۔۔

مدن سے لپٹ کر اندوں مجبول ہی گئی کہ اس کا اپنا بھی کوئی دکھ ہے ...  
اس کے بعد با بوجی کو پھر سے دور سے پڑنے لگے ہیں۔ ایک دو دے میں تو دہ  
قریب قریب چل ہی بلے تھے۔ مد نڈ گیا، ان درونے لگی، سارٹر کے چلے جانے  
کے بعد ہمیشہ کی طرح مد نے آنکھیں مُوند لیں اور من ہی من میں پڑھنے لگا۔ اوم  
ہموجھ گوتے ...

دوسرے ہی روز مد نے باپ کو چھپی لکھی۔ "با بوجی! چلے آؤ ... نجتے  
بہت یاد کرتے ہیں اور آپ کی بہو بھی" ، یہکن آخر نوکری تھی۔ اپنے بیس کی بات  
کھوڑی تھی۔ دھنی رام کے خط کے مطابق دھنپھٹی کا بند دبت کر رہے تھے ... ان کے  
بارے میں دن بہ دن مد کا احساس خرم بڑھنے لگا۔ "اگر میں اندوں کو دیں رہنے  
درستا تو میرا کیا مگر مٹا؟" ۔۔۔

دھنے دشی سے ایک رات پہلے مد اضطراب کے عالم میں پیچ دائے کرے  
کے باہر برآمدے میں ٹھیل رہا تھا کہ اندر سے نجتے کے رونے کی آدا آٹی اور دہ چونک کر  
دد دازے کی طرف لپکا۔ بیگم دایہ باہر آئی اور بولی۔ "مبادر ک ہو با بوجی" — لڑکا  
ہما ہے!"

"لڑکا؟" — مد نے کہا اور پھر متمنگرانہ لہجے میں بولا۔ "لبی کبھی ہے؟"  
بیگم بولی۔ "خیر مہر ہے۔ میں نے ابھی تک اسے لڑکی ہی بتائی ہے ... نجتے  
زیادہ خوش ہو جائے تو اس کی آنول ہنیں گرتی نا؟"

"او .." مد نے بیوقوفی کی طرح آنکھیں جھپٹتے ہوئے کہا اور پھر کرے میں  
جانے کے لیے آگے بڑھا۔ بیگم نے اسے دیہیں روک دیا اور کہنے لگی۔ "تمہارا

امد کیا کام؟“ اور پھر ایک ایکی در دادہ بھیڑ کر اندر لپک گئی۔

مدن کی ٹانگیں ابھی تک کانپ رہی تھیں۔ اس وقت خوت سے ہنیں، تسلی سے یا شاید اس لیے کہ جب کوئی اس دنیا میں آتا ہے تو ارد گرد کے لوگوں کی بھی حالت ہوتی ہے۔ مدن نے مُن رکھا تھا جب لڑکا پیدا ہوتا ہے تو گھر کے درودیوار لرزنے لگتے ہیں۔ گواہ در ہے ہیں کہ بڑا ہو کر ہمیں بیچے گایا رکھے گا۔ مدن نے محسوس کیا جیسے سچ مجھ ہی دیاریں کانپ رہی تھیں... زندگی کے لیے چکلی بھابی تو نہ آئی تھی کیونکہ اس کا اپنا بچہ بہت چھوٹا تھا البتہ دریا باد والی پھوپھی ضرور ہے تھی جس نے پیدائش کے وقت رام رام۔ رام رام کی رُٹ لگادی تھی اور اب وہی رُٹ مدھم ہو رہی تھی۔ —

زنگی بھر مدن کر اپنا آپ اتنا فضول اور بیکار نہ لگاتا۔ اتنے میں پھر در دادہ کھلا اور پھوپھی نکلی۔ برآمدے کی بجلی کی مدھم سی روشنی میں اس کا چہرہ بھوت کے چہرے کی طرح ایک دم دودھیا سفید نظر آ رہا تھا۔ مدن نے اس کا راستہ روکتے ہوئے کہا۔ —

”امد مُحیک ہے نا پھوپھی۔“

”مُحیک ہے، مُحیک ہے، مُحیک ہے“ پھوپھی نے تین چار بار کہا اور پھر اپنا لرزتا ہوا ہاتھ مدن کے سر پر رکھ کر اسے نیچا کیا، چوما اور باہر لپک گئی۔

پھوپھی برآمدے کے در دادے میں سے باہر جاتی ہوئی نظر آ رہی تھی۔ وہ بیٹھک میں چھپی چہال باقی کے بچے سور ہے تھے۔ پھوپھی نے ایک ایک کر کے سر پر پیار سے ہاتھ پھیرا اور پھر چھت کی طرف آنکھیں اٹھا کر متھ میں کچھ بولی اور پھر نہ دھال سی ہو کر متھ کے پاس لبٹ گئی۔ اوندھی۔ اس کے پھر کتے ہوئے شانول سے پتہ چل رہا تھا۔ جیسے رودھی ہے۔ مدن جیران ہوا... پھوپھی تو کئی زھکیوں سے گزندھ چکی ہے، پھر کیوں اس کی رُوح تک کانپ آئی ہے؟ —

پھر ادھر کے کمرے سے ہرمل کی بو باہر لپکی۔ دھوٹیں کا ایک غبار سا آیا جس نے

من کا احاطہ کر لیا۔ اس کا سر چکرا گیا۔ جبھی بیگم دایہ کپڑے میں کچھ لپیٹے ہوئے باہر نکلی۔ کپڑے پر خون ہی خون تھا جس میں سے کچھ قطرے نیکل کر فرش پر گر گئے۔ مدن کے ہوش اڑ گئے۔ اسے معلوم نہ تھا کہ وہ کہاں ہے، آنکھیں کھلی تھیں پر کچھ دکھائی نہ دے رہا تھا۔ بیج میں اندوکی ایک مرکھی سی آواز آئی ۔۔۔ ہ۔۔۔ ہ۔۔۔ اور پھر نچے کے رونے کی آواز ۔۔۔

تین چار دن میں بہت کچھ ہوا۔ مدن نے گھر کے ایک طرف گڑھا کھود کر آنکھ کو دبایا۔ گُتوں کو اندا آنے سے روکا۔ لیکن اسے کچھ یاد نہ تھا۔ اسے یہ لگا جیسے ہرمل کی کوڈ منغ میں لبس جانے کے بعد آج ہی اسے ہوش آیا ہے۔ کمرے میں وہ اکیلا ہی تھا اور اندو نند اور جبودھا ۔۔۔ اور دوسرا طرف نند لال ۔۔۔ ان دونے نچے کی طرف دیکھا اور کچھ لوہ لینے کے انداز میں بولی ۔۔۔ ”بالکل تم ہی پر گیا ہے“ ”ہو گا“ مدن نے ایک اچھتی سی نظر نچے پر دالتے ہوئے کہا ۔۔۔ ”میں تو کہتا ہوں شکر ہے بھگوان کا تم بھی گیئیں“

”ہاں!“ اندو بولی ۔۔۔ میں تو سمجھتی تھی ۔۔۔

”بُشَّه بُشَّه بُولو“ مدن نے ایک دم اندوکی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ بہاں تو جو کچھ ہوا ہے میں تو اب مہمارے پاس بھی نہیں پہنچکوں گا“ اور مدن نے دیاں دانتوں تک دبایی۔ ”لوتبہ کرو“ اندو بولی۔

مدن نے اسی دم کاں اپنے ہاتھوں سے پکڑ لیے ۔۔۔ اور اندو نجیف سی آواز میں ہنسنے لگی۔

تچھ پیدا ہونے کے بعد کئی روز تک اندوکی ناف تھکانے پر نہ آئی۔ وہ گھوم گھوم کر اس نچے کو تماش کر رہی تھی جواب اس سے پرے باہر کی دنیا میں جا کر، پہنچی مان کو بھوک کیا تھا۔

اب سب کچھ تھیک تھا اور اندو شانسی سے اس دنیا کو تک رہی تھی۔ معلوم ہوتا تھا اس نے صن ہی کے ہنیں دنیا بھر کے گناہ گاروں کے گناہ معاف کر دیئے ہیں اور اب دیلوی بن کر دیا اور کرونا کے پرساد بانت رہی ہے... ملن نے اندو کے سفہ کی طرف دیکھا اور سوچنے لگا۔ — اس سارے خون خرابے کے بعد کچھ دبلي ہو کر اندو اور بھی اچھی لگنے لگی ہے... جبھی ایکا ایکی اندو نے دنوں ہنہ اپنی چھاتیوں پر رکھ لیے —

”کیا ہوا؟“ ملن نے پوچھا۔

”کچھ ہنیں“ اندو کھوڑا ساٹھے کی کوشش کر کے بولی۔ — اسے مُبُک گی ہے: اور اس نے پچھے کی طرف اشارہ کیا۔

”اسے؟ — مُبُک؟ —“ ملن نے پہنچے کی طرف اور پھر اندو کی طرف۔ یکھتے ہوئے کہا ”تھیں کیسے پتا چلا؟“

”دیکھتے ہنیں؟“ اندو نیچے کی طرف نگاہ کرتے ہوئے بولی ”سب گیلا ہو گیا ہے“ ملن نے غور سے اندو کے ڈھینے ڈھائے دگلے کی طرف دیکھا۔ بھر جھر دودھ بہ رہا تھا اور ایک فاصل قسم کی بُوا رہی تھی۔ پھر اندو نے پچھے کی طرف ہاتھ ڈھاتے ہوئے کہا۔ — اسے مجھے دے دو۔“

ملن نے ہاتھ پنگوڑے کی طرف بڑھایا اور اسی دم کھینچ لیا۔ پھر کچھ ہمہر سے کام لیتے ہوئے اس نے پچھے کوئی انٹھایا جیسے وہ مر اہوا چوہا ہو۔ آخر اس نے پچھے کو اندو کی حودیں دے دیا۔ اندو ملن کی طرف دیکھتے ہوئے بولی — ”تم جاؤ... باہر ہی“

”کیوں؟... باہر کیوں جاؤ؟“ ملن نے پوچھا۔

”جاوہ...“ اندو نے کچھ محلتے پکھڑ شرماتے ہوئے کہ ”تمہارے سامنے میر دو دعہ ہنیں پلا سکوں گی：“

”ارے؟“ ملن حیرت سے بولا۔ ”تیرے سامنے... ہنیں پلا کے گی؟“ اندر پھر

ناہمی کے انداز میں سر کو جھپٹکارے کر باہر کی طرف چل نکلا۔ دروازے کے پاس پہنچ کر مرتے بیٹے اُس نے اندوپر ایک نکاہ ڈالی۔ — راتنی خوبصورت انداز آج تک نہیں!

مالود صنی رام جھٹی پر گھر لوٹے تو وہ پہلے سے آدھے دکھائی پڑتے رہتے۔ جب اندو نے پوتا اُن کی گود میں دیا تو وہ کھل اٹھے۔ ان کے پیٹ کے اندر کوئی پھرور انہل آیا نہ تھا جو چوبیس لکھنے اُنہیں سولی پر لشکانے رکھتا۔ اگر منا نہ ہوتا تو بابو جی کی اس سے دل گناہ مری حالت ہوتی۔

کئی علاج کیے گئے۔ بابو جی کے آخر کی علاج میں ڈاکٹر نے ادھنی کے برابر گونی پندرہ بیس کی تعداد میں روز کھانے کو دیں۔ پہلے ہی دن اُنہیں اتنا پسلینہ آیا کہ دن میں تین تین چار چھو بار کپڑے بدلتے پڑے۔ ہر بار مدن کپڑے آنار کر بالٹی میں نخوٹتا صرف پسینے ہی سے بالٹی ایک چوتھائی ہو گئی تھی۔ رات اُنہیں متلی سی ہونے لگی اور اُنہوں نے پکارا —

”بھو!“ ذرا داتن تو دینا ذائقہ بہت خراب ہو رہا ہے۔“ بھو بھائی ہوئی گئی انہ داتن لے آئی۔ بابو جی اٹھ کر داتن چباہی رہے تھے کہ ایک ابھائی کیا آئی ساتھ ہی نہیں کہا پر نالہ نے آئی۔ بیٹھے نے داپس سرمانے کی طرف لٹایا تو اُن کی تپلیاں پھر حکی تھیں اور کوئی ہی دم میں وہ اور پر آسمان کے گلزار میں پہنچ چکے تھے جہاں انہوں نے اپنا پھول ہو چکا لیا تھا۔

منہنے کو پیدا ہوئے مکمل بیس پھیس روز ہوئے تھے۔ اندو نے منہنے نوج نوج کر سر اور چھاٹ پر پٹ کر خود کو نیلا کر لیا۔ مدن کے سامنے دہی منظر تھا جو اس نے تصور میں اپنے مر نے پر دیکھا تھا۔ فرق صرف اتنا تھا کہ اندو نے چوڑیاں توڑنے کی بجائے آنار کے رکھ دی تھیں۔ سر پر راکھ مہیں ڈائی سختی سین زمین پر سے مٹی گا جانے اور

بالوں کے سکھ جانے سے چہرہ بھیاںک ہو گیا تھا۔ "وگو! میں لٹ گئی" کی وجہ اس نے ایک دل دوز آواز میں چلانا شروع کر دیا تھا۔ — "وگو! ہم لٹ گئے" —

گھر بار کا کتنا بوجہ مدن پر آپڑا تھا، اس کا بھی ملن کو پوری طرح سے اندازہ نہ تھا صبح ہونے تک اس کا دل اپک کر مسخنہ میں آگیا۔ وہ شاید نجع نہ پانما اگر وہ گھر کے باہر برو کے کنارے سیل چڑھی مٹی پر اندھائیت کرنا اپنے دل کو نجٹھانے پر نہ لاتا... وہ صرتی ماں نے چھاتی سے نکا کر اپنے بچے کو بچیا تھا۔ چھوٹے بچے لینک، دُلاری مُسَنی اور پاشی بول چلا رہے تھے جیسے گھونسلے پرسرے کے حملے پر چڑیا کے بونٹ چوپنیں اٹھا اٹھا کر چپیں کرتے ہیں۔ مانیں اگر کوئی پرول کے نیچے سمیٹتی رکھتی تو اندو —

نالی کے نالے سے پڑے پڑے مدن نے سوچا اب تو یہ دُنیا میرے لیے ختم ہو گئی۔ کیا میں جی سکوں گا؟ زندگی میں کبھی مہی سکوں گا؟ وہ اٹھا اور اٹھ کر گھر کے اندر چلا آیا۔

سیرھیں کے نیچے غسل خانہ تھا جس میں گھس کر اندر سے کوڑہ بند کرتے ہوئے مدن نے ایک بار بھراں سوال کو دہرا�ا تیں کبھی نہیں بھی سکوں گا؟ — اور وہ کھل کر ہنس رہا تھا حالانکہ اس کے پاس کی لاث ابھی پاس ہی بیٹھک میں پڑی رکھتی۔

باپ کو آگ کے حوالے کرنے سے پہلے ملن ارجحتی پر پڑے ہوئے جسم کے سامنے ڈنڈوت کے انداز میں لریٹ گیا۔ یہ اُس کا اپنے جنم دانا کو آخری پر نام تھا۔ اس پر بھی وہ رومنہ رہا تھا۔ اس کی یہ حالت دیکھ کر ناتم میں شرکیک ہونے والے رشتے دار، محلے والے من سے رہ گئے۔

پھر ہنر و رواج کے مقابل سب سے بڑا بیٹا ہونے کی حیثیت سے مدن کو چتا جلانی پڑی۔ جلتی بھولی کھوپڑی میں کھال کریا کی لاٹھی مارنی پڑی... عورتیں باہر ہی سے خستگان کے کنوں پر ہنکر گھر لوٹ چکی تھیں۔ جب مدن گھر پر پہنچا تو وہ کامپ رہا تھا۔

دھرتی مان نے تھوڑی دیر کے لیے جو طاقت اپنے بیٹھے کو دی تھی۔ رات کے گمراہنے پر پھر سے ہوس میں داخل گئی ... اسے کوئی سہارا جا ہے تھا۔ کسی اسے جذبے کا سہارا جو مت سے بھی بڑا ہو۔ اس وقت دھرتی مان کی بیٹی، جنک دلاری انہوں نے کسی گھر سے میں سے پہلا ہو کر اس رام کو اپنی بانہوں میں لے لیا ... اس رات اگر انہوں اپنا آپا یوں مک پر نہ دار دینتی تو اتنا بڑا ذکرِ من کو لے ڈو تھا۔

دل ہی سہیت کے اندر انہوں کا دوسرا بچہ چلا آیا۔ بیوی کو اس ددزخ کی آگ میں دھکیل کر، ان خود اپناؤ کو محروم گیا تھا۔ کبھی کبھی اسے خیال آتا اگر میں شاری کے بعد باوجی کے پاس گئی ہوئی انہوں کو نہ بلایتا تو شاید وہ اتنی جلدی نہ چل دستے لیکن پھر وہ باپ کی موت سے پیدا ہونے والے خسارے کو پورا کرنے میں لگ جاتا ... کاروبار جو پہلے بنتے تو جی کی وجہ سے بن بیوگیا تھا —— مجبوراً جل نکلا۔

ان دونوں بڑے بیٹے کو ناران کے پاس چھوڑ کر چھوٹے کو چھاتی سے لگائے انہوں کے چلی گئی تھی۔ یقچھے مُتاثر طرح اُن سند رہ جو کبھی مانی جاتی تھی اور کبھی نہیں بھی۔ میکے سے انہوں کا خط آیا۔ — بھے یہاں اپنے بیٹے کے رونے کی آواز آرہی ہے اسے کوئی مارتانو نہیں؟ ۔ ۔ ۔ مدن کو بڑی حیرت ہوئی۔ ایک جاہل، ان پڑھ غورت ۔ ۔ ۔ ایسی باتیں کیسے لکھ سکتی ہے؟ ۔ ۔ ۔ پھر اس نے اپنے آپ سے پوچھا —— کیا یہ بھی کوئی سماں ہوا فقرہ ہے؟

سال گزر گئے۔ پیے کبھی اتنے نہ آئے تھے کہ ان سے کچھ عیش ہو سکے لیکن گزارے کے مطابق آمدی صورت ہو جاتی تھی۔ وقت اس وقت ہوتی جب کوئی بڑا خرچ سامنے آ جاتا ...

کندن کا داخلہ دینا ہے، دُلاری مُتّی کا لٹگن بھجوانا ہے۔ اس وقت مدن مُتّی کا لٹگا کر بیٹھ جاتا اور پھر اندر ایک طرف سے آتی، مُسکراتی ہوئی اور کہتی۔۔۔ "کیوں دمکھی ہو رہے ہو؟" مدن اس کی طرف امید بھری نظر دل سے دیکھتے ہوئے کہتا۔۔۔ "دمکھی نہ ہوں؟ کندن کا بی۔۔۔ اے کا داخلہ دینا ہے۔۔۔ مُتّی۔۔۔" انہوں پھر نہستی اور کہتی۔۔۔ چلو بیرے ساتھ۔۔۔ اور مدن بھیڑ کے پیچے کی طرح انہوں کے پیچے چل دیتا۔ انہوں صندل کے صندوق کے پاس سُنچھت جسے کسی کو مدن سمجھتے تھے لگانے کی اجازت نہ تھی۔ کبھی کبھی اس بات پر خفا ہو کر مدن کہتا۔۔۔ "مردگی تو اے بھی چھاتی پر ڈال کر لے جانا" اور انہوں کہتی۔۔۔ "ہاں لے جاؤں گی"

پھر انہوں میں سے مطلوبہ رقم نکال کر سامنے رکھ دیتی۔

"یہ کہاں سے آ گئے؟"

"کہیں سے بھی آئے۔۔۔ نہیں آم کھانے سے مطلب ہے کہ۔۔۔"

"پھر بھی؟"

"تم جاؤ، اپنا کام چلاو"

اور حب مدن زیادہ اصرار کرتا تو انہوں کہتی "میں نے ایک سیٹھ دوست بنایا ہے تا" اور پھر ہنسنے لگتی۔ حب مٹ جانتے ہوئے بھی مدن کو یہ ندائی اچھا نہ لگتا۔ پھر انہوں کہتی "میں چمد لیثرا ہوں۔۔۔ تم نہیں جانتے؟۔۔۔ سُنھی لیثرا۔۔۔ جو ایک باتھ سے ٹوٹتا ہے اور دوسروے ہاتھ سے گریب گر باؤ دے دیتا ہے۔۔۔" اسی طرح مُتّی کی شادی ہوئی جس پر ایسی ہی لوت کے زیور بجے۔ قرضہ چڑھا اور پھر اُتر بھی گیا۔۔۔

ایسے ہی کن۔ ان بھی بیا ہا گیا۔ ان شادیوں میں انہوں ہی ہتھ بھرا" کتنی تھی اور ماں کی جگہ کھڑی ہو جاتی۔ آسمان سے بالو جی اور ماں دیکھا کرتے اور پھر برساتے جو کسی کو غافر نہ آتے۔ پھر ایسا ہوا، اور ماں جی اور بالو جی میں حبکر اچل گیا

ماں نے بابو جی سے کہا "تم بپو کے ہاتھ کی پکی کھا آئے ہو، اس کا سکھ بھی دکھیا ہے پر میں نصیبوں جلی نے کچھ بھی نہیں دیکھیں" — اور یہ جھگڑا و شنو، مہمیش اور شتو تک پہنچا مانخوا نے ماں کے حق میں فیصلہ دیا — اور یوں ماں، مات لوگ میں اکرے بپو کی کوکھیں پڑی — اور اندو کے ہاں ایک بیٹی پیدا ہوئی ۔ ۔ ۔

پھر اندو ایسی دیلوی بھی نہ تھی۔ جب کوئی اصل کی بات ہوتی تو سن دیور تو کیا خود مدن سے بھی بھڑک جاتی — مدن راست بازی کی اس پتلی کو خفا بوکر ہرشی چند رکی بھی کہا کرتا تھا۔ چونکہ اندو کی باقی میں الجھاؤ ہونے کے باوجود سچائی اور دھرم قائم رہتے تھے اس لیے مدن اور کہنے کے باقی سب لوگوں کی آنکھیں اندو کے سامنے پچھی ہی رہتی تھیں۔ جھگڑا کتنا بھی بڑھ جائے مدن اپنے شوہری زغم میں کتنا بھی اندو کی بات کو روک رہے تھے لیکن آخر بھی سر جھکا ہے ہوئے اندو ہی کی شرن میں آتے تھے اور اسی سے چھپا مانگتے تھے۔

نسی بھابی آئی۔ کہنے کو تو وہ بھی بیوی تھی لیکن اندو ایک عورت تھی جسے بیوی کہتے ہیں۔ اس کے الٹھ پوری بھابی رانی ایک بیوی تھی جسے عورت کہتے ہیں۔ رانی کے کاران بھائیوں میں جھگڑا ہوا اور جسے پی چاچا کی معرفت جامداد تقسیم ہوئی جس میں ماں بابو کی جامداد تو ایک طرف، اندو کی اپنی بنائی ہوئی چیزیں بھی تقسیم کی زد میں آگئیں اور اندو کی یہ مسوں کر رہ گئی۔ جہاں سب کچھ مل جانے کے بعد اور الگ ہو کر بھی کہنک اور رانی ٹھیک سے نہیں بس سکتے وہاں اندو کا اپنا گھر دنوں ہی میں جگد جگد کرنے لگا۔

بچی کی پیدائش کے بعد اندو کی صحت دوڑ رہی۔ بچی ہر وقت اندو کی چھپائیوں سے چھپتی رہتی تھی۔ جہاں بھی گوشت کے اس لوٹھڑے پر مٹو مٹو کرتے تھے وہاں ایک اندو تھی جو اس کلیعے سے لگائے پھرتی۔ لیکن کبھی خود بھی پریشان ہوا تھا۔ اور بچی کو سامنے جھینکنے میں پھینکتے ہوتے کہہ اٹھتی — "تو مجھے جی بنے بھی دے گی — ماں؟" — اور بچی چلا چلا کر دنے لگتی۔

مُن کا دو سے کہنے لگا۔ شادی سے بے کر اس وقت تک اُس سے وہ عورت نہ ملی تھی جس کا دہ متلاشی تھا۔ گندہ بروزہ پکنے لگا اور مدن نے بہت ساروپیہ اندو سے بالا ہی بالا خرج کرنا شروع کر دیا۔ با بوجی کے چلے جانے پر کوئی پُرچھنے والا بھی تو نہ تھا۔ پوری آزادی تھی۔ گویا پڑ دسی سبھے کی بھیں پھر مدن کے مسٹھ کے پاس پھنکا رہنے لگی، بلکہ با بار بچھدار نے چکی۔ شادی کی رات والی بھیں تزیک چکی تھی۔ لیکن اس کا ماں کر رہا تھا۔ مدن اس کے ساتھ ایسی چکھوں پر جانے لگا جہاں رُدشی اور سامے عجیب بے قاعدہ سی شکلیں بناتے ہیں۔ نکروں کا بھی ان بیہبیت نے نکون بنتی ہے کہ اوپر کھٹ سے رُدشی کی ایک چوکر آ کر اسے کاٹ دیتی ہے۔ کوئی تصویر پوری نہیں بنتی۔ معلوم ہوتا ہے بغل سے ایک پا جامہ نکلا اور آسمان کی طرف ہڑکیا یا کسی کوٹ۔ نہ دیکھنے، اس کا مسٹھ پوری طرح سے ڈھانپ لیا اور کوئی سانس کے لیے تر پئے لگا۔ جسمی رُدشی کی چوکر ایک چوکھا سی بن گئی اور اس میں ایک صورت آ کر کھڑی ہگئی۔ دیکھنے والے نے باقاعدہ بڑھایا تو وہ آر پار چلا گیا اور دباں پچھھی کھی نہ تھا۔ چیخپے کوئی کتا رو نے لگا۔ اور طبل نے اس کی آواز ڈبو دی ...

مدن کو اس کے تصور کے خدا خال ملے لیکن ہر جگہ البا معلوم ہو رہا تھا جیسے اڑست سے ایک غلط خط لگ گیا۔ یا بھی کی آواز نہ ہوتی۔ سے زیادہ بلند تھی اور مدن بے داع صفا اور متوازن نہیں کی تلاش میں کھو گیا۔

سبھے نے اس وقت اپنی بیوی سے بات کی جب اس کی بیکم نے مدن کو مثالی مشوہر کی حیثیت سے سبھے کے ماں منے پیش کیا؛ پیش ہی نہیں کیا بلکہ مسٹھ پر مارا۔ اس کو انھا کر سبھے نے بیکم کے مٹھ پر دے مارا۔ معلوم ہوتا تھا کسی خوبیں تزیود کا گودا ہے جس کے رگ دریشے بیکم کی ناک اس کی آنکھوں اور کالوں پر چھے موئے ہیں۔ مکروہ کروڑ گالی بھتی ہوئی بیکم نے حافظے کی ٹوکری میں سے گودا دریج اٹھائے اور اندو کے ساف سُخڑے صحن میں بکھر دیے۔ ایک اندو کی سجاۓ دو اندو ہو گئیں۔ ایک تو اندو خود تھی اور دوسرا ایک اپنے کا ناپتا

ہوا خط جو اندو کے پورے جنم کا احاطہ کیے ہوئے تھا اور جو نظر نہیں آ رہا تھا۔

مَن کہیں جاتا بھی تھا تو گھر سے ہو کر ... بہادھو، اچھے کپڑے پہن، مکمی کی ایک جوڑی جس میں خوشبو دار قوام لگا ہوا، مُسخنہ میں رکھ کر ... لیکن اُس دن جو مَن گھر آیا تو اندو کی شکل بھی دوسرا تھی۔ اس نے چہرے پر پوڑا تھوڑا پر کھا تھا۔ گالوں پر روچ لگا رکھی تھی۔ لپ اشک کے نہ ہونے پر ہوفٹ مانتے کی بندی سے زنج لیے تھے اور بال کچھ اس طریقے سے بنائے تھے کہ مَن کی نظری ان میں الگھے کے رو گئیں۔

”کیا بات ہے آج؟“ مَن نے جبراں جو کر پوچھا۔

”پچھے نہیں“ اندو نے مَن سے بچاتے ہوئے کہا۔ ”آج فرصت ملی ہے۔“  
شادی کے پندرہ برس گذر جانے کے بعد اندو کو آج فرصت ملی تھی! اور وہ بھی اس وقت جب کہ چہرے پر چھائیاں چلی آئی تھیں۔ ناک پر ایک سیاہ سی کامی بین گئی تھی اور بلاڈز کے نیچے ننگے پیٹ کے پاس کمر پر چربی کی دو تین تھیں دکھائی دینے لگی تھیں۔ آج اندو نے ایسا بندوبست کیا تھا کہ ان عیوب میں سے ایک بھی چیز نظر نہ آتی تھی۔ یوں بنی تھیں، کئی کسانی وہ بے حد جیں لگ رہی تھی۔ ”یہ نہیں ہو سکتا۔“ مَن نے سوچا اور اُسے ایک دھچکا سالاگا۔ اُس نے پھر ایک بار مڑا کر اندو کی طرف دیکھا۔ جیسے گھوڑوں کے بیوپاری کسی نامی گھوڑی کی طرف دیکھتے ہیں۔ وہاں گھوڑی بھی تھی اور لال نگاہ بھی ... یہاں جو غلط خط لگے تھے، شرابی کی آنکھوں کو نہ دکھ سکے ... اندو سچ مجھ خوبصورت تھی۔ آج بھی اپندرہ سال کے بعد پھولال، رشیدہ، مسز رابرٹ اور ان کی بہنیں اس کے سامنے پانی بھرتی تھیں ... پھر مَن کو رحم آنے لگا اور ایک ڈر!

آسمان پر کوئی خاص باول بھی نہ تھے لیکن پانی پڑنا شروع ہو گیا۔ گھر کی گنجائیں پر تھی اور اس کا پانی کناروں سے نکلنے کل کر پوری تر اُسی اور اس کے آس پاس بُنے والے گاؤں اور قصبوں کو اپنی پیٹ میں لے رہا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا اسی رفتار سے پانی

بہتار ہات تو اس میں کیلاش پر بست بھی ڈوب جائے گا . . . ادھر بھی رونے لگی۔ ایسا رونا جو دہ آج تک نہ رہی تھی۔

ملن نے اس کی آواز سن کر آنکھیں بند کر لیں، کھولیں تو بچی سامنے کھڑی تھی۔ جوان عورت بن کر۔ بہنیں۔ بہنیں، دہ اندو تھی۔ اپنی ماں کی بیٹی، اپنی بیٹی کی ماں جو اپنی آنکھوں کے دنبالے سے مُسکرائی اور ہوتلوں کے کونے سے دیکھنے لگی۔

اسی کرے میں چھال ایک دن ہرمل کی دھونی نے مدن کو چکرا دیا تھا، آج خُس کی خوشبو نے بوکھلا دیا۔ ہلکی بارش تیز بارش سے زیادہ خطرناک ہوتی ہے۔ اس لیے باہر کا پانی اور پسکی کڑی میں سے ٹپکتا ہوا اندو اور مدن کے نیچ ٹپکنے لگا۔ ... لیکن مدن تو شرابی ہو رہا تھا۔ اس نئے میں اس کی آنکھیں سمشنے لگیں اور تنفس تیز ہو کر انسان کا تنفس نہ رہا۔

”اندو——“ مدن نے کہا۔ اور اس کی آواز شادی کی رات والی آواز سے دوسری اور پرستی اور اندو نے پرے دیکھتے ہوئے کہا۔ — ”جی“ اور اس کی آواز دوسری نیچے تھی ... پھر آج چاندنی کی بجائے اماوس تھی ...

اس سے پہلے کہ مدن اندو کی طرف ہاتھ بڑھاتا، اندو خود ہی مدن سے لپٹ گئی۔ پھر مدن نے ہاتھ سے اندو کی ٹھوڑی اور پرانھائی اور دیکھنے لگا، اس نے کیا کھویا، کیا پایا ہے؟ اندو نے ایک نظر مدن کے سیاہ ہوتے ہوئے پھرے کی طرف پھینکی اور پھر آنکھیں بند کر لیں۔

”یہ کیا؟“ مدن نے چونکتے ہوئے کہا۔ — ”بہتاری آنکھیں سُوجی ہوئی ہیں۔“

”یوہنی۔“ اندو نے کہا اور بچی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ — ”رات پھر جگایا ہے اس چڑیل میانے۔“

بچی اب تک خاموش ہو چکی تھی۔ گو پادم سادھے دیکھ رہی تھی، اب کیا ہونے والا ہے؟ آسمان سے پانی پڑنا بند ہو گیا تھا۔ مدن نے پھر غود سے اندو کی آنکھوں کی

طرف دیکھتے ہوئے کہا۔۔۔ ”ہاں مگر۔۔۔ یہ نہ ہے“

”خوشی کے ہیں“ اندو نے جواب دیا ”آج کی رات میری ہے“ اور پھر ایک عجیب سی  
ہنسی ہستی ہوئی وہ مدن سے چھٹ گئی۔ ایسا تلنڈ کے احساس سے مدن نے کہا۔۔۔ آج  
برسون کے بعد میرے من کی مراد پڑی ہوئی ہے: اندو! میں نے ہمیشہ چاہا تھا۔۔۔  
”لیکن تم نے کہا ہنیں“ اندو بولی۔۔۔ ”یاد ہے شادی کی رات میں نے تم سے کچھ  
مانگا تھا؟“

”ہاں!“ مدن بولا۔۔۔ ”پمنے دُکھ مجھے دے دو“

”تم نے تو کچھ ہنیں مانگا مجھ سے“

”میں نے؟“ مدن نے حیران ہوتے ہوئے کہا۔۔۔ ”میں کیا مانگتا؟ میں تو جو کچھ  
مانگ سکتا تھا وہ سب تم نے دے دیا۔ میرے عزیزوں سے پیار۔۔۔ ان کی تعلیم،  
بیاہ شادی۔۔۔ یہ پیارے پیارے نپے۔۔۔ یہ سب کچھ تو تم نے دے دیا۔۔۔  
”میں بھی بیپی سمجھتی تھی“ اندو بولی۔۔۔ ”لیکن اب جا کر پتہ چلا، ایسا ہنیں“  
”کیا مطلب؟“

”کچھ ہنیں“ پھر اندو نے ٹک کر کہا۔۔۔ ”میں نے بھی ایسا چیز رکھ لی؟“  
”کیا چیز رکھ لی؟“

”اند و کچھ دیر چُپ رہی اور پھر اپنا سُکھ پرے کرتی ہوئی بولی۔۔۔ ”اپنی لاج۔۔۔  
اپنی خوشی۔۔۔ اس وقت تم بھی کہہ دیتے۔۔۔ اپنے سُکھ مجھے دے دو۔۔۔ تو میں۔۔۔“  
اور اندو کا گلار نہ ہگیا۔

اند کچھ دیر بعد دہ بولی۔۔۔ ”اب تو میرے پاس کچھ ہنیں رہا“

مدن کے ہاتھوں کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔ وہ زمین میں گرد گیا۔۔۔ یہ ان پڑھ غورت؟  
کوئی رٹا ہوا فقرہ۔۔۔؟

نہیں تو ... یہ تو ابھی سامنے ہی زندگی کی بھٹی سے نکلا ہے۔ ابھی تو اس پر مبارک  
ہخواڑے پڑ رہے ہیں اور آتشیں بُرا دھاروں طرف اڑ رہے ہے ...  
کچھ دیر کے بعد مدن کے ہوش ٹھکانے آئے اور بولا — "میں سمجھ گیا اندو"  
پھر روئے ہوئے مدن اور اندو ایک دوسرے سے لپٹ گئے۔ اندو نے مدن کا  
ہاتھ گھٹا اور اسے ایسی دنیاؤں میں لے گئی۔ بھالِ انسان مرکر ہی ہنسنے سکتا ہے ...

---

# ٹرینس سے پرے

پنجاب میں جلی تو خاصی سست رفتاری سے پیٹ فارم کے احده سے باہر بھلی۔ دیکھ مرہن جام کو اپنی نازک سی بیوی سوترا کا بدل، ایک سادہ سی ہینڈ لوم کی سڑی میں لپٹا ہوا نظر آتا رہا۔ سوترا کی پارٹنٹ کے دردابنے میں کھڑی تھی جبکہ مرہن ایک استھان کے برابر کھڑا آخر دم تک اپنا رومال پلاتا رہا۔

گاؤں کچلنے سے پہلے سوترا کی آنکھیں نم ہو گئی تھیں۔ الفاظ سہیش کی طرح بیکار ہو گئے تھے — “یچھے کھر کا خیال رکھنا” ہوٹل کی روٹی ست کھانا۔ ”ہفتے میں ایک نہیں، دو ہار خلاض روکھنا“ یہ سب باتیں آنکھوں کی زبان کے سامنے گوئی ہو گئی تھیں۔ اور انھوں نے مرہن جام ایسے آدمی کے دل کو بھی گداز کر دیا تھا۔ ... ہر بیوی اگر ہونے سے پہلے آنکھوں ہی آنکھوں میں کتنی تائید ہائی تھی ہے۔ اس وقت تو کوئی جھوٹ بھی بول دے۔ لیکن کچھ لوگ ... مرہن نے کچھ نہ کہا۔ وہ پہلے تیر تیز اور پھر آہستہ آہستہ روہاں ہاتا رہا۔

یہ حرکت ایک رسم بن چکی تھی لیکن اپنی معلوم ہوتی تھی۔ دل کہاں، کیوں اور کس کے لیے دھڑکتا ہے؟ یہ تو دکھائی نہیں دیتا، البتہ رد مال نظر والوں کے دھنڈنے کے میں حل ہونے تک برابر اس آدمی کو دکھائی دیتا ہے، جو — جار پا ہے!

یہ سفر ہٹی بگواں۔ میں تو جب بھی کہیں جانے لگتا ہوں، میری طبیعت گرسی جاتی ہے۔ اشیش پہ ہجوم، محض، ہجوم کی وجہ سے آدمی تنبارہ جاتا ہے۔ پھر آگے جانے کے لیے گھاڑی تھوڑا ٹیکھے ہلتی ہے۔ پھر کوئی سیٹی، کوئی آواز — ”اڑے اڑے گھاڑی چھوٹ مگنی، میرا سامان رہ گیا“ — آخر... کوئی کسی کا نہیں۔ یہ دنیا... جب ایک بار تو جی چاہتا۔ ہے آدمی بکٹ و کٹ نوٹا دے اور گھر جا کر مزے سے بیٹھ جا شے۔ چاہے بیوی سے لڑے ہی۔

زندگی کی فتحمندی پہی ہے کہ اُوسی کے ساتھے میں بھی کہیں خوشی کے جذبے رینگتے رہیں اور گھاڑی کے چھوٹتے ہی لیک کر سامنے آ جائیں اور ان کی روشنی میں اُساں غائب ہو جائیں۔ کبھی جس کے ساتھ پہنچ گرام بنتے تھے، اب اس کے بغیر بنتے لگیں... مohn نے ایک گھر اسافس لیا — چلو ددھیں کی گئے چھٹی۔ پچھے چیزوں کا نہ ہونا ہی ایک طرح کا ہونا ہے۔ سو مترا لوٹے گی تو ایک بار اسے بھی پستہ چل چکا ہو گا کہ میرے بغیر زندگی کے کیا معنی ہیں؟... پھر سے غارت کرنے کے لیے اس کی صحت بھی اچھی ہو چکی ہو گی۔ پھر وہ کیسے لپٹے گی... اُٹا بھی سے کہے گی ”تو کہاں چلی گئی تھی، موسیٰ؟“

موہن دکتور یہ نہیں کے پلیٹ فارم سے باہر نکلنے کے لیے مڑا تو اسی طرف سے کوئی دوسری گھاڑی پلیٹ فارم پر آ رہی تھی۔ موہن چونک گیا۔ اُسے یوں لگا جیسے سو مترا اس گھاڑی سے گئی اور اس سے لوٹ آئی ہے۔ جبھی اس نے ایک موٹی عورت کو کپڑاٹنٹ کے در داڑے میں پھنسے ہوئے دیکھا، مسکرا کر اس اور چل دیا۔ اُسے ریڈی یو کلب جاما تھاتا ش کے کچھ ہزار یوں کے ساتھ فلاش کھیلنے کے لیے، جہاں بیج بیج میں بھی بھی پان کی سیکم زندہ

ہر جایکر تی اور سمندر سے آنے والے حجکڑ میں اس کی عنابی ساری کا پوکسی نہ کسی کو اپنی لپیٹ میں لے لیا کرنا تھا۔ پوکے ٹھائے جانے تک ساری بیٹھے بھائے ایک وجود کے باوجود دو کا احساس ہونے لگتا ...

موہن جا رہا تھا۔ ان جانے میں گھر اور دارکی چابیاں اس کے باشیں ہاتھ کی انگلی پر گھوم رہی تھیں۔ دایاں ہاتھ پتوں کی جیب میں تھا جس سے وہ پیٹ فارم کا لکٹ ٹول بھتا جبھی اس کی نظر سامنے پڑی۔

”اچھی!“ وہ کہتے ہوئے بولا۔

موہن اچلا کو جانتا تھا لیکن کوئی خاص اتنا بھی نہیں۔ اچلا کے شوہرام گد کری کو تو وہ شاید زندگی میں ایک آدھ بارہی ملا ہو گا لیکن اچلا سے اکثر مشان میں ملاقاتیں ہوا کرتی تھیں جہاں وہ اپنی ایک اوپاش سی سیلی — دیبی کے ساتھ دیبی ٹیرن کھانا کھلنے آیا کرتی تھی۔ نتے نتے کے علاوہ موہن جام اور اچلا گد کری کے نیچ آٹھ دس نہیں توہارہ پنڈ فقرے ہونے ہوں گے جن سے پتہ چلا تو صرف اتنا کہ ود بھی کو لابہ میں رہتی ہے۔ فرق یہ تھا کہ موہن کف پیر ٹیکے ایک اچھے سے فلبیٹ میں رہتا تھا اور اچلا کاروے پر کی ایک پرانی بلڈنگ میں رہتی تھی۔

شاید موہن اسے ’اچھی‘ کے نام سے نہ پکارتا لیکن دیبی نے موہن کا اس سے تعارف ہی اسی نام سے کروایا تھا۔ دیبی کو موہن اچھی طرح جانتا تھا۔ دیبی سمجھتی تھی کہ پانی مصری کے لیے کتنا خطرناک ہوتا ہے۔ اس پر بھی وہ محبوثتے ہی کسی بھی پرانے مرد سے گھل مل جاتی تھی۔ اس کی آزاد زندگی کچھ ایسا ہی شربت تھی جو زندگی کی ٹھیکیا میں رات بھرا پڑا رہتا ہے۔ صبح تک پانی کسی تحریر سے اڑ جاتا ہے اور پھر سے مصری کی ڈلیل ٹھیکیا کی تھیں دکھانی دینے لگتی ہیں۔ پہلے سے بھی صاف شفاف، پیکیلی، نیکیلی ...

موہن کے پکار نے پر اچلا نے گھوم کر دیکھا اور صرف اتنا کہا۔ ۲۰۰۰ اور

پچھے دیر کے بعد بولی ۔ ۔ ۔ "ہن"

اور پھر اس نے اپنی ساری کے پتوں سے آنکھوں کی نم پونچھ دالی۔ اب وہ مُسکارہتی۔ ایسا معلوم ہونا تھا جیسے ایکا ایکی کسی نے کوئی سہرا تاج اس کے سر پر رکھ دیا۔ مگر وہاں کے قریب آتے ہوئے دہ بولی۔ "آپ! ۔ ۔ ۔ وہاں کہے؟"

"بیوی کو چھپوڑنے آیا تھا" موہن نے جواب دیا۔ "کشمیر جا رہی ہیں۔ ۔ ۔ پچھے کی چھپٹیاں ہو گئیں نا ۔ ۔ ۔ آپ؟ ۔ ۔ ۔"

"میں؟" — اور اچلا ایک دم کھلکھلا کر مہن دی اور پھر اسی دم چُپ بھی ہو گئی۔ پچھے شرما تے ہوئے بولی۔ "میں ان کو چھپوڑنے آئی تھی ۔ ۔ ۔"

"او" — اور موہن بھی ہنس دیا۔ ایک نظر اچلا پہ ڈالنے کے بعد وہ دوسرا گاڑی کے انہن کی طرف دیکھنے لگا جس میں سے ابھی تک دھواں اٹھ رہا تھا۔ پھر اچلا کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ "کہاں گئے گد کری صاحب؟"

"دنی"

"کب آئیں گے؟"

"ہری کوئی — سہنہ دس دن میں" اچلانے کے کھانے کوئی کافرنس ہو رہی ہے؟"

"شاید نیا دن بھی لگ جائیں؟"

"ہاں ۔ ۔ ۔ شاید ۔ ۔ ۔"

اور اچلا اپنے بالوں کو سنوارنے لگی جو پہلے ہی سنورے ہوئے تھے۔ صرف ان میں ایک پن دھیلا ہو کر قدمے اور اٹھ آیا تھا۔ جسے اچلانے اپنے موی ہاتھوں سے دبا دیا۔ بھی اسے یوں لگا جیسے اس کے ہاتھ دیر تک اور اٹھے رہے ہیں۔ موہن کی نظر اس کے پوسے بہن کا طوات کرتی ہوئی ایک پل بہت دیر اس کے بدن کے اس حصے پر جائیکی تھی جو چلی اور ساری کے درمیان ہوتا ہے۔ ایکا ایکی ہاتھ نیچے کرتے ہوئے اس نے ساری سے

اپنے بدن کے نیچے حصے کو ڈھک لیا۔

موہن نے سوچا بدن کے اس حصے کو انگریزی میں ڈرف کہتے ہیں اور شہد کی ممکنی کی طرح اٹیشن سے باہر نکلنے تک یہ لفظ اس کے دماغ میں لکھنے پڑتا آ رہا ۔ ۔ ۔ ڈرف ۔ ۔ ۔ ڈرف ۔ ۔ ۔ ڈرف ۔

اور موہن نے اسے دماغ سے نکالنے کی کوشش بھی نہ کی۔ سب بے کار تھا۔ موہن  
جانا تھا۔ — ممکنی کتنی دعیت ہوتی ہے بار بار اُذکر پھر دہیں آجیستی ہے جہاں سے  
اڑتی تھی۔ جھلکا کر اسے ہٹا لے کی کوشش کریں تو ناک ڈوٹ جاتی ہے، ممکنی چھوٹ جاتی ہے۔  
باہر گئی بہت چکنی چکنی آگیلی گیلی تھی۔ بلوز سینوں سے چپک رہے تھے اور اس سخنے  
کی طرح سٹو خوبصورت لگ رہے تھے بو کانل کو پھاڑے ڈالنا ہے۔ پینے کے قطرے  
ساریوں اور ٹیکلوفوں کے اندر ہی اندر پینٹیلوں پر ٹیکتے اور جونک کی طرح ریٹکتے معلوم ہو رہے تھے  
۔۔۔ اشیش کا چلتا پھرتا پیا ڈیکھ پڑا اور یہ اسی کی وجہ سے نہا جو پیاس اور بھی تیکھی  
ہو رہی تھی۔ باہر ہال کے ایک کونے میں تھوڑی جگہ تھی جہاں اور جھپٹ پہ دپ دپ دردلا اپنکھا  
سست سی فتار سے چل رہا تھا۔ اس کے نیچے ایک بڑھا نہ کھوئے ہوئے سورہا تھا اور  
یہ لگ رہا تھا جیسے کوئی لاش شناخت کے لیے شہر کے مردہ خونے میں پڑی ہے —

مودہ کنادر اچلا نے دو چار باتیں کیں اور اس کے بعد ان کی باتیں ختم ہو گئیں۔ دنوں اپنے ذہن میں کوئی نوعِ ڈھونڈ رہے تھے جو زیادہ سرچنے کی وجہ سے ہاتھ میں نہ آ رہا تھا۔ اچلا دو قدم آگے جا رہی تھی اور موہن پیچے۔ جبھی اچلا میں اپنے بدن کے ان خطوط کا شعور عود کر لیا جنہیں عورت بد صورت سمجھتی ہے اور مرد خوبصورت سمجھتے ہیں اور ہر عورت بہیں صفت میں دکھانا ہنسیں چاہتی۔ وہ یا پیسے مانگتی ہے یا محبت... محبت... جو ہمیشہ عربیاں ہوتی ہے اور جسے کپڑے پہناد یہے جائیں تو وہ محبت ہنسیں رہتی۔ اچلا نے اپنے جسم کے پچھلے حصے پر ساری کھنکھلی اسے یوں معلوم ہو رہا تھا جیسے نظرؤں کی پر چیاں

پیچھے سے اس کے بدن نے ہر پور پہنگ رہی تھی۔

"اچھا مرہن جی" رہ مڑتے ہوئے بولی — "میں اب گھر جاؤں گی۔"

"وکیسے جائیں گی؟" موہن نے پوچھا۔

"ایسے" اور اچلا نے تھوڑا چل کے دکھایا اور بھروسوں کھلکھلا کے نہیں دیے۔ اتنی سی بات میں دنوں کے بیچ ایک یگانگت پیدا ہو گئی تھی۔ آخر موہن نے کہا — "میرا مطلب ہے... آپ گھری نہیں لائیں؟"

"اچھی نے سر ٹھانے ہوئے کہا — "مجھے ڈرائیونگ نہیں آتی۔"

"میں جو ہوں" موہن نے کہا۔ آج تھوڑی دیرے لیے مجھے ہی اپنا ڈرائیور مجھے لے جائیں۔

"جی؟" اچلا بولی۔ نہیں۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ میں۔۔۔ بس سے چلی

جائیں گی۔ آپ کیوں تکلیف کرتے ہیں؟"

"آپ کیوں تکلیف کرتے ہیں، کام جملہ ہی ایسا ہے جس سے کوئی کسی کو تکلیف دینا چاہتا ہے اور اس کے بیچ نکلنے لی گنجائش بھی رکھتا ہے۔ گویا اسے ٹوٹتا ہے تم میرے ساتھ کس حد تک بڑھ سکو گے؟ یہ جملہ مرد کہتے تو ایک عام سی بات ہوتی ہے لیکن عورت کہتے تو خاص بات... بے غور توں کے فقرے جیسے۔۔۔ جھوٹے کہیں کے... "میں مر گئی" ... وغیرہ

"اس میں تکلیف کی بیاہات ہے؟" موہن بولا۔ "میں گھر ہی تو جا رہا ہوں۔ راستے

میں آپ کو جھوڑ دوں گا۔"

گورنڈیوں کلب موہن کے دماغ سے مپنے آپ براڈ کاست ہو گئی تھی۔

تھوڑی جیسی بیس کے بعد اچلا گد کری، موہن جام کی گھاری میں بیٹھ گئی۔

گھاری نریثہ دوکی طرف سے نکلی۔ کرانگ پہ پولیس میں نے اٹھا ہاتھ دے رکھا تھا۔

حسرتی وجہ سے موہن کو گھاری روکنی پڑی۔ موہن پولیس میں کے اٹھا ہاتھ پہ سہیشہ جھلایا اور مسٹنے

میں کا بیاں منسنا یا کرتا تھا لیکن آج رہی ہاتھ سے سیچ کا ہاتھ معلوم ہو رہا تھا۔

”دیسی کسی ہے؟“... موہن نے گھنگھر کا سو صنوع ڈھونڈی لیا۔

اچلانے جواب دیا - ”دیسی ہی...“

”کیا مطلب؟“ موہن نے چونک رکھا۔ ”میں تو سمجھتا ہوں، وہ ایک بہت ہی نیک لڑکی ہے۔“

”میں نے کب تھا“ بڑی ہے؟“ اچی بولی اور نہنے لگی

موہن اپنی کے جال میں آگیا تھا اور اب یوہنی بخ تکلنے نہ یہے اور دھر اپنے بر لکھ پڑھ پڑھ رہا تھا۔ پہنچنے کے باریک سے نظرے اس کے ماتھے پہ چلے آئے۔ اچلاسی سے دور ہٹ کر دروازے کے ساتھ لگی بیٹھی جیسے کہ ابھی چھو گیا تو کوئی رشتہ پیدا ہو جائے گا۔ اپنی جھینپٹانے کے لیے موہن بولا۔ ”آپ مجھے سے انہی دو رکیوں بیٹھی ہیں؟“

”یوہنی“ اچلانے کہا اور مشکل سے ابخ بھر موہن کی طرف سرک آؤ...“ میں نے سوچا آپ کو گیرا پہ لئے میں تکلیف نہ ہو۔

”پھر وہی — تکلیف：“

جب تک پولیس میں نے ہاتھ دے دیا تھا۔ لیکن موہن کی کار بستو کھڑی نہیں۔ پولیس میں کی سیلیاں اور چھپلی کاروں کے ہارن ایک سانچہ سنانی دینے لگے۔ موہن نے جندی سے گاڑی کو گیر دیا اور گھبراہٹ میں فوراً پیر کلچ پر سے ٹھہر لیا۔ گماڑی جھنگکے کے خہا تھا آگ کے بڑھی۔ بند ہوتے ہوتے رُکی۔ پولیس میں سے کچھ آگے نکلے تو اچلا بولی۔ ”کیا آپ گاڑی ایسے ہی چلا تھے ہیں؟“

”نہیں“ موہن نے کہا۔ ”میں تو اتنے ہیزار سے چنانجاہوں کہ پتہ بھی نہیں چلتا۔

”مگر آج...“

”آج کیا ہوا؟...“

”آپ ہوئی ہیں — اور کیا ہو گا؟“

موہن اور چلا دو نیں ٹھاؤں ہال کے سامنے جا رہے تھے۔ نہ جانے کیوں موہن کا جو چاہ رہا  
تھا آج کوئی ملکیہ نہ ہوا جائے۔ ایک بس تیزی سے گزری اور موہن کو اپنے اندر اس عجیب سی  
خواہش کو دیا ناپڑا۔ من نے ٹھاؤں ہال کی طرف جاتی ہوئی میر ھیوں پر سے ہال کی طرف دیکھتے ہوئے  
ہوئے۔

”کتنا پچھلے سے۔“

”بہت اچھا ہے۔“

الفشن سر کل کی طرف سے جوانی کے عالم میں بھری ہوئی ایک بے حد خوبصورت لڑکی  
ایک لڑکے کے، نہ میں ہاتھ ڈالے رہ بڑا رکے دفتر کی طرف جا رہی تھی۔ شاید اس کی شادی ہونے  
دا دل تھی۔ اسی لیے اس کا چہرہ کسی اندوں تمازن سے تمتمایا ہوا تھا۔ اچلا نے موہن سے پوچھا  
— ”آپ کو کیسی علوم ہوتی ہے؟“

”اچھی۔“

اور موہن نے ”اچھی، کچھ اس انداز سے کہا کہ اچھی اور اچھی میں کوئی فرق نہ رہا۔ اچھی خوش  
ہو گئی کوئی کیا کر سکتا تھا۔— وہ خوش ہو گئی۔ یونہی دکھاوے کے لیے بولی۔—“ میں اتنی خوبصورت  
کہاں ہوں؟“

موہن نے ایک نظر اچلا کی طرف دیکھا اور وہ سب کہہ دیا جو وہ یوں نہ کہہ سکتا تھا۔  
کام ہال، روائیں گیٹ گذر گئے اور اب موہن کی گاڑی ریگل سینما کے پاس سے نکل رہی  
تھی۔ سامنے کا بُت من موہنا تھا۔ پھلیرے کی دو کان اچھی تھی... گاڑی کا زدے پرستیہ مدد  
کے سامنے بُک گئی جہاں اچھی رہتی تھی۔

اچھی نے چھپتی نظر سے اوھر ادھر دیکھا۔ مساٹے سامنے کے ٹیلر ماٹر کے جواہی کان اپ  
جانا تھا۔ جسی دوسرے نے اچلا کو دوسرے کسی کی کار سے اترنے نہ دیکھا تھا۔ دیکھتا بھی تو  
لے کیا پرواہ تھی؟ میہن کو کیا جیا تھی؟ اس پر بھی ایک دم در والد کھول کر اچلا گاڑی سے

ہاتھی نکھڑا لٹھیک کر — ”اچھا موہن جی، بہت بہت شکریہ“۔ کہا اور جل دی۔  
 موہن بدستور ڈرائیور کی سیٹ پر بیٹھا تھا۔ ایک ٹانگ اندر بھی اور دوسری کھلے ہونے  
 دروازے کے باہر۔ وہ اُتر کر اچلا کے لیے دروازہ کھولنا چاہتا تھا لیکن اس نے موقع تیار نہ دی:  
 پچھہ درجا کر اچلا کو جیسے کچھ بیاد آیا... وہ نکھڑا رکی اور جو کہا بھی نوصہ دننا اس لیے کہ وہ اسے  
 نہ کہنا چاہتی تھی اور اپنے اندر کسی فقرے کے کورد کے ہوئے تھی لیکن... بغض و فتن حجمِ ذریعہ  
 سے بھی آگے نکل جاتا ہے ...  
 ”و کبھی آئیے گا موہن جی“

اور موہن کے جواب کا انتظار کیے بغیر اچلا گھرِ طرف پہنچا۔ جیسے موہن موہن  
 سے پانیں کر رہا تھا میں آؤں گا، آؤں گا کبھی نہیں؟“  
 اچلا کا خیال تھا۔ موہن اتنا زیست بھدا رہ ہو کاہی۔ ان کے لہر موسے بہ۔ بکنابر۔  
 معلوم ہونا ہے۔ یہ دعوت تو صرف تکلف کی بات تھی! ...

موہن اتنی سمجھدے ارکھتا۔ درمنہ و دوسرے ہی دن اچلا بے مان پہنچنے جانا؛ جملہ اپنے  
 بھتی رام گدگری کا اچلا کے دماغ میں تصور بھی نہ تھا۔

موہن جسم سے لکھنٹی کچھ، س زور سے بھانی کہ اچلا نہر اک بھاگی چلی آئی۔ جیسے رام اگئے  
 ہی روز کسی پیش بوان پہ بیجٹ کے آگئے۔ ابھی تو... اچلا کرپڑے بھی ٹھیس کرنے کا موت  
 نہ طا تھا۔ دروازہ کھولتے ہوئے اس نے تھوڑا سامنہ باہر نکالا اور پھر ایک ایسا بیچھے ہٹ گئی  
 اپنے آپ میں سہٹ ٹھی اور بولی — ”ذرا ٹک جائیے...“  
 پر وہ اندر بھاگ گئی۔

موہن جس اتنی تابد ہی کہاں تھی؟ وہ تو بیچھے ہی سے بہت آیا تھا بیٹھا۔ نہ سٹ کپر میں۔

لکھا ہو۔ اس نے دروازے کو یوں ہلکا سادھکا دیا اور وہ کھل گیا۔ اگلے ہی لمحے وہ ڈرائیور نم میں رکھا اور سرگھما گھما کر اندر کی سب چیزوں کا جائزہ لے رہا تھا۔ اس کے تصریح بھی جیسے کوئی آنکھ نہ تھی، پہاں وہ کھڑا تھا۔ وہاں سے، چلا کا بیٹھ روم صاف دکھائی دے رہا تھا۔ عورت کا دھر میں فرق ہی کیا ہے؟ کم سے کم پوچھ تو لینا چاہیے۔ آخر استانبھی کیا؟ یہ میں بہمن پیر سے سر نمک اٹھا ہوا تھا۔ جیسے چلا بیٹھ روم کے کھلے دروازے میں سے سکھی ہوئی دکھائی دے رہی تھی۔ دونوں بالکل ایسے تھے جیسے جذبات اور خیالات آنکھوں اور جسم کے اعتبار۔ یہ بھگوان تھا، تھیں بنایا تھا۔ اچلا پنگ کی پانٹی پر سے ساری اکھاں کر جلدی جنمیں اسے نیچے کے کپڑوں پر لپیٹ رہی تھی۔

”معاف نہ کیجیے...“ موہن جام نے دپس سے کہا اور دہن سے واپس ہی اچلانے جو بولیا۔ ”کوئی بات نہیں؟“

ڈرائیور اور بیٹھ روم کے بیچ ایک چھوٹی سی جگہ تھی۔ جہاں شیشے کے ایک کینٹ کے نر شیر جی بھوے ناتھ کی تصویر ٹھکی تھی اور اس پر ایک باسی ہار لٹک رہا تھا۔ یہی نہیں ساتھ نہ اسے ایک مریم کی شبیہہ بھی تھی اور گورونانک کی بھی... اور اس کے ساتھ ہی باہر ایک کلنڈر لٹک رہا تھا جس پر لیڈ اسٹنگی لکھڑی تھی اور ایک راج نہیں اسے اپنے پرڈوں میں دبائے چوخ اٹھائے خوشہ چینی کی کوشش کر رہا تھا۔

اس ایک لمحے میں موہن جام نے دنیا بھر کی عورتیں دیکھ لی تھیں سوترا دیکھ لی تھی اور میبی دیکھ لی تھی، زازا گیبور دیکھ لی تھی، کوئی اور بھی دیکھ لی تھی اور رادھا دیکھ لی تھی جو موہن کی سسکی بہن تھی۔ دل پاریل میں اپنے دیونگاں، سڑھتی کے ساتھ رہتی تھیں۔

موہن نے سہیشہ عورت کو مایا کے روپ میں دیکھا تھا۔ وہ باہر سے اور اندر سے اور معلوم ہوتی تھی۔ اچھا اور بُرہ، گناہ اور ثواب، کبھی خوبصورت، کبھی بد صورت طریقے سے ہے پس میں کھلے ملے ہوتے تھے۔ پھر جو عورت کپڑوں میں بھری پُری دکھائی دیتی دہ قبل نکلتی اور دُنپی

وکھائی دیئے دالی بھری پُری ... اسے ہی تو مایا کہتے ہیں یا لیلا۔ مثلاً ایسی تین رست عورت جسے دیکھتے ہی گردے میں درد ہونے لگئے، اس سے ڈرنا بے قاری بات ہے اور ٹھیوں کے ڈھانپھے نے مجھے پہ اتنا بھی لفڑ نہیں ہوتا جتنا کسی مزدور کو مبیس سیر کرنا یاں کاشنے۔۔۔

مایا۔ جس کے بارے میں سوچیں کہ رام ہوئی، وہیں حکمت نامہ اور جس کے بارے میں کہیں "یہ ہاتھ نہ آئے گی، وہی گردن دباۓ گی ... اور مایا کیا ہوتی ہے؟ ... البتہ ایک اور مایا ہوتی ہے جو پا لینے کے بعد بھی حاصل نہیں ہوتی۔ اس دُنیا سے جانتے کے یوں معلوم ہوتا ہے آپ نے کسی کو نہ پایا، آپ کو سب نے پالیا۔

جمبھی ساری اور بالوں کو تھیک کرتی ہوئی اچھی ڈرائیور روم میں چلا آئی۔ وہ کتنی حسین گل رہی تھی۔ کیا صرف اس لئے کہ زہ دسری عورت تھی؟ نہیں نہیں، وہ پہلی ہوتی تو بھی اتنی ہی خوبصورت مخلوم ہوتی اس میں — کوئی بات تھی، یوں کسی دسری میں نہ تھی۔ لیکن ... ایسا تو پھر ہر ایک کے بارے میں کہہ سکتے ہیں، مگر اس کی بحوث پہنچپن کی اسی چوٹ کی وجہ سے بلکی سی خراش تھی، جس نے بالوں کی تحریر کو دو حصوں میں بانٹ دیا تھا، اور وہ خداش ہی تھی جسے چوم چوم لینے کو جھی چاہتا تھا۔

موہن کے قریب آتے ہوئے پھر سے ہاتھ اور پٹاکر اچھی نہ سنتے تھے بال قدر سے اوپر اٹھا دیئے۔ بالوں کا ایک TARA سابن گیا تھا۔ موہن نے اونہ پھر سے ک تاج جس کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ وہ اپنی ہی ساری کے پتو سے اپنے آپ کو ہوا کرنی ہوئی آئی۔

"آف! آج کتنی گرمی ہے ..."

اور پھر ہاتھ دوائیں طرف بڑھاتے ہوئے دیوار پر پٹھنے سے سوچ کو دبا دیا۔ جبھی موہن بولا — "میں بھی سوچ رہا تھا ..."

"کیا سوچ رہے تھے آپ؟" اچلانے ایک تختہ نگاہ سے موہن کا طرف دیکھا۔

"یہی" موہن نے کہا "آج کتنی گرمی ہے۔ آف!"

اور جب پئے سے ہوا کا پہلا جھونکا آیا تو مرن اور اچل تسلیم کا سائس یتھے ہوئے، آئندہ سائے صوفی پہ بیٹھ گئے۔ کتنا ظلم تھا۔ وہ ایک دمرے کے پاس بھی نہ بیٹھ سکتے تھے۔ سب کچھ کتنا غیر فطری معلوم ہو رہا تھا۔ یہ ٹھیک بھی تھا اگر دنیا بھر کے مرد عورت فطری زندگی کہ ارنے لگیں تو کیا ہو؟ لیکن — مردار عورت دلوں ناممکن ہیں۔ ان کی تکمل — ؟ جسموں کو ماریے گولی، روحوں کو پالیں کے بھی کیا اپلا سکا سے ہو کر ہنا پڑے گا؟

ایسے بھی تھوڑت میں لوگ ایسا دمرے سے میلوں دو۔ چلے جاتے ہیں۔ پھر عجیب طرح کی کشائش شروع ہوتی ہے جان نہ پچان اور آتے ہی ہاتھ پکڑ لیا اور بھی — پہلے کیوں نہ لے لایا؟ کیا سمجھتے ہو؟... محبت کے کھیل میں تو پہلی نظر، پہلا جملہ اور پہلی، ہی حرکت ابدیہ چھا جاتی ہے۔ ایک دن دیسی ایک پینٹر کے بارے میں کہہ رہی تھی جس سے وہ محبت کرتی تھی اور اب بھی کرتی ہے — "میں نہ اپنا سب کچھ اس پر لٹا دیتی لیکن چھوڑتی ہی تیسے بھونڈے طریقے سے اس نے میرا ہاتھ پکڑا اور میرے سب چھوٹے بڑے راز جاننے کی کوشش کرنے لگا۔ ایسے بھوڑے ہوتا ہے؟" میں نے اسی بھونڈے طریقے سے اسے روک دیا۔ اب میں اس کے چھپے بھاگ رہی ہوں اور دو کسی سد میں پڑیا ہے۔ جانے سے کادہ کون سا نش تھا جس میں ... تھے وہ اگری پاؤے میں کسی زندگی کے پاس جاتا ہے ..."

احلاسے کوئی بچھنا تھا۔ پانچ چھوٹے سال کی شادی کے باوجود اس کی نامنودیتی، ہی دبلي پڑی تھی۔ العۃ پنہ زرد سوڑہ بس کی ایک نوکرانی تھی جو اچھی کے اشمارے پر چاٹے بنائی گئی۔ پھر ایک بلیت میں ختا یاں بھی لائی جو اچلانے لگرہی ہی بنائی تھیں جن پر پستہ درادانی سے بھرا ہوا تھا۔ نوکرانی نے، موہن کو کبھی دیکھا تو نہیں، کے انداز میں دیکھا اور پھر سوتی میں کام کرنے کے لیے جعلی گئی۔

”لڑکی اچھی معلوم ہوتی ہے۔“ موہن نے خشائی مٹنے میں ڈالتے ہوئے کہا۔

”پاں“ اور اچلانے اندر کی طرف دیکھنا۔ برجوان لڑکیوں کو گھر میں رکھنا ہنسیں چاہیے۔“

”کبھی ... رکھنا کیوں ہنسیں چاہیے؟“

”کیا بتاؤں؟“ اچلا ہنس دی۔ ”روز کوئی نیا البیلاد رو انے کے پر موجود ہوتا ہے۔“

اوند پھر دونوں مل کر ہے۔ موہن نے بات شروع کی۔ ”عین بھی تو ہوں۔“

اچھی کے چہرے پر لالی درد مگری۔ نگاہیں چراتے چاٹے میں چمچ ہلاتے ہوئے بولی۔

”آپ کی بات دوسرا ہے۔“ اور پھر ایکا ایک۔ ”اب کے رام آئیں گے تو انھیں آپ سے ملوا ڈل گی، بڑے مرے کے آدمی ہیں۔“

موہن نے چھپا۔ ”اس کا مطلب ہے، اس سے پہلے نہ آؤں؟“

”ہنسیں ہنسیں“ اچلانے گھرتے ہوئے کہا۔ ”آپ جب جی چاہئے آئیں... آپ“

کا اپنا گھر ہے۔“

پھر اچلانے سوچا، دہ نیا کہہ گئی، عورت ہونا بھی ایک ہی مصیبت ہے کیوں دو ہر دقت ڈری رہتی ہے۔ کیوں اکھتی کچھ ہے مطلب، کچھ اونہ ہوتا ہے؟

اور اچلانے رام گدکری کی باتیں شروع کر دیں۔ بیسے ان سے اچھا مرد کوئی اس دنیا میں ہنسیں۔ ایک رام ایروڈسیا میں پیدا ہوئے تھے اور ایک اب عسیریں صدی میں پیدا ہوئے ہیں اور کولاہایں رہتے ہیں؛

موہن جام کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ وہ سومنڑا کی باتیں کرے۔ دو لوپ میں فاصلہ اور بھی بڑھ گیا تھا اور برابر بڑھتا جا رہا تھا۔ ان کے جانے بوجھے بغیر۔ وہ ایک دوسرے سے دور ہو کر فربیب ہونے کی کوشش کر رہے تھے۔ موہن نے بتایا۔ سومنڑا بڑی گریٹ عورت ہے لیکن اس کی صحت کی خرامی نے پوری زندگی پہ ایک عمر کی چھاپ لگا دی ہے ...

جبھی نوکرانی ہے تو پہنچتی ہوئی آئی۔۔۔ ”بائی، میں جاؤں؟“

”نہیں نہیں“ اچلانے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔۔۔ ”کپڑے دھو جا کر“

دیکھتے ہوئے غسل خانے کے پاس کتنا ڈھیر لگا ہے؟ چلو، چلو...“

اور نوکرانی مسٹھ پھلا تی ہوئی خلی گئی۔ اس کے سوا چارہ ہی کیا تھا؟

موہن بدستورہ سوترا سے بارے میں کہہ رہا تھا۔۔۔ دس سال سے جس عورت نے

نہارا ساتھ دیا ہوا سے تم صرف اس لیے چھوڑ دو کہ وہ بیمار ہے، جس نے اپنی جوانی کے بہترین سال نہاری خدمت میں رکاویے اور جس کی صحت کی خرابی کے تم ذمے دار ہو... میں تو مجھے

مجھوں نہیں سکتا...“

اور موہن کی آنکھوں میں آنسو چلنے آئے۔

اچلا کو نہ جانے کیا ہوا۔ اس میں برسوں سے دبی ہوئی کوئی چیز اُبِل پڑی۔۔۔ ”نہیں

نہیں، موہن جی“ وہ بولی۔۔۔ ”ٹھیک ہو جائیں گے“ اور پھر موہن کے ایک دسم پس پہنچتے ہوئے اس نے اپنی ساری کے پتو سے موہن کی آنکھیں پُنچھ دیں۔

موہن ایک قطعیت کے ساتھ اٹھا اور بولا۔۔۔ ”اچھا“۔۔۔ میں چلیوں گا۔۔۔

”بیٹھیے تو پکھو دیرا“ اچلانے پھر دیبا ہاتھ جملہ کہا۔

لیکن موہن نے انکار کر دیا۔ اس نے جذبی سے اپنی لکھری کی طرف دیکھا اور بولا۔۔۔

”مجھے سارے گیارہ بجے اجوانی پسپلنز میں جانا ہے۔“

اور موہن فریادی نظر دیں تے اچلا کی طرف دیکھتا۔۔۔ اچلا گیا۔

اچلا اُغٹی۔ دہ دہ رہی تھی۔ بیگڑ دوم میں جا کر اس نے اپنے سراپا کی طرف دیکھا۔۔۔

۔۔۔ بیس گاہیں سنتی۔ اسے اپنا آپا اچھا لگا۔ پھر وہ نوکرانی کے پاس پہنچی۔

”نہارا جو ہنی نہیں آیا؟“ اچلانے کہا۔

اس بات کا جواب دینے کے بجائے روزی بولی۔۔۔ ”وہ صاحب جو آئے تھے چلے

جگئے؟

”ہاں“ اچلا کو کتنی نسلی تھی۔

”تم جاہنی کے ساتھ کچھ پڑھ لی جانا“ اپنی نے کہا۔ ”تمہارے سب لوگوں سے ایکوں ہی مجھے کٹیک معلوم ہوتا ہے ...“

ادرکوزی ایکا ایکی خوش ہوا۔

اپنی سے موہن کی فالیا یا پانچویں یا چھٹی ملاقات تھی۔ اب وہ ڈبلر ماسٹر اند روسرے لوگوں کی نظر دل سے بچتی بچلتی سرہن کی گاڑی میں آبیٹھنی تھی اور دونوں شام کو ہوا خودی کے لیے نہل جاتے تھے۔

اس اثنایمیں سرہن نے سومرزا کو ہفتے میں ایک چھٹی لکھنے کی بجائے میں تین لکھنا شروع کر دیں۔ ایک چھٹی میں تونداق بھی کیا — اگر تم نہ آؤ گی تو میں کسی دوسرے سے لوگاں گا۔ اور یوں اس نے سومرزا کو بے فکر کر دیا۔

ایک شام کو پریج کے پاس سے ہوتی ہوئی گاڑی بیک ہے کے پاس انہیں سے میں کھڑی ہو گئی۔ اچلانے بھی اعتراض نہ کیا۔ آج وہ باشیں درداز سے کے ساتھ لگ کر بیٹھنے کے بجائے سیدھے کے عین بیچ میں بیٹھی تھی۔ موہن جام کے ہاتھ سیدھ پہ اپنی کے گرد تھے اور اپنی ایک ہاتھ سے نیوٹرل میں پڑے ہوئے گیئر کو فرسٹ اور سینکنڈ میں لگھا رہی تھی جسے وہ گاڑی چلانے کی کوشش کر رہی ہو۔

موہن نے اچلا کا ہاتھ لکھاں لیا۔ مزاحمت تو ایک طرف اس نے موہن کا ہاتھ دبا دیا۔ اور دونوں کچھ لمبوں کے لیے خاموش ہو گئے۔ حتیٰ کہ موہن کو کہنا پڑا —

”گدکری کب آنے والے ہیں؟“

”بھی کوئی روایت دن میں۔“

”کافرنس لمبی ہو گئی؟“

”بھگوان جانے — ان مردوں کا کیا پتہ، کسی سوتن کے سنج راس رچا رہے ہوں۔“

”کیا بات کر رہی ہو؟“ موہن نے اچھی کاماتھہ جھٹکتے ہوئے کہا۔ صدھ تو بھگوان رام بیس تھارے لیے۔

”بھگوان رام ہوتے تو سیتا کو سانچھے نے جاتے؟“

موہن نے فہستے ہوئے کہا۔ ”اب سیتا کافرنس میں تھوڑے جاسکتی ہے؟“ اور موہن نے اچھی کی بغل میں ہاتھ ڈال کر اسے کچھ اور اپنی طرف کھینچ لیا۔ اچھی نے تھوڑی سی مزاجمت کی۔ لیکن پھر جیسے خود کو ڈھیلا چھوڑ دیا۔ اس سے یوں بھی کسی آسائش کی ضرورت نہیں۔ کیونکہ جب سے گاڑی بیک بے میں آ کر انہ صیرے میں کھڑی ہوئی تھی۔ اس نے اندر رہی اندھہ کا پینا شروع کر دیا تھا۔ اس کی فسول کو کسی آرام کی ضرورت نہیں۔ اس نے انکھیں بند کرتے ہوئے اپنا سر موہن کی چھاتی پر رکھ دیا۔

موہن اچلا سے پیار کرنے ہی دالا تھا کہ ایک آدمی گاڑی کے ہاس چلا آبا اور بولا۔

”ناریل پانی۔“

”ہمیں چاہیے“ موہن نے اچلا سے الگ ہوتے ہوئے کہا۔ لیکن ناریل دا لے کو بدستور رہیں کھڑے پا کر دہ ایک دم حجلہ اٹھا۔ ”ابے کہانا — ہمیں چاہیے“ اور پھر — ”جاتا ہے یا؟ ...“ اور موہن جیسے اسے مارنے کے لیے لپکا۔

اچلانے اسے پیچھے سے پکڑا بیا۔ ”کیا کر رہے ہیں؟“ پچھے گھبرا تے اور اپنے کپڑے درست کرنے ہوئے بولی۔ ”دیکھتے ہمیں۔ اس کے ہاتھ میں چھری ہے؟“ ”ہوگی“ موہن نے بے پرواٹی کے انداز میں کہا۔

ناریل والے نے اپنی مالا باری زبان میں کچھ کہا اور چلا گیا۔ کچھ دو رنگوں کی دیوار پر بیٹھے  
ہوئے ایک آدمی نے آواز دی — "مجاکرا با بو... مجاکرا..."  
موہن تھوڑا پتھرے بٹ کر بیٹھ گیا اور اچلا سے کہنے لگا — "گھر چلتے ہیں؟"  
"کس کے گھر؟"

"میرے... تمہارے روذہ کیا وہیں ہو گی؟"

"ہیں — دہ پھر دیکھنے کیسی ہے؟ اپنے جو ہنسی کے ساتھ؟"

"تو پھر — ٹھیک ہے...!"

"ہیں ہیں" دہ بولی — "گھر پہنچیں کیا کرنا ہے؟"

درالصل اچلا کو گھر میں دہ شیشے کا کینڈٹ اور اس میں لگی ہوئی تصویریں یا دا گئی تھیں۔  
دہ تو اپنے شوہر سے بھی پیار کرنے سے پہلے بچ کا دروازہ بند کر لیا کرنی تھی۔ اس کے بعد پھر  
پہ بیٹھے ہوئے بے نکرے کی موجودگی کے احساس سے بے خبر ہو کر حب۔ ہن نے اچلا کا  
ٹھنڈا چوما تو اس میں بھلی سی خود پر دگی نہ رہی تھی .. "ہیں ہیں" اس نے خفیت سا کہا جو  
احتجاج تھا اور ہیں بھی۔ البتہ جب موہن نے ہاتھ بڑھا کر اچھی کے چھوٹے بڑے راز  
معلوم کرنے کی کوشش کی تو وہ بدک کر انگ ہو گئی۔ میہن کو بُرا س لگا۔ میں نے کچھ دیر کھہنے  
کے بعد پھر ایک بھر کوڑ حملہ کیا لیکن اچلا کسی نہایت ہی مضبوط قسمے میں مجوس ہو سمجھی تھی۔  
دہ شکا بت کے لہجے میں بولی — "ہیں ہیں" اتنا ہی بہت ہے؟"

"بے حد قوت نہ ہو، اچھی" موہن نے برا فردختہ ہو کر کہا — "ہیں تم بھی دیسی کی طرح  
پھٹتا ہوگی..."

"ہیں موہن" اچلا نے پڑے پیار سے رد ٹھکتے ہوئے کہا — "پیار کا میہن  
مغلب تھوڑے ہوتا ہے؟"  
"جو ہوتا ہے دہ سمجھادو"

”کیوں؟ ... بہن بھائی کا پیار نہیں ہوتا؟“

”ہوتا کیوں نہیں؟“ موہن نے اپنی صرفانہ خفت کو چھپاتے ہوئے کہا اور اسے اپنی بہن را دھایا پاد آئٹی جو پاریل میں رہتی تھی۔

”یہ رشتہ تو ہم ہمیشہ نہیں رکھ سکتے“ اچھی بولی۔ ”ایک دو روز میں یہ آجائیں گے ... مہینے دوڑھ مہینے میں سو مرابہن بھی لوٹ آئیں گی۔“

”ہوں“

”بہن بھائی کا پیار ہے جس میں کوئی ڈر نہیں، کوئی کھلا نہیں۔“

”ٹھیک ہے“ موہن نے اپنے ماٹھے پر سے پسینہ پوچھتے ہوئے کہا۔ آج سے میں نے تمہیں بہن کہا اور زندگی سے گارڈی چلا دی۔

”اچھی بہت ڈر گئی تھی۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے موہن کا بایال بازو لپڑ لیا اور شانے پر اپنے ہال کا خوبصورت تاج رکھتے ہوئے بولی۔“ تم تو ڈٹ گئے۔

”رُدھوں گا کیوں؟“ موہن نے کہا۔ ”بعداً بھائی بھی بہن سے روٹھ سکتا ہے؟“

اچلا نے جھٹکے سے اپنا سر موہن کے کانڈھے سے ہٹایا۔

پچھے دیر کے بعد گارڈی سینیز سدن کے سامنے کھڑی تھی۔ آج در دازہ کھولنے کے لیے موہن نے ذرا بھی جدوجہد نہ کی۔ اچلا بے دلی سے اُتری۔ سامنے کا ٹیکرہ ماسٹر غور سے ان کی طرف دیکھ رہا تھا اور آس پاس کے کچھ دو گ بھی۔ لیکن اچلا کو جیسے کوئی ڈرنہ لگ رہا تھا۔ اس نے آج موہن کا شکریہ بھی ادا نہ کیا۔ وہ بیجد متنگر تھی۔ ایسے دسو سے اور ڈر اس کے دل میں پیدا ہو گئے تھے جنہیں وہ خود بھی نہ جانتی تھی۔ اے ایک ڈر تھوڑے تھا؟۔۔۔ ہزاروں تھے جن میں سے ایک کو دوسرا سے الگ کر کے دیکھنا اور پہچاننے ممکن نہ تھا۔

”اب آؤ گے؟“ اس نے پوچھا۔

”آؤں گا، آؤں گا کیوں نہیں؟“ موہن نے کہا اور پھر ایک ادم کھلا کھلا کے میں دیا جیسے

کوئی بچے کو ڈرا تو سکتا ہے، مگر ایک حد تک، اس کے بور موہن ٹھاٹا، کہہ کر چل دیا۔ اچلا جب گھر روانی تو کسی قسم کا بوجہ اس کے سر سے اُتر چکا تھا ...

اگلے ہی روز گدکری چلے آئے۔

اچھی انھیں اٹپیش پہ لینے کمی تو یہ دیکھ کر حیران ہوئی۔ اس کے مشہرنے مونخپیں رکھ لی ہیں۔

"یہ کیا؟" اچلانے پوچھا۔

"ایسے ہی" اس کے پتی نہ ہنتے اور عاشقانہ نظر سے اپنی بیوی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "من کی موج ..."

اور پھر قلی کے سر پر سوت کیس رکھواتے، اچھی کے پاس آتے ہوئے بولے۔ "بڑی لگتی ہیں؟"

"ہنیں بڑی نہیں لگتیں۔ مگر۔۔۔ یوں معلوم ہوتا ہے جیسے میں کسی اور ہی مرد کے ساتھ جا رہی ہوں" اچلانے مسکراتے ہوئے کہا۔

رام گدکری نے چھیرا۔ "اچھا ہے نا، ایک ہی زندگی میں دو مرد دیکھے یہے!"

اس نے سوچا اچھی نہ ہے گی اور اس لطیفے سے پورا لطف اٹھائے گی یادھپ سے پہنچا پہنچتا مار کر کے گی۔ "شرم نہیں آتی؟ ... " لیکن اچلانے پوچھنا کہا۔ مٹا جیسے کسی نکر کی پرچھائیں اس کے چہرے پر سے گزرنگی۔ ایک متحبّس نگاہ سے اس نے رام کے چہرے پر دیکھا جو مونخپوں کی وجہ سے پہنچے ہے۔ بھی زیادہ بے رقت نظر آرہا تھا۔ اچلا کو لفظیں ہو گیا، کوئی ایسی دبیسی بات نہیں ہے۔ اب وہ پیار کی باتیں کر رہی تھی مگر۔۔۔ مگر رام گدکری کافرنس کا تقسیم لے بیٹھے تھے۔

گھر پہنچ کر آپھی نے اپنے پتی کو سامان بھی ٹھیک سے نہ رکھنے دیا۔ وہ ایک بچی کی طرح  
محل گئی اور اس کا ہاتھ پڑ کر گھستی ہوتی اندر بیڈر دم میں لے گئی اور اس کے نئے لگ کر زارزار  
رو نے لگی۔ رام گد کری حیران ہی تو رہ گیا۔ "ارے بگیارہ ہی دن تو لگے ہیں" یہ  
لیکن اپنی رور بھتی اے۔ محل رہی تھتی۔ اے سے لپٹاتے، دلاسا دیتے ہوئے آخر میں  
رام نے کہا۔ "مجھے کیا معنوں تھا تم اتنا ہی ڈر جادگی"

"یہ یہ سب ڈر کے مارے کر رہی ہوں؟" اچلا نے ایک دم پر سے بہتے ہوئے کہا۔  
"نہیں... پیار کے مارے" اور رام گد کری ہنس دیا۔ آجھے بڑھ کر پھر سے اپنی کو آغوش  
میں لیتتے ہوئے بولے۔ "میں جانتا ہوں اپنے... میں بھی تم سے اتنا ہی پیار کرتا ہوں" "بس؟"

"اس سے بھی زیادہ"

"جھوٹے کہیں کے... جس سے پیار کرتے تو یہ — مونخپیں رکھتے ہیں" اچلا کا خیال تھا رام نے مونخپیں کسی رذکی کی ایمخت پر رکھی ہیں۔ رام سمجھ گی۔ اے اچلا۔  
کے جذبات سے زیادہ اپنے سمجھ جانے پر خوشی تھی۔ پیار میں اس نے مخد آگے بڑھا یا تو اچلا  
نے سخن تیکھے کی طرف سوڑ لیا جس پر رام نے وعدہ کیا اگھے ہی روز دو مونخپیں دو نچپیں سب منداڑا  
ڈالے گا۔ اپنی ہی نہیں، جو بھی دکھان دے گا، اس کی بھی —

دو ایک روز کے بعد، وعدے کے مطابق موہن جام چلا آیا۔ پہلے تو اچھی چونگی۔ پھر اپنے  
آپ کو سنبھالتے ہوئے دہ اپنے تیق۔ مگد کری کی طرف پسلی اند بولی۔ "جی، میں نے آپ  
کو بتایا ہی نہیں۔ میں نے اپنا ایک بھائی بنایا ہے"

"بھائی؟... بنایا ہے؟"

"اے" اچلا کہنے لگی۔ "کیا بھائی نہیں ہوتے؟"

اور اسی طرح رام گد کری کو پڑ کر اچلا موہن جام سے ملوانے کے لیے اسے ڈرائینگ دم

ہیں لے آئی۔ دونوں مرد ایک دوسرے سے اس طرح ملے جیسے وہ ناسمجھی کے عالم میں  
ملتے ہیں۔ یہ نہیں کہ رام گدگری نے موہن جام کو ٹھیک طریقے سے اٹھایا بٹھایا نہیں یا  
اس کی مناسب خاطر مدارت نہیں کی۔ اس نے سب کچھ کیا لیکن وہ ایسے ہی تھا جیسے آدمی  
پکھ نہیں کہختا مگر کرتا چلا جانا ہے مسکراہیں بنادی تھیں، نہیں بنادی تھی ...

اور اچلاستی کہ لٹی جارہی تھی ایک بار بھائی کپھر دینے کے بعد جیسے چھپٹی ہو گئی۔ اس نے  
نہ صرف چاٹے خاتا تو غیرہ سامنے رکھیں بلکہ روزی کو بھی بازار بیج دیا۔ کچھ نمکین چیزیں لانے  
کے لیے۔ رام گدگری یہ سب برداشت کر رہا تھا لیکن ایک چیز جو اس کی سمجھ میں نہیں آ رہی  
تھی وہ یہ تھی کہ موہن جام کے ہانے پر اچلا اسے بھی بھول چکی تھی۔ جو اس کا پتی تھا، اس کے  
بھائی کا جیجا۔ اور رام گدگر، دیکھ رہا تھا کہ ایسا کرنے میں اچلا کتنی بے مس ہے۔

جب کوئی چیز لینے کے لیے اچلا اندر جاتی تو یہ مرد لگ ایک دوسرے سے سرسری طور  
پر تکلف، مخفی تکلف میں ایک آدھ چمٹدہ کہتے۔ رام گدگری کچھ کافرنس کار عدب دانے کی  
فکر میں تھے اور موہن جام اس شپ میٹ کا ذکر کر رہے تھے جو انہوں نے اب تک بھی جاپاں  
سے منگوایا تھا۔ دونوں کے فترے یعنی میں ٹوٹ ٹوٹ جاتے تھے۔

اچھی اندر سے آئی تو دوساری بدے ہوئے تھی اور سامنے کے ہالی میں بھر سے کراؤن  
بنالیا تھا اور خوشبو تو اس کے ساتھ ہی باہر پیکی آئی تھی۔

”بھائی نہیں آ میں بھائی صاحب! —؟“ اچلانے پوچھا اور پھر رام گدگری کی طرف  
منہ کرتے ہوئے بولی — ”وہ کشیر گئی ہیں ... میں ملی تو نہیں، پر منہ سے بڑی اچھی عورت  
ہیں۔“

”اچھی ہوں گی“ رام نے اتفاق کیا۔

اوہ پھر رام متوجہ سی نگاہ سے موہن جام کی طرف دیکھنے لگا۔

سب کچھ کھا چکنے اور مصافحہ کے بعد موہن جام اٹھ کر چل دیا ”میں ابھی آتی ہوں“

نہیں کر اچلا دروازے تک اسے چھوڑ لئے گئی اور بھرگسی خیال کے آنے سے وہ دروازے سے نکل کر لینڈنگ تک اور بھر بنڈنگ سے بھی نیچے چلی گئی۔ حالانکہ اس کا شوہر مہمان کو رخصت کرنے کے لیے محتوا دیر کے لیے م Gunn نکلفاً اٹھا تھا۔ یوں بھی سالے بہنوئی میں سالے کارشنہ چھوٹا ہوتا ہے!

نیچے بادار میں آنے سے پہلے موہن جام کا جی چاہا وہ اچلا سے پیار کرے۔ اچی کتنی آپی معلوم ہو رہی تھی۔ وہ صرف اس کا ہاتھ پکڑ سکا جسے اس نے کچھ پیار سے دبایا اور بولا۔  
”اچی! بھی تم بھی میرے ہاں آؤ نا۔“

”آؤں گی“ اچی نے کہا اور بھر بولی۔ ”آن کو بھی لااؤں گی“

اس کے بعد اچلا کارڈی تک چلی آئی۔ موہن جام رخصت ہوئے تو اچلا اور موہن دونیں کی انکھیں نم تھیں۔

اچلا اتنی ہی تیزی سے اور پر چلی آئی۔

رام گدکری کو اچلا نے سوچنے کا موقعہ ہی نہ دیا۔ وہ بولتی چلی گئی۔ ”دیکھ میرے بھائی صاحب؟۔۔۔ اچھے آدمی ہیں، لاکھوں میں ایک...“

رام سرپلانا گیا۔ حالانکہ اس کے مانکھے پر تیور تھے۔ یہ بیج میں خواہ مخواہ کا بھائی ہاٹپلا۔ اسکی ضرورت کیا تھی؟ کچھ اس کی سمجھی میں نہ آ رہا تھا۔ جبھی تو اس نے کہا۔ ”اگر سچ مجھ تھرا رہنا، اُبھن کا رشتہ ہے تو پھر بھائی صاحب کیوں کہتی ہو۔۔۔ بھیا جی کیوں نہیں کہتیں؟“  
”وہ یہ بھی کوئی بات ہے بھلا؟“

اور اچلا بستونڈ موہن کے گھن گاتی گئی۔ کیسے دہ دیبی کے ساتھ سیر کر رہی تھی تو کچھ موالي پیچھے لگ گئے۔ اگر موہن جام دہاں نہ آ جاتا تو جانے کیا ہوتا۔ اور اچلا کو اس رشتے کی صحت اور صفائی جتنا نے کے لیے اور بھی بہت سے چھوٹ بولنے پڑتے جن کی ضرورت نہ تھی۔ کیونکہ یہ رشتہ بھگران نے نہیں انسان نے بنایا تھا...“

اس کے بعد ایک دوبار پھر موہن جام آیا اور اچلا اسی طرح سے بے اختیار اور بے خود پکی جپی۔ موہن جام کے چلے جانے کے بعد رام مگر کری دیر تک خاموش بیٹھے رہے۔ حتیٰ کہ اپنی خاموشی انہیں خود ہی ناگوار سی محسوس ہونے لگی۔ سا منے طاق پہ ٹرانسٹر پڑا ہوا نہ تھا۔ جس کی سعی گھماتے ہوئے رام نے اچیست کہا —

”جانتی ہو ٹرانسٹر کسے کہتے ہیں؟“

”بھی جو سامنے پڑا ہے۔“

”نہیں۔“ رام نے خلکی اور کچھ مسکراہٹ کے ملے ملے جذبات میں کہا۔ ”سڑک بہن کو گھستے ہیں اور ٹرانسٹروہ بہن ہوتی ہے جو سکی نہ ہو۔ ایسے ہی بھائی سے میں لے کر بھائی ہو ... اسی لئے تم شور بھی مچاتی ہو۔“

اچلا او بہت غصتہ آیا۔ ”کیا مطلب؟ ... آپ بہن اور بھائی کے رشتے پر شک کرتے ہیں؟ اس کا مذاق اڑاتے ہیں؟“

”میرا مطلب ہے ...“

”میں سب جانتی ہوں۔“ اچی نے ہانپتے ہوئے کہا۔ ”تم مرد لوگ سب کہیں ہو، تمہاری نظر دل میں کوٹ کوٹ کر غلامت بھری ہے ... کیا دنیا میں مرد عورت، پتی پتی میں کرہی مل سکتے ہیں؟ کیا سنوار میں ...“ اور اچی کا جھلا بھر آیا۔ وہ روئی ہوئی کی بنیٹ کے سامنے بھگوان کی تصویر کے پاس جا کر دوز انو ہو گئی اور دہائی دینے لگی۔ ”میں نے کوئی بھی پاپ کیا ہو بھگوان، تو میرے شریر میں کیڑے پڑیں۔ کوڑھ لوگ جائے ...“

رام اب بچپتا نے لگا تھا۔ پھر بھگوان کی سند تھی۔ اس نے ہیچھے سے آکر اچلا کو دل کا نہ صول سے پکڑ کر اٹھایا۔ لیکن اچلا نے اس زور سے جھٹک دیا کہ رام دیوار سے جا لگا۔ سر پر ہمولی سی چوٹ بھی گئی۔ اچلا اتنی سند رست تھی کہ رام مگر کری ایسے اکھر سے بدن دالے آدمی کا اسے سنبھالنا مشکل تھا۔ پھر وہ اندر جا گئا اپنے آپ کا لبسز پر گر اگر زور زور سے روئے لگی۔

رام اب بہت پچھتا رہا تھا اور آپ جانتے ہیں پچھتا تے ہوئے مرد کی کیا شکل  
ہوتی ہے؟ رام کی ساری شام اچھی کو منانے میں لگی۔ حالانکہ وہ برلامتو شری سجا گھر میں  
دائمیت حسین کی ستار سننے کے لیے جانے والا تھا اور اچلا کے لیے مکٹ بھی خرید کر لایا تھا۔  
جواب اس نے حسین ملک غصیلی بیوی کے سامنے پھاڑ کر پھینک دیا۔ پھر وہ وہیں لبستر پر پڑی  
گھر کی۔ س ستار کی کمر میں باز دال کر اس کے تار درست کرنے لگا۔ چونکہ امتاد آدمی نہ تھا۔  
اس لیے ایسا بھی مُسرِ ہمیک، نہ ملکا۔ آخر اس نے کہا بھی تو صرف اتنا — "میں تم پر  
اتناسا بھی شک کروں، اپنے تو گائے کھاؤں، میں تو صرف یہ کہتا ہوں، تمہارے اپنے  
بھائی بھی تو ہیں..."

"لہاں ہیں؟... اچلا بولی — "ایک لگنٹہ میں مجھا ہے، دوسرا بجاڑے  
میں"

"پچھواڑے میں بھائی نہ ہونا ضروری ہے؟"  
"ہاں، ضروری ہے۔" اچھی نے سر کو ایک فیصلہ گن جھپٹ کا دینے ہوئے کہا "کوئی  
تو ہو، تم سے پوچھنے والا..." رام گدگری پھر بھی پچھنا سمجھنا۔ بڑی مرکملی سی آواز میں اس نے  
کہا — "تمہاری مرضی، لیکن میں تو سمجھتا ہوں، اس کی کوئی ضرورت نہیں"  
"تمہیں موچھیں رکھنے کی کیا ضرورت تھی؟"

ہمینے ڈیڑھ کے بعد سومترا چلی آئی۔

سومترا پہلے سے واقعی اچھی معلوم ہو رہی تھی۔ پچھلے کی بھی صحت پہلے سے اچھی  
سمتی۔ وہ کاشمیری زبان کے چند لفظ لیکھ آیا تھا جسے جا اور بے جا طور پر استعمال کرتا رہتا  
تھا۔ سومترابار بala سے پکڑ کر کہتا — ڈیڑھی کو یہ سنا د، ڈیڑھی کو ہے سنا د۔ لیکن وہ بدمعاشر

مُہری رملے ہوئے فقرے مُہرا تا۔ بھا۔ میں پتہ چلا کہ وہ کاشمیری دہان کی گندی گالیاں تھیں  
موہن جام نے اچلا کی سی حماقت نہ کی۔ سو مرزا سے اچلا کی ملاقات کرو، نے سے  
بہت پہلے اس نے کہہ دیا۔ اس نے ایک بہن بنائی ہے۔

سو مرزا سنتی رہی۔ اسے اپنے موہن پر پورا بھروسہ نہ کفا؟ نہیں... وہ ان عورتوں  
میں سے تھی جو مرد کے لآبائی پن سے محبت کرنی ہیں اور یا ان کی صحت اس غایت درجے کی  
خراب ہوتی ہے کہ وہ محبت کے تقاضوں کو تُورا نہیں کر سکتیں اور زندگی کو ہر حالت میں  
موت پر تزییں دیتی ہوئی کچھ ایسے فقرے کہتی ہیں۔۔۔ جبکہ ماں تھے ہیں تو مارے تے  
پھریں "ادر پھر... " بھگوان کر جواب انہیں دینا ہے، مجھے تو نہیں دینا۔"

آخر رات کو چکچکے میں ایسی آواز میں رفتی ہیں جو انہیں خود بھی سنائی نہیں دیتی۔  
سو مرزا نے کہا بھی تو صرف اتنا۔۔۔ صردارت کیا تھی؟ نہ تھاری اپنی ہیں جو تھی۔  
اس پر نچادر کر دا پنا پیارہ... یا ایسی ہی کوئی پیار کی باڑھ آئی ہے؟  
"ہاں" موہن نے قدر سے درستی سے کہا۔

سو مرزا ادب گئی صحت تو خراب ہونا ہی تھی، ابھی سے کیوں شروع ہو؟ اس نے  
جواب کے سے انداز میں سوال کیا۔۔۔ "زادہ اکبی ہے؟"  
"میں تو اس سے طلاق نہیں؟"

"ہائے رام۔۔۔ جب سے میں گئی ہوں؟ اپنی بہن سے بھی نہیں ملے؟"  
"وقت نہیں بلہ"

"اردوہ خود بھی نہیں آئے؟۔۔۔ رادھا اور کیلاش پتی؟"

"ہے تھے، تین چار بار۔۔۔ لیکن میں ہی گھر پہنچتا"

سو مرزا کہتا چاہتی تھی۔۔۔ ملتے بھی کیسے؟ دو تو سکی بہن تھی، بہائی ہوئی مختومی تھی؟  
لیکن اس نے کچھ مدد کہا اس کی صحت ابھی بہت اچھی نہ تھی:

ادر پھر موہن جام نے جو کہہ دیا ۔۔۔ ”چو میں کو رکھتا بندھن کا نبتو بارہئے جادل گا اور میں آڈل گا ۔۔۔“

رکھتا بندھن کے دن موہن جام پاریل اپنی ہیں لادھا کے ہاں پہنچا۔ ساتھ سوترا بھی تھی۔ لادھا یوں پر بھیلا کر پیکی جیسے برسوں کے بعد ملی ہر ۱ سے اس بات کا احساس بھی نہ تھا کہ وہ عورت ہے اور نہ موہن کو اپنے مرد ہونے کا پتہ تھا۔ اس نے رادھا کو ٹھال سے چوم لیا، پھر سر پیار سے ہاتھ پھیرا۔ اور ہیں کی آنکھوں سے نکایت کے نسرو پوچھے۔ پچھہ بیرون بعد رادھا بڑے مرنے سے اٹھی اور لکڑی کی جالی میں سے مٹھائی کی طشتہ اٹھائی۔ پھر چوکی سا نئے رکھ کر بھائی کو بھجا بیا۔ اس کا منہ پورب کی طرف کیا۔ جا جو، موہن کا بچہ بھی ساتھ دوسری چوکی رکھ کر بیٹھ گیا۔ جیسے اشتمی کا لینکڑا ۔۔۔

”اے! رادھا نے جا جو کی طرف دیکھتے ہوئے کہا ۔۔۔ پہلے تو راکھی بن چوا ہے گا؟“

”بان!“ جا جو نے گھڑا سا سر ٹھلایا۔

”پہلے تو میں اپنے بھائی کو باندھ دیں گی۔“

”نهیں، پہلے بیرے باندھو۔“

”ایسا سی حکم چلانے ہے“ رادھا پیار سے بولی ”تو تھگوں سے کہہ تجھے بھی ایک بہن لا دیں، چھوٹی سی۔ جو ہر سال راکھی بالدھا کرے۔“

اور ایسا کہنے میں جا جو، موہن اور کیلاش بھتی، تینوں نے سوترا کی طرف دیکھا جس نے شرما کر منہ ساری میں چھپا لیا۔

رادھا نے موہن بھیا کی کلائی پہ سادہ سی مولی کی راکھی باندھی۔ منہ میں میٹھے کا ایک مکڑا ڈالا۔ موہن نے جیب سے دش روپے کا ایک نوٹ نکالا اور رادھا کی ہتھیلی پر رکھ دیا۔ رادھا نے اس کا نوٹ اپنی آنکھوں سے لگایا اور پر ارتھنا کی ۔۔۔ یہ دن ہر ہیں کے لیے آئے مسجدوں! ۔۔۔ اور اس کی آنکھیں میں پیار، در عفیض مسلمانی تھیں۔

سومرا اور پتھے کو گھر جھپڑ کر موہن جام اچلا کے ہاں جانے کے لیے نکلا۔ وہ سومرا کو بعد میں کبھی لے جانا چاہتا تھا، اس روز ہنسیں۔ اس کی کوئی خاص وجہ تھی۔ عورتیں کئی بازوں میں مردوں کو خواہ روکتی رہتی ہیں — یہ کہ دہنہ کرد، ... جیسے عورتوں کی بہت سی باتیں مردوں کی سمجھ میں ہنسیں آتیں اسی طرح مردوں کی بعض باتیں عورتوں کے پتلے ہنسیں ٹرتیں۔ موہن بازار میں ایک کپڑے کی دوکان پہنچ گیا۔ پہت پچھے الٹ پلٹ کرنے کے بعد اسے بنارس کی ایک ساری ملی جس پہنچی ہلکی زردوڑی کی گئی تھی۔ اس پہنچی اس کی قیمت سو ایکس روپے ملے ہوئے۔ موہن نے پہنچے دیے۔ ساری کو ایک خوبصورت سے گفت پلیر میں بندھوا یا اور کادوے پر کے سنبھیہ سدن کے لیے چل نکلا۔

چلا اپنے گھر میں بیٹھی تیجی ہاتھ میں لیے کچھ کنز بیونت کر رہی تھی جو صحیح ہی سے ختم نہ ہوئی تھی۔ رام گدگری کھڑکی میں کھڑا یونہی بازار میں لوگوں کو دیکھ رہا تھا اور نیچے ٹیکر ماٹر کی دوکان پر آتے جاتے ہر آدمی کے سر پر اپنے سکریٹ کا گل جھاٹنے کی کوشش کر رہا تھا جبھی سامنے موہن جام کی کار آ کر رکی۔

”بچھے ہستے ہوئے رام گدگری نے آواز دی — ”اچی“  
”جی“ اچی نے بڑی سٹھاس سے جواب دیا۔

”وہ آیا ہے“

”کون وہ — ؟ بھیا جی ؟ ...“

”بھیا جی ہنسیں ... مچلا“

”مچلا؟“

”ہاں — تو اچلا ہے نا اند دہ مچلا —“

جب تک موہن مدد از نے پے آچکا تھا، گھنٹی بجا چکا تھا، روزہ دروازہ کھول چکی  
تھی،

رام گدکری کا خیال تھا کہ موہن اس دن ہنس آئے گا اگر وہ را کمی بندھوانے کے لیے  
آگیا تو پھر وہ کوئی گڑ بڑا نہیں کر سکتا۔ پھر تو سب ٹھیک ہے اور موہن آگیا تھا جس کے لیے  
اپنی صحیحی سے کلا بتوں اور جملل اور نہ جانے کن کن چیزوں سے ایک خوبصورت را کمی بنانی  
ہے تھی۔ رادھا کی غربی بانہ، موہل کی را کمی تو موہن نے انار کر کہیں پھینک دی تھی اور اب —  
اس کی کلائی پر کچھ بھی نہ تھا۔ موہن کے آتے ہی اچھا ہمیشہ کی طرح بوکھلا کر اٹھی اور بھاگ کر  
ڈرائیور دم میں چلی آئی اور اس کی یوں آدم بھگت کی جیسے کوئی راجا کی کرتا ہے۔  
رام گدکری ہمیشہ کی طرح سمجھ رہا تھا اور نہیں بھی سمجھ رہا تھا۔

لکھوڑی ہی دیر میں موہن جام پورب کی طرف منہ کیسے پڑھی پہ بیٹھا تھا اور گدکری کچھ  
پرے بے انتہائی سے اس منظر کو دیکھ رہا تھا۔

جمی اچلا آئی۔ وہ بہت چست قیص اور شلوار پہنے ہوئے تھی۔ گھٹے میں پیاز کے چھلکے  
کی طرح کا ایک روپ تھا جس نے اپنی کے گھٹے اور سینے کو صحت کا رنگ دے دیا تھا۔ قیص نے  
چھاتی، کمر اور نعلے حصے کی بہت بھی خوبصورتی بینے بیان کر کمی نہیں۔ اس کے ہاتھ میں مغلی  
منہی جس پر رکھی ہوئی مٹھائی پر سونے کے درق کا نپ رہے تھے اور اس کے ایک طرف  
را کمی منہی جس کی جملل میں کچھ سچے موتی ٹنکے ہوئے تھے —

موہن نے بڑی سہلت سے ہاتھ بڑھایا۔ اچلانے جب موہن کی کھلائی پر را کمی باندھنا  
شردع کی تو رام گدکرنی کو اس کے ہاتھ خوشی سے کاپتے ہوئے دکھائی دیے۔ پھر موہن نے  
مٹھائی کے نکڑے کے لیے منہ کھولا اور اچلانے اس میں قلاف درکھ دی۔ جمی موہن نے  
گفت پیپر کھولا اور اس میں سے ساری نکالی، اس پر سور و پے کا نوٹ رکھا اور دونوں چیزوں  
اچلانکی طرف بڑھا دیں۔

رام گد کری کی آنکھیں تھوڑی دیر کے لیے پھیلیں اور پرستی میں کسی ہو گئیں۔

رکشا کی سر سر ادا کرنے میں اچلا بھی خاموش تھی اور موہن بھی۔ دونوں کے بدن میں ایکاں کیسی ہاتھ چھو جانے سے ایک بھلی سی دلٹ گئی۔ پھر اچلانے دھیمی سی آواز میں کہا ”یہ دن بار بار آئے سمجھو ان“... اور جب موہن نے اچلا کی آنکھوں میں دیکھا تو ان میں حیا کی سُرخی تھی ...

کچھ دیر بعد یونہی سی گفتگو کے بعد موہن نے رام گد کری سے ہاتھ ملا�ا۔ اچلا سے نستے کی اور چل دیا۔ دو اوازے کی طرف بڑھتے ہوئے اس نے ایک آہ بھری اور چل دیا۔ اچلا سہیشہ کی طرح اسے نیچے چھوڑنے کے لیے جانا چاہتی تھی، لیکن آج — اس کے پیرواب دے گئے تھے۔

”تمہیں خوش ہونا چاہیے، اچی“ رام نے کہا ... ”بھائی کو راکھی باندھی ہے؟“

”ماں!“ اچی نے کہا — ”پر آج صحیح ہی سے میری طبیعت کچھ ...“

”صحیح ہی سے تو یہ سب بناتی رہی ہو۔ آنٹھا کرتی رہی ہو:“

اچلا نے سر ملا دیا۔ رام نے آگے بڑھ کر کہا — ”میں تو سمجھتا تھا تم اپنے بھائی کی دی ہوئی ساری ہیں کر مجھے دکھاؤ گی:“

اچی نے کوئی جواب نہ دیا۔ اس کی آنکھیں بند سی ہوتے دیکھ کر رام گد کری نے آگے بڑھ کر اسے نفام لیا اور بڑے پیارے سے بولا — ”کیا ہو گیا میری اچی کو؟“

”کچھ نہیں“ اچی نے ایک دھیمی سی آواز میں کہا اور پھر اپنا بازو رام کے گرد ڈالنے ہوئے بولی — ”مجھ سے پیار کرو یا“

رام نے اچی کو سینے سے لپٹا لیا اور سمجھنے لگا۔

”اوہ“... اچی نے کہا۔

اس کے بعد اچی کی آنکھیں بند رہیں، اور منہ کھلا ہوا... جب تک موہن جامِ اچلا

۱۸۹

اور رام گدگری کے خیالوں سے بھی پرے جا چکا تھا ...

---

# حِجَّامُ الْهَاوَادِكَ

میں جہاں ڈائیک پر کھڑا ہوں، یہاں سے نثارہ بہت خوبصورت ہے ... یہ گدیلِ گھنما،  
دہنیلی جتنا، اور بیچ میں کہیں سرستی مانی ہے، جو آج تک کسی کو نظر نہیں آئی ہے۔ ہم اسی تینیں دریافت  
کو ترجیحی کرتے ہیں اور جی میں آئے تو ان کے ملاپ کی وجہ سے اسے سنگم بھی کہہ ڈالتے ہیں ہر دو مرد  
کی بات ہے ...

یہ سنگم لپیٹ اور بھی بہت سے کام آتا ہے لیکن کسی مرے ہوئے لیڈر کی ٹہیاں بہانے کے  
لیے بہت بھی اچھا ہے۔ یہ قلعہ جو آپ دیکھ رہے ہیں محل شہنشاہ اکبر نے بنوا�ا تھا۔ اس کی نگاہ کتنی  
دُور رہ تھی گویا دو صدیوں پہلے جانا تھا کہ چین کی طرف سے حملہ ہو گا تو یہاں سینچنے پہنچنے توڑک ہی  
جائے گا۔ پچھلے دریاروک میں گئے رہا سہایہ قلعہ روک لے گا۔ ہبھی وجہ ہے کہ جمنا کا پانی آج تک اس  
قلعہ کے پیر دھو دھو کر پھیتا ہے —

تیچھے الہ آباد کا شہر ہے۔ نہ معلوم اسے کس فقیر کی دعائیگ کھٹی کہ ہر سل لکھتا اور جمنا میں باڑھ آنے پر بھی یہ نہیں ڈُ دلتا۔ دارالگنج کے آس پاس کچھ جھوپڑیاں اکھوپتے مکان ہیں جن کی بُلی دے کر کپڑے سے اپنے پاؤں پر کھڑا ہو جاتا ہے، جیسے کوئی زچہ چھٹی نہا کر اٹھکھڑی ہوتی ہے۔ آج شہر پر کوئی دُ صندسی چھائی ہے یا شاید لوگوں کی آہوں کا دصریں ہے۔ خذلکہ سردہری جسے اور پر نہیں اٹھنے دیتی۔ نیچے زمین رد کرتی ہے، اور پر آسمان ٹوکتا ہے توگ بڑی خوشی سے گھٹ گھٹ جانے والی ان آہوں کو کپڑے سے سانس بنانے کا استعمال کرتے ہیں۔

ڈُ دُ بائیں طرف الہ آباد کا نیا اسٹیشن ہے جو کبھی کے موقع پر آنے والے مہیما ریاتریوں کے لیے بزا یا گیا اور جس پر ہماری سرکار کے لاکھوں روپے لگتے ہیں۔ کوئی فرد ری نہیں، اس اسٹیشن پر صرف جاتری لوگ ہی اتریں۔ ہم اور آپ بھی اتر پڑیں تو کوئی نہیں روکتا۔ یہ لوک طبع ہے نا۔ جسے سا بھی داد کی پوٹ لگلی ہے۔ جیسے بھائی کو سنکھیتے کی پوٹ مکاڈی جائے تو وہ اور بھی تیز ہو جاتی ہے۔ اسی طبع ہمارا یہ لوک راج اور بھی نشہ آور ہو گیا ہے۔ اسٹیشن کے تیچھے سول لامنز کا علاقہ ہے جسے بناتو انگریز گیا، استعمال ہم کر رہے ہیں۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ اس میں شرمنکی کوئی بات نہیں اس نے ایک گرجا بھی بزا یا جو بہت پکتا ہے؟ محل صدی میں چھاؤنی کے جتنے انگریز افسروں نے ان کی روچیں اب تک اس گرجے میں عبادت کرنے آئی ہیں اور خدا سے دعا کرتی ہیں کہ انہیں ہشت کے عیش و آرام سے چھپکا را دروازہ کر، ایک بارہ بھر الہ آباد کی چھاؤنی میں بیٹھ دے۔ ... تو گو باہر شام پہاں پڑانا اللہ آباد اتیل میں سر بائیٹے منہ کو گھوڑی میں دبائے، اس نئے مرودن اللہ آباد سے گھٹے ٹلنے چلا آتا ہے اور کافی پاد سکری کر کبھی مولوی کی طرح چوری کی مرغی بغل میں دبائے، کہیں بھی نکل جاتا ہے۔

میں — تیچھے الہ آباد ہی کا سمجھو۔ یوں میں بیلہ لکھی کھڑ ہنے والا ہوں جو یہاں سے پچاہ سائٹہ میں پرے ایک چھوٹا سا گاؤں ہے۔ بر سوں پہلے، ایک اپر بُڈھے نے بیٹھے بیٹھے منڈ ہیں بٹ ڈالی، سینیکڑہیں ہی رہ پئے بنائے لیکن سب کے سب میری پڑھائی پر ڈبو دیئے۔ خود تو اندر حا

ہو گیا پر مجھے دکھنے لگا۔ یہ کلام اچھر جو ہمارے دلیں کے بہت سے لوگوں کو مجھیں برابر معلوم ہوتا ہے، مجھے بخوبی پڑیا نظر آتا ہے۔

میں اس الٹی طرف بمردوں کے پرائی اڈے پر کلرکی کرتا ہوں... دس بجے مجھے دفتر پہنچنا ہے۔ لیٹ ہو گیا تو میرا سیکشن اچارج بہت خفا ہو گا۔ وہ بیحد نر دس آدمی ہے اور بلڈ پر لیٹر کام ریفن۔ مجھے اپنا تو کچھ نہیں، البتہ مجھے گالی دیتے ہوئے وہ کانپا، منہ پر جھاگ لایا، اور گر گیا تو پھر — میرا کیا ہو گا؟ لیکن، خیر... کوئی ہات نہیں، ابھی بہت ٹائم ہے۔ پھر جام لوک پتی کے گاہک بھی رہیرے دھیرے کم ہوتے جا رہے ہیں... .

ہاں تو، وہاں بمردوں کے ہوائی اڈے پر جب میں آفس کے کیمین میں بیٹھتا ہوں تو کفرک سے مجھے ہوائی جہاز اترتے چڑھتے دکھائی دیتے ہیں۔ ان وے چھوٹا ہونے کی وجہ سے بڑا جیٹ ہوائی جہاز تو کوئی نہیں آتا۔ البتہ چھوٹے چھوٹے ہیں بھنپٹ سے بیسیوں آتے ہیں جیسے سیل چڑھتے غسل خانے میں ریت سکھی اپنے آپ پیدا ہو جاتی ہے۔ ایسے ہی یہ جہاز ایکا ایکی آسمان کے کسی کونے سے ڈپ پڑتے ہیں۔ اگرچہ وہ سب چھوٹے ہیں لیکن آدمی ان میں سے بڑے اترنے ہیں کبھی کبھی سانپوں، رسہ، چھالنے والے سمنداریوں، ہاتھیوں، راجاؤں، چبارا جاؤں اور نائگھاسادھوؤں کی تلاش میں باہر سے ٹوڑتے بھی آ جاتے ہیں اور ہمیں اتنا سکھی دیکھ کر بڑے دکھی ہوتے ہیں۔ میں، میرا نعلق باہر کی دُنیا سے صرف اتنا ہی ہے اور یا پھر میں اخبار لیڈر پڑھوالتا ہوں۔

اب لوک پتی زیادتی کر رہا ہے۔ دیکھتے مجھے ادھ منڈا چھوڑ کر اس نے ایک اور گاہک کو پکڑ لیا۔ میں اس کی طرف نظروں کے ہاتھ جوڑنے پوئے کہتا ہوں: ”ریا کرد، لوک پتی!... میری حالت پر نہ سکھاؤ۔“

”ابھی لو بیوا“ لوک پتی کہتا ہے۔ ”ابھی پٹا سے سب صفا چٹ ہوا جانا ہے۔“ ادا پسے اترے سے وہ گاہک کے چہرے پر دُو ایک خل جھوڑت سے خط بنادیتا ہے جبھی

دہ ایک اور مکاہب کو کپڑا لیتا ہے جو میری طرح چلتا ہے ...  
”نجھے دفتر جانا ہے“

”سمحون کو جانا، ببا، سمحون کو جانے ہے“

اول لوگ پتی کی آدازیں ہار سے مل جلی، ایک فلسفیانہ سی جیت ہے جس کی بنیاد ہمارے  
حیاتیوں کے پرنسپ نے گرفتاریوں اور شاستریوں پر قائم ہے معلوم ہوتا ہے اس وقت وہ میرے  
دفتر کی نہیں، بھگوان کے گھر کی بات کر رہا ہے۔ مرکر جہاں — سمحون کو جانے ہے!  
سو آنٹھ ہو گئے ... زندگی بنتی جا رہی ہے، دفتر بنتا جا رہا ہے ... یہاں سے گھر  
گھر سے دفتر، دفتر سے شمشان ... نجھ میں اذل ہی سے تھکی ہاری بیوی سے محپٹ ...  
مار کے بجائے کھانا لھانا ... کھانا بھی وہ جو پکار پکار کے کہہ رہا ہے کھانہ، کھانہ ...  
سوائے گو دے کے بچے کے باقی کے سب یا تو اسکوں جا چکے ہوں گے اور یا باہر مٹی میں مُل رہے  
ہوں گے۔ بیس تو کہتا ہوں ذلیل ہی جائیں تو اچھا ہے ... اسے ہاں ایک بات تو آپ کو بنائی  
بی نہیں۔ بیس جو اہر نگر میں رہتا ہوں جسے بننے بہت عرصہ نہیں ہوا۔ اس لیے سارے کا  
سار انگر دھوول اور مٹی سے اٹھے۔ بیس مٹی کو بہت پسند کرتا ہوں۔ ایک تو، اس لیے کہ میرا اور  
آپ کا، سب کا خمیر مٹی سے ٹھاکا گیا ہے اور دوسرے اس لیے کہ جب تک کسی بچے کو مٹی  
کا چمپن نہ ملنے والا پتھا ہی نہیں۔ بیس بیس روپیہ پانے والے ٹروشنوں پر جینے والے  
اسکوں کے ٹھپر اس بات کے مہتو کو کیا سمجھیں؟ فرا کبھی بچے کے کپڑوں پر مٹی دیکھی، اللہ ماں کے  
پاس نجھ بیا جو پہلے ہی گردھ دتی ہے۔ عورتوں کی زبان میں ”اُس کی وہ تو پا جائے سے بھی  
چھو جائے تو پیٹ پو جاتا ہے“

نجھے داشیک بھی بُغُر بُجُری ہے یا شاپر دفتر سے لیٹ ہو جانے کا درجے جس کے کارن  
زمیں پاؤں تکے سے سر کرتی، ہونی نظر نہیں ہے۔ معلوم ہوتا ہے جیسے رسول پہنچنے، مکبھو کے میں  
پہ جو سینکڑوں ہزاروں لوگوں سے پیش کیا گیا اور اب

منوں ہی کو سر پر سے ہٹاتنے کی کوشش کر رہا ہے۔ مس رہے ہو؟...  
معلوم نہیں ہوتا جیسے دُور، نیچے سے ایک کوس کی آواز آرہی ہے "آہستہ چل، ہو سکے  
تو چل، ہی مت — تیرے قدموں کے نیچے ہزار جانیں ہیں..."

لوگ جیسے پاتال سے نکلنے کا جتن کر رہے ہیں۔ قلعے کے اندر چہاں اور پر بند رہیں،  
نیچے مندر ہیں۔ کوئی کرشن جی کا، کوئی ہبابر جی کا اور کوئی کالی مائی کا۔ وہ سب قلعے میں،  
زمیں کے نیچے کچھ ٹوں دبے ہوئے ہیں کہ ان کے اندر جانے سے بھی ڈر آتا ہے۔ لیکن  
اگر انسان آسمان کو تھوڑی لگا سکتا ہے، چنان ستارے سے گھلے مل سکتا ہے تو کیا نیچے  
پانل تک ہی نہیں ہیچ سکتا؟ اس گائے کے سینگوں کو نہیں چھو سکتا جو صدیوں سے  
ہماری اس دھرتی کا بوجھ اٹھاتے کھڑی ہے اور وہ بھی ایک سینگ پر، جس کے کارن  
ہماری زمین سورج کے گرد ڈیڑھی گھومتی ہے اور بیکار کے موسم بناتی رہتی ہے۔ آج پوس  
پڑ رہی ہے۔ کل جلس دینے والی تو چل رہی ہے — ابھی بارش سے برباد ہو رہتے پھر  
اڑنگنے سے مر رہے ہیں... اب کے جو لوگ پاتال سے آئے ہیں، عجیب سی خبر لائے  
ہیں، ان کا کہنا ہے گائے بس سینگ بد لئے ہی دالی ہے جس سے ساری دنیا پل جائے گی  
رب تھنخیں ہو جائے گا — نیچے کا اور پر کا نیچے، دامیں کا بامیں... دیر تک نہیں  
کاپتی رہے گی اور آخر تھم جائے گی اور صدیوں تک تھمی رہے گی۔ پھر گائے اسی وقت  
سینگ بدے گی جب سامن اتنی ترقی کر جائے گی کہ ہل دھرتی پر چلنے کی بجائے دھرتی  
ہل پر چلنے لگے گی۔ عورت کے پیٹ میں خالی ہوارہ جائے گی اور مرد کے پیٹ میں بچپہ۔  
لوک پتی کا نیا گاہک چلا رہا ہے۔ بات یہ ہے اس نئے گاہک کی محاجمت شروع  
کر کے اس کے چہرے پر تین چار خوبصورت سے خط لگا کر، لوک پتی نے اس غریب کو بھی  
نیچ ہی میں چھوڑ دیا ہے اور ایک نئے گاہک کو پکڑ لیا ہے۔ اب وہ پہلا گاہک لوک پتی  
سے لڑا رہا ہے، اسے گالی دے رہا ہے... اسے! یہ کیا ہوا؟ دہائی لاث صاحبی...  
...

وہ پہلا گاہک پچھے سے چل دیا۔ وہ... میری طرف آ رہا ہے!  
میں — اسے جانتا ہوں...  
”اگر بے... مگر سین...“

”ہاں“ جل نوری! — تو یہاں کیسے؟ ”وہ مجھے دیکھتے ہوئے کہتا ہے...  
یوں میرا نام بیغان چند ہے لیکن میرے دیجی ٹرین ہونے کی وجہ سے وہ سہیشہ مجھے جل نوری  
ہی کہہ کر پکارتا ہے اور میں بھی اسے نہیں بتاتا کہ جل نوری اصل میں محفلی کو کہتے ہیں جو ان  
سے بنی ہوتی ہے۔ الگ رو ہو اور کتنا ہو تو اس میں پھر نام کے لیے ریڑھ علکا ڈی ہوتی ہے۔  
اور اگر کہیں میری طرح کی ٹراؤٹ ہو تو ریڑھ کی ٹھیک ہوتی ہی نہیں۔ پھر مجھے جل نوری مکارنے  
کی ایسا اور وجہ بھی نہیں۔ پچھلے چنائیں میں نے کانگریں کو دوٹ دیا تھا۔ آج تو وہ لوک ہی  
پہنچا تھا، درستہ سہیشہ دہ مجھے ماں ہن کی یہ موٹی موٹی گالیاں دیا کرتا ہے، میرا بڑا ابڑا ہے!  
میں کہتا ہوں — ”بھلو میں تو اشتان کرنے آیا تھا، سرچا حجاجت ہی کیوں نہ  
بناتا جاؤ؟ اپنا اُسترا ذرا کن پوگیا... کوئی سلتی ہی نہیں ملتی اسے لگانے، یقین کرنے کے  
لیے“

”تم بھی سیفیٹی استعمال نہیں کرتے؟“ اگر مجھے سے پوچھتا ہے۔  
”آں ہاں...“ میں کہتا ہوں: ”سیفیٹی کے ساتھ مزا نہیں آتا۔“  
”لُف“ اگر سر ہلاتے ہوئے کہتا ہے: ”یہ ہم ایسے ان سائنسیں لوگوں پری کی وجہ  
سے ہے جو اور بیویں کو اور اُصردیں بھر کو مصیبت پڑی ہوئی ہے۔ خواہ مخواہ کی دن  
دُنیٰ رات چوگنی، ترقی ہوتی جا رہی ہے۔“  
”تو پھر کیا کرنا چاہیے؟“

”تمہارے اور میرے جیسے لوگوں کو تو ختی کر دینا چاہیے... اس سے تو اچھا ہے  
حجامت کے لیے دہاں، سیلوں پلے جایا کرو۔“

”ذبھیا ہے میں کہتا ہوں۔ سیلک مہنگا پتہ تھے۔ لگر ہی اچھا ہے۔ تو آج ان کے چکر میں کیسے پڑ گیا؟“

”مکیا ہادیل یار؟“ مگر دار حی کے ان کے حصے پر ہاتھ پھیرنے ہوئے کہتا ہے۔

”سو نا تھے میرے مو ساد بینا نا تھا آئے تھے۔ کہنے لئے سنگم پر پہا میں گے۔

میں نے کہا۔ ”نہایتے، میرا کیا جاتا ہے؟ جب تک میں حجامت بزاںوں کا... اور یوں ہیں ان کیزوں کے چکر میں پھنس گیا۔“

اور میں اگر سین کی طرف رکھ کر ملتا ہوں۔ لوک پتی نے اس کے چہرے پر کیا خوبصورت ڈاک بٹکھہ بنادیا ہے لیکن کہ مکان بھی ہے اور لان بھی ہے۔ ایک طرف سفیدی روسری طرف سیاہی۔ معلوم ہوتا ہے، اپنے ہی ساتھ منہ کا لا کیا ہے... اور پھر لیا ایک میری فہری بند ہو جاتی ہے۔ میں بھی تو ایسا ہی جو دم لگدیا ہوں۔ اگر سین کہیں منہ نہیں رکھا سکتا تو میں بھی ورنہ میں جا سکتا۔

ایک ہمدردی کی نظر سے اگر سین کی طرف رکھتے ہوئے میں اپنی بائیں اس کے گرد ڈھل دیتا ہوں۔ کوئی بات نہیں، و دست بازندگی میں ایسا بھی ہو جاتا ہے۔ ”دنگی کی لکھتی ہی“ اگر سین ایک دم کا گبولا ہو کر کہتا ہے۔ بجا تھے اس بات کے کہ اس کی تسلی ہو سی ہمددی کے انداز اس کی جلوتی پر تسلی کا کام کر جانتے ہیں اور وہ گایاں جو اگر مجھے دیکھتا تھا، حجامت کو دینے لگتا ہے۔ ”مُن کی... ہر بات میں نفع خوری! اس نے پُندے ملک کا بڑا غرق کر دیا ہے۔“ اور پھر ایک ادھ گھنی، پہلی سے ذرا اچھتی گھنی کی ادھ کنواری... مجھے بُری جلن ہوتی ہے۔ معلوم ہوتا ہے، میرے بجا شے اس نے لوک پتی کو اپنا سالابنا لیا ہے۔ ”سنو گھر، میں گوچتا ہوں۔“ تم کب سے اہنسا کے قائل ہو گئے؟“ ”میلکر تبا؟“

”اوے گھانتے پڑ کے آسے، دوچار۔“

اوند ایسا کرنے میں میں اپنا مرکاز دوست سے ہوا میں گھماتا ہوں۔ منہ میں گالیاں منٹتا ہے۔

ہوں جو سب نام روگ کرتے ہیں۔ — یہوں تم نے اس کی پشاوی نہ کی؟“

”کیسے کرتا؟“ مگر میں حماموں کی طرف دیکھتے ہوئے کہتا ہے۔ ”یہ سامنے کی بیٹھ ہیں،“

ان میں جتنے بیٹھے ہیں، سب کے ہاتھ میں ایک ایک اُسترا ہے۔“

پھر ستم دنوں مل کر رہتے ہیں، ایکا ایکی خفابوائشتے ہیں اوند پھر ایک دوسرے کے لئے درسے منہ کی طرف دیکھ کر کھل کھلا اشنتے ہیں۔ آخر اس نتیجے پر سمجھے ہیں کہ جیسے کیسے بھی ہیں اپنے دلش کے ناتی ہیں۔ ہمارے بیٹھ بیٹھوں کا ہی رفتہ لانے والے داتے ہیں۔ ہمیں ان سے سامنے کا جھگڑا ہنیں سول لینا چاہیے۔ آخر تو اپنا گلا ان ہی کے ہاتھ میں آنے ہے۔

سلگم پرواقیں نہار پی ہیں۔ ان میں سے ایک کا بھی جسم اچھا نہیں کسی کا پیٹ لٹکا ہوا ہے تو کسی کی تماگیں اور پر اٹھی ہوئیں معلوم ہوتا ہے میش بنک کا ٹیکلر (TELE T) ہے جواد بخی کری پڑھا ہوا پبلک کے ساتھ بزنس کر رہا ہے۔ ایک بڑھیا ہے شہر کے گاؤں نے جس کی محنت کا آخری قطرہ تک پنور ڈیا اور بھرے بازوں پر بیچ ڈالا۔ بیچ سے لگا ہوا اس کا پیٹ اسکی رگھی ٹھانگیں اور ٹھنڈت سے بازو دیہیں جو دیکھنے میں ہم پر ٹھکر کر سوچ ہمگیوں کو انجلی اپہت کر رہے ہیں لیکن اصل میں لپک لپک کر کیہدی سرکار کے حکمہ خوراک کی

جان کو روکتے ہیں۔ جیسے ہمدری تصویر پا یقہر پنچاپی ”ہمیں سمجھی ہے اوند ہماں کے لوگوں نے بہت لپسند کی ہے۔ اسی طرح باہر کے لوگ اس بڑھیا کی تصویر دیکھ کر بہت خوش ہوں۔ فوٹو

گرافی میں دنیا کا سب سے بڑا النعام اسے ملے اوند دنیا بھر کے ملکوں سے غلتے کے جہاد کہیں اور جانشکی بجا لے کر ہندوستان کی طرف پلٹ پڑیں... اچھی عورتیں ہمارے ملک میں کہاں رہ گئیں؟ وہ تو اپنے صرف کلینڈر میں پر دکھلی دیتی ہیں بیشتر طبیکہ وہ بھی ”لیڈر پریس“ میں جھپٹے ہوں... اور سے ہنیں بھائی اب بھی کہیں کوئی ایک آدھ دکھائی پڑھی جاتی ہے۔

وہ دیکھو سامنے... ایک نوع غرہ فوجی را کی بھی ہے۔ چلو ایک تو ہے جس نے صبح کے خالی نظر کو بھردیا، اور را مدد مصیح کی کیسا اور تھکا شیئے والی آغاز مرتعش کر دی... وہ ساری سمیت

نہاری ہے میکن بچاری، شرم کی ماری، سارھی کے بغیر بھی ہوتی تو نظر نہ آتی... پانی کی وجہ سے کپڑا اس کے پدن کے ساتھ چپک چپک جاتا ہے، ادھر ادھر دمکھتی ہوئی جسے دہ بار بار اپنے آپ سے علیحدہ کرتی ہے۔ ہندوستانیوں کی لوری قوم کی طرح وہ اپنے جسم کو ناپاک اور سمجھتی ہے اور اس غلط فہمی میں ہے کہ گنگا کا پانی اس کے عورت پنے کی گندگی اور میل کو دھوڑے گا، اس کے جسم کو پاک کر دے گا۔ کوئی بھی پانی اس کے جسم کو پاک نہیں کر سکتا۔ کیونکہ وہ پانی جس سے زندگی عبارت ہے، اس میں وہ کھل کے ہنا نہیں سکتی۔ اس میں نہائے بغیر بھی نہیں رہ سکتی۔ اس کے بھائیوں کو اس احساس سے کوئی نہیں نکال سکتا کہ وہ جی رہے ہیں تو کتنا بڑا گناہ کر رہے ہیں۔ ان کے ذہن کی گہرا یوں میں یہ چیز بس چکی ہے کہ گائے کے دودھ پر صرف بچھڑے کا حق ہے اور وہ دودھ پتے بغیر نہیں رہ سکتے، بچھڑے کے ساتھ پاپ کے بغیر بھی نہیں رہ سکتے ...

... ہا! یہ دنیا کھلا گھر ہے جس میں ڈری مچھلی چھوٹی مچھلی کو کھا رہی تھی مانس بھی لیتے ہیں تو ہزاروں کیڑے ہوا کے ساتھ اندر جاتے ہیں، ہلاک ہو جاتے ہیں۔ کیا کوئی ذریعہ نہیں — پرانا اور شاستر کا کوئی حوالہ نہیں جو اس سچ کو جھینلا سکے کہ زندگی کا آدھار زندگی پر ہے؟ چلو زندہ رہنے کے لیے اگر زندگی لینا ہی ضروری ہے تو کم سے کم تتوڑوں کا ناش کیا جائے۔ مرد میں بلا بخ تتوڑتے ہیں۔ ہوتے عورت میں بھی پاک نہیں۔ بلکن ہر دوسرے سال خاک اور خون میں سترنے پتے پیدا کرنے، گھر بارہیں آبجھے رہنے کی وجہ سے آخر ساڑھے چار رہ جاتے ہیں۔ گائے، گھوڑے اور بکری میں چار، مرغی بیٹھر میں تین، کیڑے کھوڑوں میں دو، اور چھل سبزی میں ایک ... اس لیے چھل اور سبزی ہی سے پیٹ کا نک بھرنا اچھا۔ آخر ایک ہی تتوڑ کا ناش ہوتا ہے ...

ارے، یاد آیا... مگر چپا چپا ہوتی ہے اس پر بھی اس میں آدھا ماکوئی بھی تتوڑ نہیں ہوتا۔ اس لیے ہی کھانی چاہیے۔ میں بدهان چند پر کھوں سے اچھا ہندُ د ہونے کے نارن

کل سے مٹی ہی کا بھوجن کیا کر دن گا۔

کشتی والے دھڑادھڑ شردھا مارے لوگوں کو زیج منجھ دھار کے لے جا رہے ہیں جہاں  
گنجھا جھٹا اور سرسوتی ملتے ہیں۔ پانڈے والے لوگ پوچھا کے پھول لوکریوں میں لیے انھیں دے رہے ہیں؛ مختلف بہالوں سے پیسے ہٹور رہے ہیں۔ ہاں، پھول زمین پر تھوڑے اُٹ گئے ہیں؛ وہ دنامنہ لیا جب کمل اپنے آپ کھل جایا کرتے تھے اور دھرتی کا الہاس اور چلا آتا تھا۔  
اس نی چھٹیوں پر موئیا اور کرنے اور مردا کے ساتھ چبیلی، ٹکاپ اور صدر بگ کے لقش و بخار بنا دیا کرتا تھا۔

یہ سمجھیے نو نج گئے۔ — اب ہم زخم ہونے لگے ہیں۔

میں اور اگر سین دلوں ٹھلتے ہوئے لوک پتی کی طرف جانے لگتے ہیں جبھی لوک پتی کا چوکھا گاہک بھی اپنی طرف آتا ہوا نظر آتا ہے۔ اگرچہ میں اس سے نہیں جانتا۔ لیکن خشکل ہی سے وہ اپنی برادری کا جلن پڑتا ہے۔ — دیسے ہی آدھا منڈا ہوا دیسے ہی دو چار خط چہرے کے باشیں طرف لگے ہیں... میں ذرا ہمت کر کے آجے بڑھتا ہوں اور اس سے پوچھتا ہوں —

”کیوں بھیا، کیا حال ہے؟“

”اچھا ہے“ وہ کچھ جھینپ کر کہتا ہے۔

”کیا دیکھ رہے ہو؟“

”پھی۔۔۔ دنیا کے زندگ“

اور بھروسہ دار صمی کے ان کئے حصے پر ہاتھ پھیرنے لگتا ہے۔ کیا دیکھتے ہیں کہ ہم قیزوں نہیں رہے ہیں اور بھر ایکا ایکی قیزوں ہی خفا ہوا ٹھے ہیں۔ میں اگر سے کہتا ہوں ”یہ تھیک ہے، لوک پتی کے ہاتھ میں اسٹرزا ہے۔ لیکن اگر ہم چوکوں مل کر اس پر جھیٹ پڑیں تو وہ ہماری دار صمی صاف کرے یا نکلے، ہم صردار ان لی طبیعت صاف کر سکتے ہیں۔“

”اگر شک و شبیہ کی نگاہ سے میری طرف دیکھنے لگتا ہے جیسے کہہ رہا ہو۔“ چاروں مل کے؟“ گویا کہ ہم چار بھی مل ہی نہیں سکتے اور اگر مل گئے تو پھر ہم ہندوستانی نہیں، ضرداہمیں سے کسی کی رگوں میں بدشی خون دُور رہا ہے۔ اگر مجھے دفتر نہ جانا ہوتا تو بھائی میں تو ضرداں کے ساتھ مل جانا۔ ہاں، یہ چوتھا بھائی ہمارا۔ — خدا معلوم، اس کی کیا آئیڈیا بوجی ہے؟ ہمارا چوتھا بھائی بنکار نے لگتا ہے۔ — وہ لوک پتی اور اس کے ساتھیوں کے خلاف زہرا لگتے ہے۔ — ”پر ٹوٹ کھسوٹ“ یہ نفع خوری غیر قانونی، غیر جمیوری ہے۔ یہیں اس کے خلاف جہاد کرنا چاہیے، بغاوت کرنی چاہیے، اور پھر وہ دُور ہی سے جماں کو دھمکیاں دینے لگتا ہے۔ جب وہ شروع ہوا تھا تو میں سمجھا اس کے ہاتھ میں اُستزے سے بھی تیز کھٹی ہتھیار ہو گا جسے گھمانے ہوئے وہ زور سے لاکارے گا۔ دنیا جہان کے ان منڈے لوگوں کو اسکا بھرپور کر اپنی مدد کے لیے آمادہ کر لے گا اور لوک پتی اور اس کے ساتھیوں کا ذلنگ کڑائے گا۔ لیکن یہ جان کر دُکھ بھی ہوا اور نہنسی بھی آئی کہ وہ بھی ہماری طرح پارٹیٹری ڈیموکریسی کا فائل ہو گیا ہے، جہاں ہم تقریریں کر کر کے ہار چکے ہیں، وہ نیا بھرتی ہونے کی وجہ سے ابھی تک جوش کے عالم میں چلا رہا ہے۔ یہیں چار چار فٹ اور پڑا چھپل رہا ہے اور جب اُپھلتا ہے تو کچھ آگے بڑھنے کی بجائے تھوڑا پیچے ہٹ جاتا ہے...

”یہ لوک پتی“ دہ کہتا ہے۔ یہیں باہر سے دُکھر تو پڑھ آیا ہے اپنے آپ کو خدا سمجھتے لگا ہے۔ دنیا جہان کی بہو بیٹیوں سے انکھیں لڑانا پھرتا ہے اور نہیں جانتا کہ اس کے اپنے گھر میں کیا ہو رہا ہے۔ جب وہ اپنے کام میں مشغول ہوتا ہے اس کی بیوی اسٹیل والے ایک بیٹھ کے ساتھ راس رچائے رہتی ہے، لڑکی ایک سسٹی کے پیچے بھاگنی پھرتی ہے اور لڑکا چو ابازار کے کوٹھوں کا طواف کرتا ہے...

یہ چوتھا بھائی ہمارا یہاں کے سب جماں کو جانتا ہے، سب کے کچھ چھٹھے کھدل کر ہمارے سامنے رکھتا ہے۔ یہ اُن نے بنایا، ان میں تین چاراں چھے جماں تھے جو پوری حجاجت

بنانے کے قابل نہ تھے، لیکن پستمتو سے وہ ایک ایک سکر کے مر گئے اور یا باتیوں کے خور مچانے کی وجہ سے نکال دیے گئے۔ وہ سب لوگ پتی کے دوست تھے، اور ان کی وجہ سے لوگ پتی سب کچھ کر سکتا تھا۔ لیکن کہ اس کی سوچ بوجہ اچھی نہیں، نیت صاف نہیں، لیکن ان کے چلے جانے کے بعد وہ اکیلا رہ گیا ہے۔ مجبوراً اس سے دوسروں کی حرکتوں پر خاموش رہنا پڑتا ہے۔ اور کبھی وہ خود بھی دہی کرنے لگتا ہے جو اس کے باقی حجامت سا نہیں کرتے ہیں۔

ان حجاؤں کے علاوہ دوسرے جو دربوں سے باہر بیٹھے ہیں اس کمیل کے قابلے  
قانون سے دائمت ہو چکے ہیں۔ اللہ آباد شہر جس کے نیچے کہیں مرستی ہبھی ہے کسی ایسے  
شخص کو جذب نہیں کر سکتا جو پڑھا لکھا نہ ہو۔ اگر انفاق سے کوئی ان پڑھا بھی جائے تو  
چند ہی دن میں وہ اتنا پڑھ جاتا ہے کہ یونیورسٹی کا کوئی بھی اچھے سے اچھا دیا رکھی اس  
کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ اللہ آباد کے حجاؤں آدمی بڑے مزے کے ہیں۔ خوب دردکی سوچتے ہیں۔  
لبی چوری بڑھنا میں بنا تے ہیں، جن میں سے پوری ایک بھی نہیں کر پاتے لہس بھاشن دیتے  
ہیں۔ زبان کے معاملے میں رائے ضرور رکھتے ہیں لیکن اسے عملی جامہ پہنانا تو ایک طرف  
نیکا بھی گھومنے نہیں دیتے۔ اپس میں مل کر کچھ گوشی سی کرتے رہتے ہیں... ان میں سے  
ایک شاء ہے جس کا نام چند ربعاں ہے اور جو دیوگ سخت خلص کرنا ہے۔ ہندی کے چند  
سے اُردو کو غفل مدد بناتا ہے۔ طبیعت اس قدر حاضر ہے کہ اپسراکی بجائے دبو بالک پس  
کرتا ہے جانا ہے ناکہ عورت سے پیار تو ایک قدر تی بات ہے لیکن مرد سے پیار مرد اُج  
کل...

ایک دن بیٹھے بیٹھے چند رہا جان دیوگ نے بہت پیلی اور دویا کے عالم میں بہت رہا۔ اسے یقین ہو گیا کہ وہ سپری ہے، ہائے دنیا نے ہنسیں سمجھا۔ میں نے کہا ۔۔۔ مگر میں بات ہنسیں دیوگ جی۔ دنیا آج ہنسیں تو کل آپ کو سمجھنے گی ۔۔۔ پھر مذہب دیرا کے سب رانہ چند رہا جان دیوگ پر کمک نہیں کئے اور دعوے نہیں میں دعوت رہنے لگا۔ آپ وہ جیون کے نگ

سخن پر آتا تر حوب ہی رکھ رہا تا۔ لوگ اس کے راکھ رہا نے کو بھی اب بھئے کی ایک قسم سمجھتے جسے تاچتے اپنے اس کے باقی ساتھی تو دمک مینخ کے دمک میں گئے، سو گئے... ۔

چند ہی برسوں کی بات ہے الہ آباد کے ان جھاموں میں پچاہ کا ایک جھام آ گیا بس۔ پھر کیا تھا اُب لٹھ لے کر اس کی طرف رفتہ رفتہ اور اس سے نکال پھینکنے کی تکمیلیں رہانے لگے۔ لیکن وہ بھی ایک ہی بد معاشر تھا۔ باقاعدہ سینہ تاں کر سامنے کھڑا ہو گیا۔ اگر کسی نے ایک هستہ انکالا تو اس نے دو نکال لیے باقی جھام درکر بیٹھ گئے اور سامنے ہو کر راشنے کی بجائے نیتی کی باتیں رہنے لگے۔ وہ گھاگ سب کچھ سمجھ گیا۔ اس نے اپنے نیبن کے چیچے سے کچھ شختے نکال کر ایک کھڑکی بنالی اور اس پر ایک بورڈ لگا دیا۔ ”کوشک چری ٹیبل، ہومیو پیٹھک ڈسپری“ اور کچھ دزانی کی شیشیاں رکھ لیں۔ مذکور کھڑک ایکس پیشی نہیں، دو سو ہزار پچاس ہزار لاکھ کی پیشی۔ بس پھر کیا تھا۔ آس پاس کے غربی غرباً نباپوی کے سب لوگ علاج کے لیے اس کے پاس آنے لگے۔ دوسرا سے جھام لوگ بد کے۔ ایک سینینگ کر کے انہوں نے اس کے خلاف فیصلہ کر لیا۔ لیکن جب تک کوشک میٹھی کی حمایت حاصل کر چکا نہ تھا۔ اس سے گرانٹ بھی لئے چکتا تھا۔ اب اس سے دہاں سے کوئی نہ ہلا سکتا تھا چنانچہ آج تک وہ دہاں بیٹھا سب کی میہمانی پر مونگ دل رہا ہے۔ چہ جائے کہ باقی جھام اس کا کچھ بھار مل سکیں، اپنے بھی بیٹھیوں کے رشتے نالی ہولے کے ناطے اس سے کرواتے ہیں۔

اس پر طرہ یہ کہ ان کے بیچ ایک جھام بھی چلا آیا۔ لوگ سمجھتے تھے کہ اس کا کاروبار کیا چلے گا جس کی اپنی شہر نہیں بنی ہے۔ لیکن صاحب، جوانہ زادہ سیانے کا ہتا ہے دیا نے کا نہیں ہوتا۔ اُڑا اس کے پاس زیادہ گماہن آنے لگے۔ وہ جانتے تھے ناکہ بالوں کے بارے میں جتنا بہ جانتا ہے، کوئی دوسرا نہیں جان سکتا۔ اگر لے بالوں سے محبت، تو لوگ تو ایسی پیاری خیز بنائے گا کہ راہ چلتی لڑکی گھال سے گھال رکھے گی اور نفرت ہو گی تو یہیں

کھوٹی سے اکھاڑ پھینکے گا کہ سات جنماں تک شوٹی پہ بال آگئیں جسے نہ دلخ میں خیل پیدا ہو گا۔

یہ جو لکھا بھائی، ہمارا سینگھ کے نایوں کے بارے میں اور بھی بہت کچھ کہنا چاہتا ہے، لیکن میں اگر سین کو آنکھ مارتا ہوں اور اپنا ہوں — ”بھائی“، میں تو چلا، سارے سے تو ہو گئے ہیں۔

”اگر حیرانی سے میری طرف دیکھتے ہوئے کہتا ہے؟“ ایسے ہی چل رونگے، جل توڑی؟“ کیا کروں؟“ میں کہتا ہوں۔ ”گیا تو بیوی ہی چلی جائے گی نا، نوکری تو ہمیں جائے گی؟“

اور حضرت کی نظر سے لوک پتی کو دیکھتے ہوئے چل دیتا ہوں جس کے پاس ابھی تک گاہوں کا تانا بندھا ہے۔ میرے من میں یہ خیال چلکی لیتا ہے کہ شاہد لوک پتی اب بھی مجھے ملا لے اور اگلے پانچ منٹ میں نک سک سے درست ہو کر جاؤں۔ لیکن صاحب، لوک پتی کو کہاں وقت ہے؟ اور میں رکشائے کر گھر پہنچ جاتا ہوں...“  
ددیا، میری بیوی میرا منتظر کر رہی ہے۔

”ہا۔ جی، کیا ہوا؟“ وہ چوکھٹ پر میری آہٹ سننے ہوئے بول اکٹھی ہے۔  
”کیا ہوا کیا؟“ میں پڑھتا ہوں۔

”کہاں بھانگ پتی کے پڑھے؟“

میں کوئی جواب ہمیں دیتا، لیکن وہ کہے جاتی ہے۔ ”انا بھی نہ سوچا، دفتر کا دقت ہو گیا۔ تھیں تو بس کوئی باتیں کرنے کو مل جائے...“  
جنبی، اس کی نگاہ میرے چہرے پر پڑتی ہے —

”سیاری!“ وہ کہتی ہے۔ ”بیکیا؟“ اور پھر وہ دوپٹہ مٹھ پر کرتے ہوئے مہنے نگتی ہے۔ پھر اس پر بس ہمیں۔ پُر دس میں آداز دیتی ہے۔ ”جگن بھیا۔ اے ذرا ان کو بھی دیکھنا۔“

میں ہاتھ جوڑ دیتا ہوں۔ ” وڈیا — بھگوان کے لیے ... ”

اوہ پھر وہ خود ہی دیکھنے کے لیے ہاتھ میری دار حی کی طرف بڑھاتی ہے۔

” خبردار ” میں اس کا ہاتھ جھٹکتے خاہوتے ہوئے کہتا ہوں ” تو ہاتھ لگائے گی تو

بیس لات لگاؤں گا ”

اوہ پھر میں سوچتا ہوں — اس میں بیچاری و دیا کا فقصور؟ ایک سرد آہ بھرتے ہوئے میں اسے صرف آتا ہی کہتا ہوں ” شکر کرو تم عدوں کی حجامت کسی لوک پتی نے نہیں ترے لوک پتی نے بنائی ہے ” اور ایسا کرنے میں میں اور بھگوان کی طرف اشارہ کرتا ہوں۔ ” ہمیں اور ہخواہی مصیبتیں میں؟ ” وڈیا کہتی ہے ” ممکن نہ صرف ایک حجامت بزاںی

پڑتی ہے ”

اس کے بعد وڈیا کھانا نکالنے لگتی ہے۔ میں غصہ میں کہتا ہوں ” آج کھانا نہیں کھاؤں گا ”

وہ ہاتھ ملتے ہوئے کہتی ہے ” ہائے جی، کیا انزٹھہ ہے گرے گدھے پر سے اور غصہ غریب کہا رہ پنکھاں رہے ہو — ؟ ”

پھر میں سوچتا ہوں — کھانے کے ساتھ میرا کیا ہمگڑا؟ ” آجھا، لاو کھانا؟ ” وڈیا کھانا پرستی ہے۔ میں جلدی جلدی نوالے منہ میں ڈالتا ہوں جو اور پر سے بیچے جانے کے سمجھائے، نیچے سے — اور پر جانے لگتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے میں کھانا نہیں کھرا، کھانا مجھے کھارا ہے۔ یا کوئی نیولی کرم کرنے بیٹھا ہوں۔ کھانا کھاتے ہوئے ہمدردی، محض ہمدردی حاصل کرنے کے لیے وڈیا کے سامنے اپنی آج کی مصیبت کی راستان دھرا تا ہوں۔ وہ بیچاری بھولی بھالی نہیں سمجھتی کہ اس کے منہ سے نکلا ایک بھی ہمدردی کا نظربھجے کتنا دکھ پہنچائے گا۔ میرے بیان کے آخر میں وہ کہہ اٹھتی ہے۔

” ملکی پڑے ان نگوڑوں پر — آج دفتر مرست جاؤ ”

”کچل؟“

”خواہ مخواہ کیوں تماشا بننا ——“

اس پر میں ایکا ایکی بھڑک انھتا ہوں —— کیا مطلب؟ —— میرٹ شکل —  
میں اسے بھی تماشہ دکھائی دے رہا ہوں؟ کم از کم، سے تو یہ نہیں کہنا چاہیے تھا میں دفتر  
نہیں جا سکتا تو گھر بھی نہیں آ سکتا؛ اور میں وہیا کو گالیاں دینے لگتا ہوں جو داصل محمد شکر کے  
نایشوں کو دینا چاہیں تھیں یا اپنے آپ کو۔ وہیا اندر چلی جاتی ہے اور میں سمجھتا ہوں مجھے  
ڈر گئی۔ لیکن وہ باہر آتی ہے تو ہاتھ میں ایک کٹوری لٹتی ہے جس میں گرم پانی ہے۔ وہ درے  
ہاتھ میں شیونگ اسٹک اور اسٹرا۔ سیفی ہنیں، دہی لوک پتی والا...“

میں سوچتا ہوں۔ چلو اسٹرا کند ہے تو کیا۔ ذرا زور سے لگاؤں گا تو سب نھیں  
ہو جائے گا۔ پھر بجائے ہس کے کو لوگ مجھ پر نہیں میں ان پر نہیں ہوں گا۔ چنانچہ جلدی جلدی  
پھر سے پر جھاگ پیدا کر کے میں اسٹرا پھیرنا شروع کرتا ہوں۔ لیکن صاحب اسٹرا ہے کہ  
کہیں بھی ملکنے کی بجائے اور پر سے یہیں ہوں گا۔ ہو اکھوڑی پر آ جاتا ہے جیسے بارک ہیں سلپنگ  
روٹریم سے نیچے ایک مرکم مسلتے ہوئے نیچے آ رہتے ہیں... میں جعل کر پانی کی کٹوری نیچے  
لٹخ دیتا ہوں۔ اسٹرا اور پھینک دیتا ہوں۔

”کیا بگو اس ہے؟“ میں بنکارتا ہوں —— یہ اسٹرالے کے دیانتا... تیرے میکے

”والوں نے؟“

”ہائے جی“ وہیا کہتی ہے: ”اہوں نے تو نھیں ہی لے کر دیا تھا۔ تم ہی نے سلتی  
کم کر دی۔“

”کس نے سلتی کم کر دی؟“

”تم نے —— روذ نکال میٹھتے تھے؟“

”جھوٹ! —— معلوم مختا ہے تم اس سے اروہی گھیٹتی رہی ہو!“

وہ دیا خینف سی ہو کر استرا اٹھا لیتی ہے۔ میں پڑ کر اس کی طرف دیکھتا ہوں تو صاف نظر آتا ہے کہ وہ دوپٹے کے یچھے اپنی ہنسی کو دبانے کی کوشش کر رہی ہے اور جب میں اسے شدھ انگریزی کے پیغمبر میں "ثٹ اپ" کہتا ہوں تو معلوم ہوتا ہے فلسطی سے "پک اپ" کہہ دیا۔ ایک تھوڑہ پوری فضنا کو بھر دیتا ہے اور وہ دیا استرے کو ہاتھ میں پکڑے ہوئے مجھے دکھاتی ہے۔ "جماعت ہو بھی کیسے، اُنھیں ہی استرے سے اپنے آپ کو مونڈتے رہے؟"

میں دیکھتا ہوں جلدی کے عالم میں میں یعنی اپنے منہ پر اٹھا استر اپھیرتا رہا تھا۔

وہ دیا کہتی ہے: "خواہ نخواہ میرے ملکے والوں کا نام بد دیکیا؟" "اچھا اچھا" میں جز بزر ہو کر کہتا ہوں اور پھر اسی پردی سمجھنا، اپنے پردے کرم و حرم اپنے اعتقادات پر تبرے بھیجئے لگتا ہوں۔ وہ دیا بول اٹھتی ہے: "خباردار! اس میں سنگم کا کیا قصور ہے گنگا میا کا کیا دش؟" — میں کہتی ہوں: میں مردیں تو مجھے جانا ملت گنگا میں میرا جل پردا کرو دینا۔

اور میں یہی سوچتے ہوئے چل دیتا ہوں گنگا میں جل پردا؟ کیسی مان مریدا ہے یہ؟ کیسا پاگل پن ہے ہماری پوری قوم کا؟ اور مجھے یاد آتا ہے وہ دن جب میں درود پری گھاٹ کی ہڑت گنگا میں نہانے نکل چکا تھا۔ سردی اور گرمی یعنی کے دن تھے۔ گنگا میں جب باری ٹھیک آئی تھی اور وہ بامنوں ہی باٹوں پھوڑ کر خود کناروں سے بہت دوڑ چلا کیا تھا۔ مجھے دریا دل اور چنپریں کا بہت شوق ہے۔ باڑے کئے کاٹا ہوا جتنا بانی کو دیکھ کر ڈرتا ہے اتنا ہی میں بانی کے نظارے سے خوش پرتا ہوں۔ پہلے کنارے کے پاس کی چکنی مٹی پیٹ پر ملتا ہوں جس سے جسم کی بیماریاں تو کیا دل اور دماغ کی بھی ساری بھیں جاتی رہتی ہیں۔ پھر اٹو لفت جوست کا بہتر باختہ لیتا ہوں جس میں اپنے بدن کے نہایت شرمناک حصے کو پانی میں ڈبو کر ایک ہاتھ سے پانی پیٹ پر ٹالتا ہوں اور دوسرا ہاتھ سے پیٹ کو خوب ہی

زور سے ملتا ہے۔ انہوں آنٹی حركت میں آ جاتی ہیں۔ مرے ہوئے ٹشو بھی دمہ ہو جلتے ہیں۔ پھر کنارے پر کھڑے ہو کر نیلے گی بجائے ہاتھ سے پورا جسم رکھتا ہوں۔ ردِ حرم دوم جاگ اٹھتا ہے اس بین اسکول کی لڑکی کے بدن کی طرح زرم اور حکنا ہو جاتا ہے۔ چونکہ نجھا بتو ہوں اور سب کی طرف دیکھتا بھی ہوں۔ اس لیے میری طرف کھنٹنیں دیکھتا۔ بندر بھی گھبر کر بھاگ جاتے ہیں۔ شاید سمجھتے ہیں کہ ہم سے بڑا کوئی آ گیا۔ چنانچہ اس دن باہتہ لیٹنے کے لیے گیلانہ کیا دیکھتا ہوں ایک انسانی کھوپڑی پڑی ہے جس کے ساتھ ریڑھ کی ٹہنی لگی ہے۔ ضرور کسی دو دیا کی بہن یا اس کے بھائی کا جل پرواد ہوا ہو گا۔ مجھے اس کا اتنا ہنیں لگھا جتنا اس بات کا کہ —— ہاٹیں! ہم ہندوستانیوں کے بھی ریڑھ کی ٹہنی ہوتی ہے! —— یہ ہنیں ہو سکتا۔ کسی اور قوم کا کوئی آ کر یہاں روپ مرا ہو —— مگر ایسا ہوتا دنیا جہاں ہیں کہ رام سعیج جاتے اور دہاں کے لوگ رُگ لگا کر پوری بالوں کو چھان ماریں اور اپنا مردہ بھی یہاں سے نکال کر لے جائیں ...

اس کھوپڑی سے کچھ پرے ہو کر کنارے پر کھڑے رکھتے ہوئے میں پانی میں اتراء نوکیا دیکھتا ہوں کہ پاس ہی کے اپنے اجل اور پادن جل میں سعیج کا ایک مردہ پڑا ہے۔ میں اچھیل کر باہر آ گیا اور گھن اور خوف سے کاپٹا ہوا اس کی طرف دیکھنے لگا جس کا جل پردہ ہوا تھا اور اب اسے جل کی پرواد نہ تھی —— اس کے بدن کا گوشہ پھیل کھلیجی تھیں۔ اگر میں مجھوں تا نہیں تو مردے کے پنجھے ہوئے چہرے پر ایک طرف دار ہی تھی اور دوسری طرف سب صفا چٹ تھا۔ آج کے تجربے سے میں اس بات کا اندانہ کرتا ہوں کہ مر نے سے پہلے وہ ضرور سلکم پر گیا ہو گا اور دہاں کے کسی لوک پتی، چند رہجان یا کوشک سے حمامت بزاگی ہو گی! —— خیر میں اپنے کھڑے پر کھڑکر دریا کے اوپر کی طرف ہو لیا، تاکہ اس غازی مرد کے گھنڈوں نے بدن سے لگا ہوا پانی مجھ تک نہ آئے۔ ایک بار پھر کھڑے رکھ کر دریا میں اتراء ہی تھا کہ پانی میں سے دُٹا نہیں باہر اٹھتی ہوتی دکھائی دیں۔ میں بھاگ آیا

اور جب سے میں نے درود پر گھاٹ تو کیا کسی سنتیا یا سادتی گھاٹ پر بھی نہ نے کا ارادہ نہیں کیا۔ اور یہ دیا، میری بیوی، ایک عجیب طرح کے پاگل پنے میں اپنا جل پردا کرنے کو کہہ رہی ہے ... ناہابا! میں نہیں چاہتا کہ مرنے کے بعد بھی کسی کی ٹانگیں یہیں پانی سے باہر اٹھی ہوں۔

بادر جاتا ہوں تو دہاں ایک مسلم نے سے بیری لڑائی ہونے لگتی ہے۔ ایک پل میں ٹول نظر آنے لگتے ہے جیسے شہر بھر میں ہندو مسلم فاد ہو کر رہیں گے۔ کشتوں کے پشتے تک جائیں گے یہ بات نہیں کہ وہ بیری طرف دیکھ کر ہنس دیا۔ اس نے کوئی ایسی بات نہیں کی۔ البتہ وہ ایک شر کنارہ تھا۔

یہ عجیب پروہ ہے کہ چلن سے لگے بیٹھے ہیں صاف چھپتے بھی نہیں سامنے آتے بھی نہیں اس نے صرف ایک بار میری طرف دیکھا تھا اور میں نے سمجھا وہ شر مجھ پر چکار لہے۔ میری آدھی منڈی ہوئی دار الحی کا مذاق اڑا رہا ہے مگر جب کوئی مسلمان اللہ رسول کی قسمیں کھاتا ہے تب تو ماننا ہی پڑتا ہے۔ یہ طے بات ہے کہ دو یوں ہی اپنے ابیلے پن میں شر پڑھ رہا ہو گا اور میں اپنی مزوز کا فکار اسے غلط سمجھ گیا ہوں گا۔

میں دفتر پر چلتا ہوں — لیٹ! ... اور چپکے سے اپنی سیٹ میں جا دیکتا ہوں۔ یوں کام میں لگ جاتا ہوں جیسے صبح ہی سے مرنے کی فرصت نہیں اور قریب دو گھنٹے سے اس دفتری نہضت کے عالم میں رہا ہوں۔ کھلک میری طرف دیکھتے ہیں۔ کھل کر نہستے ہیں اور بار بار میری عیالت کے لیے آتے ہیں۔ اس عرصے میں میرا سیکشن انچارج صرف ایک بار میر سکلاس آتا ہے۔ میں بہت کچھ اپنا چہرہ اس سے چھپانے کی کوشش کرتا ہوں لیکن جبھی لگ بگ کے گم ہو جانے میں جو سنگاہ بپاہوتا ہے اس کی وجہ سے اپنے آپ کو بھول کر مجھے اس کی طرف دیکھنا ہی پڑتا ہے۔ وہ میری طرف دیکھتے ہی کہہ مٹھتا ہے — آج تم نکم پر گئے تھے؟

”جی سر“ میں جواب دیتا ہوں۔ اور میرا ہاتھ اپنے آپ چہرے کی طرف اٹھ جاتا ہے میں ڈرتا، لرزتا ہوں کہ نہ معلوم اب وہ مجھے کیا کہے گا؛ لیکن صاحب وہ ایک ایسی بات کرتا ہے کہ میں سوچتا رہ جاتا ہوں کہ اس بات سے میری دارصی کا کیا تعلق؟ وہ کہتا ہے — ”کوئی بات نہیں... لاگ بگ کل مل جائے گی۔“ پھر وہ چلا جاتا ہے۔

مجھے کچھ سمجھ نہیں آتا۔ چہرہ کانوں تک تمباٹھتے ہے اور اس کے ان منڈے حصے پر ایک ایک عجیب سی خارش ہونے لگتی ہے۔ میں جتنا اسے کھجانا ہوں، اتنا ہی اپر سے پیچے تک میری خارش بڑھتی جاتی ہے۔

میں کام کے بیچ سے اٹھ کر اپنا جی نکلنے کے لیے باہر چلا جاتا ہوں۔ کچھ توڑٹ آتھیں جو میری طرف بالکل نہیں دیکھتے۔ باہر کے گور کا ہی ہوتا ہے نا، ہم ہندوستانیوں کی طرح دوسرے کے پرائیویٹ معاملوں میں اپنی لمانگ نہیں اڑاتے۔ ان میں سے ایک بخ پر میرے پاس آبیٹھتا ہے اور اپنا ایربیگ نکال کر ایک طرف رکھ دیتا ہے۔ پھر وہ بخار ایک اچھی ہوتی نظر مجھے پردا لتے اپنا بیگ پکڑ کر اس میں سے آئینہ نکالتے ہوئے اپنا مندو مکھنے لگتا ہے۔

میری سمجھ میں کچھ آلمہ ہے، کچھ نہیں آتا۔ اگر سویرے پازار میں اس مسلمانت سے میری لڑائی نہ ہوتی لز خاید میں اس گورے کے کرشان سے بھی بھر جاتہ شاید میں اس لیے چپ رہ کہ ان گوروں کا اب تک بھم پر بیت رعیب ہے۔ یہ بھی ہو سکتے ہے اس کے آئینہ دیکھنے کا میری دارصی سے کوئی تعلق نہ ہو۔ میں اس کنفیوزڈ حالت میں اس کی طرف نوکھ کر اپنی لُٹی پھُٹی انگریزی میں اس سے باقی کرنے لگتا ہوں۔

”میں آپ کا نام جان سکتا ہوں؟“

”ضرور... ضرور“ دہ کہتا ہے ”میرا نام رچرڈ کینیٹھ ہے۔“

اور پھر میرے پیچے بنادہ کہے جاتا ہے ”میں امریکا سے آیا ہوں۔ ہمارے مولے کے شہر سے۔“

میں اپنے کو حالات کے دھارے پر چھوڑ دیتا ہوں ۔ سلاا آیا بھی ہے تو  
بلبر دل سے ! ۔ یا شاید میری رائٹسی کی طرف درکھہ کر اس لئے کسی فرضی قبیلے کا نام لے  
لیا۔ پھر حال میں پھر پوچھتا ہوں ۔

”اس وقت آپ کہاں سے آئے ہیں؟“

”بنارس سے ... میں سارنا تھے میں بُعد کا سٹوپ دیکھنے گیا تھا۔“ اور پھر وہ اپنا بیان  
جاری رکھتے ہوئے کہتا ہے ”دہاں سے گاڑی میں آیا ہوں اور اب چہار کا انتظار کر رہا  
ہوں۔“

”ستوپ اچھا لگا آپ کو؟“

”بہت“ وہ میری طرف دیکھتے ہوئے کہتا ہے ”لیکن معلوم ہوتا ہے انڈیا میں لوگ  
قدیم تاریخی چیزوں کو ٹھیک سے سنبھال کر نہیں رکھتے۔ دیکھو نا، اس کے ایک طرف خشک  
گھاس سی آگی ہے ...“

اس سے پہلے کہ میں اس کی بات پری ایکٹ کر دیں، لاڈوا سپیکر پر سے آواز  
آتی ہے — یورا ٹشن پیز — فلاٹ ٹو ادھری کے پیغز ...“  
رچڑاپنا بیگ لیے اٹھتا ہے۔ وہ فقرہ ابھی تک میرے کافوں میں گونج رہا ہے۔  
بوچھے سے رخصت ہوتے، ہاتھ ملاتے، مسکراتے ہوئے اس نے کچھ۔

”میں بیکار ہی سارنا تھا گیا، ستوپ دیکھنے کے لیے“

دفتر میں جیسے تیسے بھی دن کھلتا ہے میں وقت سے پہلے ہی اٹھ کر چل دیتا ہوں۔ یہ  
سرچھتے ہوئے کہ چاہے میری پوری جاہد اونگ جائے۔ سیلوں میں جا کر جماعت بنوادیں گا  
پھر کوئی دنیا کا اور کام کروں گا۔ جبھی میں اپنے آپ کو یونیورسٹی پر کشک سیلوں کے سامنے  
پانا ہوں جو گرامڈرنگ روڈ پر ہونے کی بجائے خلدہ آباد کے ایک کونے میں ہے۔ سامنے  
اس نام کا بندوق لگا ہے اور اس کے نیچے لکھا ہے — پھر پر اسٹر۔ ناصر حسین ...“

اندر داخل ہوتے ہی میں ایک ایسی کر سکی پر جا بیٹھتا ہوں، جس میں مجھے ماں کی گود  
کا ساسکون حاصل ہوتا ہے۔

ناصر حسین میرے پاس آتا ہے۔ اس سے پہلے کہ وہ اپنے ہاتھ کا ٹوالی میرے لگے  
میں بافعہ کے دو مجھ سے پوچھتا ہے۔ ”آپ شیعہ ہیں یا سُنّتی؟“

”جی؟“ — میں جیران ہوتا ہوں۔ میں پوچھتا ہوں۔ ”آپ شیعہ مسلمان ہیں یا  
سُنّتی؟“

”کیوں بھائی؟“ میں کہتا ہوں۔ ”جماعت کا شیعہ سُنّتی سے کیا تعلق؟“

”مماں کیجیے میں... میں سُنّیوں کی جماعت ہنیں بناتا ہوں۔“

”آپ شیعہ ہیں؟“

”ہاں!“

”تب تو اٹا آپ کو سُنّیوں کی خوب ہی جماعت بنافی چاہیے۔ دیے میں ہندو شیعہ  
ہوں — بدھان چند میرا نام ہے۔“

”او!“ ناصر حسین کہتا ہے۔ پھر ٹھیک ہے۔ مجھے صرف سُنّیوں سے نفرت ہے۔ ان  
سے تو ہندو ہی لاکھ درجہ اچھے ہیں۔“

پھر وہ تو لبیہ میرے لگے میں ڈال دیتا ہے اور سفتا ہی نہیں کہ مجھے جماعت بزانا  
ہے، بال نہیں کٹوانا۔ ہزر سے پتہ چل جاتا ہے اور وہ شیونگ برش لے کر میری طرف  
بڑھتا ہے۔ جبکہ میرے چہرے کی طرف دیکھ کر وہ ایک دم رُک جاتا ہے! ... پھر غور سے  
دیکھتا ہے اور شیونگ اشک کو ایک طرف رکھ دیتا ہے اور کہتا ہے —

”آپ اُنہوں جدیجے؟“

”کیا مطلب؟“ میں جماعت کو قریب آگر دوست ہوئے دیکھتا ہوں اور کہتا ہوں  
— ”کہانا، میں سُنّتی نہیں“

## ”سُنی دُنی کی بات نہیں“

”بات یہ ہے تو پھر — کیا بات ہے؟“

”میں جو خوشی کے اس غبارے پر سوار تھا جو لکھنؤ میں پہلی بار کسی انگریز نے اڑایا تھا، ہر کے پلک پھر ہو جانے سے ایک دم بھجو دو دو — کی آواز سے نیچے آ رہتا ہوں ناصر حسین کہتا ہے —

”کسی اور نے آپ کی شیو شروع کی تھی؟“

”ہاں!“ میں کہتا ہوں۔ ”لوک پتی نے سنگر پر ... گریٹ آڈی ہے؟“

”کچھ بھی ہو“ ناصر حسین آواز میں ایک قطعیت پیدا کرتے ہوئے کہتا ہے۔ ”کتنا بھی اے ہو۔ لیکن مانت یہ ہے — کسی کے بھی جھرے پر، کوئی سا بھی حجام ایک بار کیسا بھی حد لگادے، کوئی دوسرا حجام اسے بچ نہیں کر سکتا — یہ ہماری یونیں کا ذائقون ہے۔“

”آپ کی یونیں کی ایسی قسمی“ میں ایک دم آگ بھولا ہو کر کہتا ہوں۔ ”ایک طرف چمار، حاکم ہن دوسری طرف کامگار مزدود اون کی یونیں ... بیچ میں ہم لٹک رہے ہیں ... کیا آپ نے کسی بزرگ سے نہیں سننا — مزاد مرے دو؟ ہم جائیں تو کہاں جائیں؟“

”باہر“ ناصر حسین کہتا ہے۔

میں ایک دم سب کچھ بھول کر پہنے باہر کی طرف دیکھتا ہوں اور پھر اس بات کے معنی سمجھتا ہوں۔ مجھے امید ہی نہ تھی یہ یورپی ہیر کشنگ سیلوں کا ناصر حسین آزادی کے بعد یہرے سارے ایسا سلوک رہے گا۔ جوش میں آتے ہوئے ناصر حسین سے کہتا ہوں یہیں تمہاری یونیں کے خلاف اسڑاٹیک کر دیں گا۔ بھوک پڑتاں کر دیں گا .. میں ... میں پنڈت جی تک ہمچوں گا جو ہیاں کے رہنے والے ہیں۔ اپنے دل میں۔ اللہ آباد میں ایک بار آنے د بھیے انہیں۔ میں انھیں کہوں گا۔ ”پنڈت جی ایس بکیا ہو رہا ہے؟ ابھی تک اس عمر میں آپ نے دیش کا معاملہ نہیں کیا تو بڑے بُوک کیا کریں گے؟“

اول جب کچھ سمجھے میں نہیں آتا تو میں ناصر حسین کے حضور میں گزار گئے نے لگتا ہوں ۔

”ناصر جی! آپ سمجھے سے سرو پے ... دش بیٹیں روپے سے بیجے لیکن بھگوان — نہیں نہیں، اللہ کے لیے ایک بار میری حجامت بنادیجیے۔ نہیں میں دنیا جہان میں کہیں منہ دکھانے کے قابل نہیں رہوں گا ... سب سمجھ پڑھس، ہے جیں ... ایک میں رو رہا ہوں۔“

جا شے س کے کہ ناصر بن میری حالت پر رحم کھائے، وہ کہتا ہے: ”رات ہو گئی اس وقت کون منہ دیکھتا ہے؟“

بیکار ہے۔ سب کچھ بیکار ہے۔ چنانچہ میں کوئی فرضی چھپری الٹا کر فرضی ہوا میں اسے گھماتا ہوا، کسی فرضی لھر کی طرف چل دیتا ہوں ...

رات بھر دو دبا، میری بیوی تیرے پاس نہیں آتی۔ سمجھے یوں معلوم ہوتا ہے جیسے بیرون کی گئیں ہوں جسے سی نے لال بُس لگا دیا۔ یا چڑا ہوں جس کے گلے میں کسی نے پھنسدا بانہ دیا۔ اور اب میرے تقدیر سمجھے اپنے لھر میں ٹھیک ہوئے نہیں دیتے۔ چونچیں مار مار کر اپنے بہان نکر رہتے ہیں؛ کاٹ کھات کر بھگداد۔ یعنے کی کوشش میں میں۔

بیکار کے ہی آٹھ بیس سنگھم کی طرف چل دیتا ہوں اور لوک پتی کے پاس پہنچ کر ہاتھ جوڑ دیتا ہوں۔ — ”ہے لوک پتی! ... بھگوان کے لیے میری حجامت بناؤ۔ تم نے کب سے سمجھے اسی حالت میں لٹکا رہا ہے، نہ جنتیا ہوں نہ مرتا ہوں ... حالانکہ میں نے تمہیں پورا سیکس دیا ہے۔“

لوک پتی جس نے کسی کے چہرے پر کچھ خطا لگا رکھے تھے، اسے چھپوڑ دیتا ہے اور کہتا ہے: ”آپ ذرا لشیر ہیے، شریکان —“

”نہیں، یہ کیسے ہو سکتا ہے؟“ وہ آدمی احتیاج کرتا ہے: ”سمجھے دو کان پر جانا ہے؟“

”سبھیں کو جانا ہے بھیا۔“ لوک پتی کہتا ہے سبھیں کو جانا ہے ... مگر ان کی حجامت بیچھے ہی میں رہ گئی رہتی۔

”یہ امیں بھاڑ میں، اول نہ جاؤ جاؤ جہنم میں“ وہ آدمی منہ پر کف لاتے ہوئے لہتا ہے۔

ان کی نوکل کی حجامست رہ گئی۔ میں پچھے اتوار سے ان منڈا بیٹھا ہوں —

معلوم ہوتا ہے اس آدمی کی برداشت آخری حد تک پہنچ گئی ہے اور وہ لوک پنی کو مار گیا  
لیکن لوک پتی کی ایک ہی کڑی نظر اور ہاتھ میں استزادیکھ کر وہ کہتا ہے — ”اچھا —  
مت لمحہ بیو، ان کے بعد سیری باری ہے۔“

اور میں اطمینان سے لوک پتی کے باٹھ میں اپنا گلادے دیتا ہوں اور سوچتا ہوں کچھ  
بھی ہو، لوک پتی آدمی بُرا ہمیں۔ معاشرے کا بہت کھرا ہے ...

خنوڑی ہی دیر میں چھرے کا وہ حصہ صاف ہو جاتا ہے جو کل ان کٹارہ گیا تھا میں  
اس پر ہاتھ پھیرتا ہوں۔ کیا جرنیلی سڑک، بلکہ آٹو باہن کی طرح سے صاف۔ ہے جس پر کوئی  
سویل کی رفتار سے گاڑی چلا سکتا ہے۔ بھی لوک پتی مجھ سے کہتا ہے۔ ”اب آپ انہوں جائیے“  
”کیا مطلب؟“ میں آخری بار جیران ہو کر پوچھتا ہوں۔

”جو ان کٹارہ گیا تھا، وہ میں نے کاٹ دیا۔“

”مگر“ میں چھرے کے دمیرے حصے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہتا ہوں ”رات میں ادھر  
بھی تو ہال اگ آئے ہیں — ؟ — ! — !!“

”کٹ جائیں گے بُوا!... دہ بھی کٹ جائیں گے!“ لوک پتی ستنی پہ استزادی کرتے  
ہوئے کہتا ہے۔ ”باری سے رب نحیک ہو جائے گا!“

اور میں ڈائیک پر کھڑا اپنی باری کا انتظار کرنے لگتا ہوں جو آئے گی، پر ہمیں آئے گی  
کوشک بلند آواز سے اپنی فتح مندی پر ہنس رہا ہے۔ چند رجھاں نہ معلوم کس کو دیکھ کر امکیل میں  
جمنا کا وہ شعر پڑھنے لگتا ہے جو اس نے فلم ”یوداوس“ میں بولا تھا۔

کوئی میرے دل سے پوچھے تو سے تیرنیم کش کو  
یہ خلش کھاں سے ہوتی جو جگر کے پار ہوتا

سانسہ دیا میں عمدتیں نہار ہی ہیں۔ ایک دشیزہ نے ہر قسم کی شرم و حیا سے بے نیا رہ کر سب کپڑے آنار دیے اور زور سے انہیں دوز کنار علوف طرف اچھینگ دیا اور پورے پر توں کر بلانی میں کوئی گٹھ جتنا زور سے پانی اس سے لپیٹنے کو آیا۔ اس حین دیامونگ کے بعد ابھی وہ سطح پر نہیں آتی ہے معلوم بتا رہے، نیچے مرسنی کی تھا وہ پانے کی کوشش کر رہی ہے۔ جاتری نوگ نہ معلوم کیوں ایک لاکلی چوکس ہر گئے افاداب پانڈوں کے بھول نہیں کجھ دہلوگریاں ہاتھیں لیے سب کی طرف بڑھ رہے ہیں۔

قلعہ جسے شہنشاہ اکبر نے بنوایا تھا ایک منی ایک پر ہو گیا جو وقت کے عجائب گھر میں پڑا ہے۔ مندر روز میں میں وہنس پکے ہیں اور بند رشا یاد پر چاند، شکر اور مغل پر کوڈ گئے، جو زبہ باری دھرتی کے صوبے ہو چکے ہیں ... ایک فیر جو شکل سے علیمِ وقت معلوم ہو چکے ہے بند عادیتا ہے جو مجھے دُعا معلوم ہوتی ہے —

”جا بچہ! سیفی کے بروائیرا کوئی دارو نہیں“

انہ میں خوشی لھر لوث جاتا ہوں، جس کا راستہ بازار میں سے ہو کر جاتا ہے!

# دلوالہ

رد پ متنی 'میری نند' جوان ہر جکی تھی۔ اس کی جوانی کا ثبوت شرپر ہی نہ تھا اس کا، پھر بھی تھے۔ وہ اس کا چونکا کے بات کرنا، بے وجہ نہیں بلے سبب کی دلگیری، بدگمانی اور بھرپور سب سے بڑی بات — خواہ مخواہ کی رازداری! مجھے یہ دنیا کبھی اپنئے کی بات نہ معلوم ہوتی اور نہ ہی اس میں کوئی بہت بڑا سمجھید دکھائی دیا۔ ہاں! — بارہ ساڑھے بارہ کی تو تھی جب بالپور نے کافونیٹ سے مجھے انٹھالیا اور شادی کر دی۔ اُدھر شادی ہوتی اور صریں مندرجی کی اس سمتی توول نگری میں چلی آئی... یہ نیچے چونے لگی میں جو گول گول شیشے ٹنکے ہیں اور سماج کی لکڑی کا بڑا پھاٹکا ہے، سب جسمی بناتھا۔ ہاں، لوہے کے یہ موٹے مرٹے

کیل بعد میں گارڈ سے لختے اور دروازے پر گئیش جی کی مرد تی؟ — یہ بھی بعدهی میں بنی تھی۔

میں یہیں ہوا محل کے اس نجارچے میں سمجھی تھی۔ ہونٹوں کا لاکھا گھوما مجھے خود بڑا لگ رہا تھا۔ مگر شسر، جیٹھہ دیغیرہ بھی پیرھی پر گئے ہوئے تھے۔ رقا بھی مندر سے ہنیں لوٹی تھیں۔ یہ بھی شہر میں نہ تھے۔ اتنا ہی پتہ تھا دیس بھر کی اونٹی قابوں میں کرنے گئے ہیں۔ ایک بار قابو آگئی تو اپنا گھر سونے کی اینٹوں سے بھر جائے گا، اگرچہ بہت سوں کے دیوارے نکل جائیں گے...

کھانا پیتا گھر زیباں سمجھی نیشن کے طور پر کام کرتے تھے۔ کھانی پکانی کے علاوہ اور کیا تھا؟ صبح ہوتی تو ہم سوچتیں — کیا پکے گا؟ دوپہر تھوڑے کپڑے ادھر ادھر پھینکنے کے بعد — شام کیا پکے گا؟ کوئی پوچھے۔ حکوم پھر کے اہر اور اڑدھی پہ پہنچتا ہے تو دو دلائیسا؟ دہی روز کی باتیں، روز کے چہرے! اس سیمری دیکھنے میں بُری نہیں لیکن کہیں جنگن، ہی اس سے اچھی لگنے لگتی۔ اس لیے جب گھر بھر سے جی ادب جاتا تو میں زیباں آبیٹھتی۔ تم نے دیکھا۔ ہے نا بالوکی ماں؟ یہ نجارچہ نیچے سے یوں ہی سالگرتا ہے، مگر ہے رامائیں کا پُشپ ٹوان۔ ایک آٹھ کلیا کمل لال سینٹ کا جسے تھا مے کھڑا ہے۔ گھر کی طرف پیٹھ کر کے دیکھو تو نیچے بادار میں سب آرجا رد کھلن پڑتی ہے۔ بھنگی، چمار، کھاد کے نئے کارخانے میں کام کرنے والے مجرور۔ یوں گریب پر بدن میں محنت کا سرور، چہرے پر صحت کا نور، سینہ تانے ہوئے یوں معلوم ہوتے ہیں جیسے چٹان سے چٹان پھوڑنے چاہ رہے ہوں۔ اس بات کی بھی پروانہیں، مجروری ملے گی یا نہیں ملے گی۔ پھر اسکے والے جن کی چھاتی کے تسلوں میں گالیاں ہی اُلبی رہتی ہیں مدرسہ کو تو کم ہی دیتے ہیں، اپنے جانور کو زیادہ۔ اپنے آپ کو سب سے زیادہ۔ اور اس پر بڑے خوش۔ مارا ماری کرتے جا رہے ہیں — تیز تیز، جیسے سوریا

پھر رب سے کرنیں پہنچنے کے امداد تا ہے۔ ادھر چھانٹا، اوہر چاپک لوگ یوں ادھر ادھر بھاگتے ہیں جیسے رات کا اپر ادھر دن ہوتے ہی کٹھڑیوں میں کچلے کپڑوں اور نالیوں میں جا چھپتا ہے۔ مُنیم، دلال، ششی دھوئی کا پتو سمیٹتے ہوتے ایک طرف ہو جاتے ہیں۔ مگر جو بیج سڑک کے جارہی ہیں۔ تو اپنی لائیں۔ ہر وقت بیٹھے رہنے سے جن کے پیٹ میں ہوا پیچھے مائیں کے نو دے چلے آئے ہیں جیسے کسی نے بڑے بڑے نکیے باندھ دیتے ہوں۔ چلتی ہیں تو پیچھے سے بُردھہ دیر بُردھہ دیر کا جاپ ہوتا ہے۔ پر اس کبھر کی ہاتھ میں پانڈے جی ساتھ میں۔ دنیا جہاں سے بے خبر۔ براشے نام گھونگھٹ کاڑھے، پتہ نہیں کس مندر کو جارہی ہیں؟ بڑے سے بڑے کا ڈنڈا بھی ان راستے کے پتھروں کو نہیں ہٹا سکتا۔ پھر اپنی جہالت برادری کے سیٹھ، جاتے باہر کے بیو پاری جن کی ہڑ بول تک میں پانی پڑ گیا ہے۔ بیج رالوں کے تھیلیاں، جن کی ہٹنا میں تاک کریں بنہ بھی دکھ رہی ہیں۔ تیس پر بھی چھوکریل کو گھور رہے ہیں۔ گھورتے مشتمل۔۔۔ بھی ہیں لیکن ایک نگاہ میں پبل پڑنے والا پیار اور آشا، دوسرا کی نظر وہ میں گھن اور نراشا۔ چھوکریاں بھی تو ان سے نہیں شرمائیں۔ شرمائیں کن سے؟

ایسی باتیں دیکھ کے جی اور بھی گھبرا جاتا ہے۔ پھر میں سامنے بیکھڑیق ہدن۔ پورا ماردار نظر آتا ہے۔ پتھر اسی پتھر۔ بالوں میں بالوں سو روشن کی ردشتی آڑی پڑتی ہے تو بالوں کی کنیتی دمک اٹھتی ہے۔ معلوم ہوتا ہے، ان گنت مہریں بڑی میں، انھا لو اور اندر بابر سبھا بجاتی۔ دلیں بھر کا سونار دپا اسی دھرتی میں چلا آیا ہے۔ بس یہی جھوٹی چھاؤ دمک ہے، ہر بالی کہیں بھی نہیں۔ کہیں کوئی جھاڑی یا کسل دوب دکھائی دے جاتی ہے لیکن درخت نام کو نہیں۔ دُود و ندہیا کے آنکن میں کوئی ٹنسا کا پتھر کھڑا ہے۔ جھیں کے کنارے، بجالی سر ہلار ہا ہے۔ وہ بھی نیچے سے ٹنڈ منڈ۔ اور ایک چھپھاسا ہے۔ وہی دل کی دھڑکن نہز کر رہا ہے۔ میں تو کہتی ہوں کوئی ہمارا سب سزاۓ لے اور پریاں دے دو۔۔۔

مان مستی، سیری ساس، مجھے ہمیشہ یہاں بیٹھنے سے منع کرتی ہے۔ لیکن جب بھی میں ہمیں بیٹھتی ہوں۔ صند کے ساتھ، ٹینگے کی طرح۔ اس کا کہنا نہ ہے۔ کھڑکی میں بیٹھنا کام نہیں بہوں بیٹھی کا۔ کھڑکی میں بیٹھتی ہے تو گنگا۔ میں کہتی ہوں ہمیں حساب ہے تو پھر ہماری طرح کی بھی گھر میں عورتیں گلے گا دیشیا ہیں۔ ہمیں کھڑکی جھرو کا بھی نہ ملتے تو اس سے مر جائیں۔ ہے نا بالوں کی مل؟ کھڑکی کے لیے عورت ہونہ ہو، عورت کے لیے کھڑکی بڑی ضروری ہے۔

لیکن اُس دن ہمیں کون توک سکتا تھا؟ گوکل اشتمی کا دن تھا۔ گوپیں کے کاہن آج کے دن پیدا ہوئے تھے۔ رادھا بازار میں کوئی ہماہی بختی؟ — رام رام اسلامی

نکانی؟ منگ کی طرح باہر جلی آئی بختی اور ترنگ کی طرح ناچتی، گاتی، بل کھلتی جا رہی تھی... سانول داس کے مندر کی طرف۔ اس میں عورتیں بھی بہت تھیں۔ جیسے ان کے نسباب اُنہوں ہے۔ دھنکے پڑتے تو بُرا اُر امنہ بناتیں۔ اُپر سے گالیاں دیتیں، بھیتر سے خوش۔ ایسا نہ مرتا تو باہر جی کیوں نکلنیں؟ یہ عجیب بات ہے۔ ہم عورتیں جس بات کو پنہ نہیں کرتیں، سخر میں نہی کرتیں۔ ہو سکتا ہے میں غلط کہہ رہی ہوں۔ مگر۔ ہمارے من کا پسارہ نہ کھا ضرور ہے۔ مردیں کو اس بات کا کیا پتہ؟ وہ تو سارا پڑھ لکھ کے بھی جانکو ہی رہتے ہیں۔

سر سید ہے — فلاں کام کرو، نہیں۔ رویں گے یا... خبردار! جو سادتری کے ساتھ منڈے تو گئیں۔ وہ اچھی عورت نہیں۔ ہوٹلوں میں جلتی ہے۔ کوئی پوچھے۔ جہیں کیسے پتے ہے جی؟ بیچارے! ہمیں جلنے کیا سمجھتے ہیں؟ نہیں جانتے جتنی دیر میں ان کے دل میں ایک خیال آتا ہے، ہمارے من سے بیسیوں ہو کے نکل جاتے ہیں۔ ہاں، تو اُس دن سب عورتیں کھڑکیوں میں چلی آئیں۔ جڑت مریت۔ انگ، بانکڑی اور گہنزوں کی نمائش تھی۔ سب عجیب سی نظریں سے نیچے بازار میں دیکھ رہی تھیں۔ پتوں سے ہٹے ہوئے، چوٹیاں نیچے لٹکی ہوئیں۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے سڑھیاں ہیں جو گھر کے بھیڑی نے لشکار کی ہیں۔ تاکہ باہر کا چوراں کے سہارے چلا آئئے اور آنکھوں کی کھڑکی سے اندک دپڑے۔ پھر بیا ہے؟

— سامنے بخوبی پڑی ہے، تالی گھر والوں کے پاس۔ ہر تھا ہے تو توڑے ...

کہاں تو میں اکیلی بھی میٹھی تھی کہاں رُدپ منی، ساس، ددا سمجھی آگیتھی۔ جسمی پتہ چلا۔ ددا تو کب سے آئی میٹھی تھی۔ کہیں اندر کے مندر میں گھنٹی بخار ہی تھی۔ ددا اور ساس دونوں ہاہر دیکھ رہی تھیں، چہرے پر کوئی اثر نہیں۔ منہ پیر گنگ لفافوں کی طرح۔ پیسے دو اور چھڑاؤ۔ نہیں۔ صحنتے دا لے کو دا پس۔ ہاں رُدپ کا منہ کھلا تھا ... میں نے کہا —

رُدپ! تو ادھر آجا چھی — بیرے پاس۔

بولی۔ — نہیں بھابی! میں ٹھیک ہوں۔

چیچے سے دستا بولی — اے! پیار سے بلاتی ہے بھابی۔ جاتی کیوں نہیں؟ رُدپ نے شک بھری نظر دی سے بیری طرف دیکھا۔ گویا مجھے اس کی کوئی بات پتہ چل جائے گی۔ میں نے یوں دیکھا جیسے نہیں چلے گی اور وہ اٹھ کر میرے پاس آجھی میں نے جو اپنی بانیہ اس کے گردوالی تو پتہ چلا، اس کے کوئے کتنے بڑے ہو گئے ہیں۔ ایک سال پہلے یہی رُدپ کچھ بھی نہ تھی۔ اب بھی کچھ ہے۔ بھی میں نے اُس سے پیار کی ایک بات بھی نہ کی تھی کہ ساس کی آواز آئی —

بہو! امرد حکم اپنا کیسے میٹھی ہے؟

میں نے اُسی دم اپنا ہاتھ کھینچ لیا اور سرد ھلنے لگی۔ میں تمہیں سچ کہتی ہوں بالوکی ماں۔ مجھے نہ پتہ تھا، میرے سر پر کپڑا نہیں — ننگی ہی میٹھی ہوں۔ متن عورتوں کی حرج جو سامنے بخار پھے میں کھڑی تھیں اور تن من بھی کو ہوا لگوار ہی تھیں۔ میں پھر دنوں ہاتھ رکھ، یہاں کھڑکی میں ٹکا، ان پر ٹھوڑی رکھ، پچھے دیکھنے لگی —

یچھے اب عورتیں تو کہیں کہیں تھیں۔ مرد ہی مرد لئے چہوں اور کوئی لمبا، کوئی نما۔ کوئی چھوٹا، کوئی مٹا۔ کسی نے داڑھی بڑھا رکھی ہے تو کوئی صفا چٹ کسی نے سر کے ہالوں کے ٹپیٹ بنائندھے پہ پھینک رکھے ہیں۔ کوئی پان کھا رہا ہے اور تھوک رہا ہے۔

کوئی بیڑی کی راکھ چیلگی سے مگر اتا ہے، کوئی حمالی دیتا ہے، کوئی گالی کھاتا ہے۔ لیکن اور کو سب دیکھ لیتے ہیں، بھلی کے تاروں کی طرف... اس سال کچھ زیادہ ہی جرد تھے۔ ایک دم یہ اتنے کھل سے چلے آئے؟ پھر میں نے سوچا آنڑا ماؤں ہی نے پیدا کیے۔ آسمان سے تو نہیں ٹپک پڑے... یعنی میں ایک ٹھٹ سا بندھا تھا اور باقی کے سب اس کے گرد گھیرا خالے کھڑے تھے۔ ان کے سروں پر کوئی سات گز کی اونچائی پر ایک رسی لٹک رہی تھی جس کا ایک سرا نگہدار کے گھر اور دوسرا چینہ دار ٹسے کے سینٹھ کے ہاں سے بندھا تھا اور اس رستی کے سپاہارے بازار کے عین یعنی مشکی لٹک رہی تھی۔ یہ درہی مشکی تھی جس میں ماتا جسرو دعا مکھن رکھ دیا کرتی تھی اور اور اپر ٹانگ دیتی تھی۔ وہ بھجتی تھی۔ منٹ کھٹ اس تک نہیں پہنچ پائے مگر وہ اپنے ساتھیوں کے کندھوں پر چڑھ کر ہی ہی جاتے تھے...

تو اس گھیرے میں سے نکل کر کچھ آدمیوں نے دوسروں کے کندھوں پر چڑھنا شروع کر دیا اور پھر ایک دوسرے کے گھے میں باہمیں ڈالئے اندر کی طرف منہ کر کے کھڑے ہو گئے۔ پھر دوسرا پر آیا تین آدمیوں کا ادھ پہلے چھو کے کندھوں پر چڑھ کر کھڑا ہو گیا۔ آخر بھیریں سے سافو سے زنگ کا ایک جوان لہماں نکلا اور پھر تی سے باقی سب پر یوں چڑھ گیا جیسے وہ مرد نہیں، سیر ہیاں ہیں۔ شکر پر ہی ہی کے وہ کھڑا ہو گیا۔ اس کی قیص میلی تھی اور اس پر زنگ گرا ہوا تھا، بیٹھنے کھلے تھے... میں تو تم سے سب بات کر سکتی ہوں، بالو کی ماں، جیسے تم مجھ سے کر لیتی ہو۔۔۔ میرا دل و حذر اٹھا۔ اس لئے بھی کہ اس کے پیرا بھی نہیں جھے تھے۔ وہ گر بھی سکتا تھا۔ ایک دم اس کے پیر کھڑا سے اور وہ جھک گیا اور پھر اسی دم تن کے کھڑا ہو گیا۔ اب اس کے پیر جمپکے تھے...  
تو گوں میں ایک شور سا ٹھک گیا۔ دہاں کھڑے ہوتے ہی اس لڑکے نے سیدھا اس

طرف دیکھا جہاں میں بیٹھی تھی۔ ایک بھلی سی میرے بدن میں دوڑ گئی۔ پھر اس لڑکے نے دلوں ہاتھوں کے پنجے ایک دسرے میں گاڑ دیئے اور سر کے اوپر اٹھا کر ہاتھ پلاٹئے کاپنا۔ سنبھلا... مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے نہ ہو میرے منہ کو آرہا ہے۔ میری گنپیاں تک کلانے لگیں۔ آخر اس نے ایک ہاتھ اوپر کر کے مٹکی تھام لی لوگوں میں خوشی کی ایک بہر دوڑ گئی۔ وہ مٹکی تک پہنچ گیا تھا۔ اب اس نے دلوں ہاتھوں سے اسے تھام رکھا تھا۔ اس نے پھر اس طرف دیکھا جہاں میں بیٹھی تھی، روپو بیٹھی تھی، ساس اور دو بیٹھی تھیں۔ مجھے ایسا لگا جیسے وہ میری ہی طرف دیکھ کر مسکرا رہا ہے، جیسے وہ مجھے جانتا ہے۔ میں نے اُسے کبھی دیکھا ہے لیکن جانے کتنی پرانی بات ہے جس میں سکے نے تصویر دھوڈالی ہے، لکیری سی رہ گئی ہیں —

میں نے چور نظر دیں سے روپو کی طرف دیکھا۔ وہ ابھی تک منہ کھوئے بیٹھی تھی۔ جیسے پچے تماشے میں کھو لکر بیٹھتے ہیں۔ مجھے یوں معلوم ہو رہا تھا جیسے میرا بدن جل رہا ہے۔ اس میں سینک نکل رہی تھی اور آس پاس بیٹھی عورتوں کو لگ رہی تھی۔ مجھے یقین ہے مجھ سے بُواٹھ رہی ہو گی گر کسی نے پچھہ کہا نہیں... .

اب تک میری جیٹھانی بھی آبیٹھی تھی۔ ایک میں ہی تھی جس کے ہاں لاکھ کرنے پر بھی کوئی بچھے نہ ہوا اور ایک ددھتی ہر سال جس کے پیٹ میں سے ایک کیڑا باہر چلا آتا تھا۔ اور میری جیٹھانی کو وہم کی بیماری ہو گئی تھی۔ ایک میں تھی جسے کوئی چیز گزندگی نہ دکھائی دیتی تھی اور ایک دہ جسے ہر چیز غلافت سے پڑی مری معلوم دیتی۔ ہر وقت ہاتھ، منہ، کپڑے دھوتی رہتی۔ خاص طور پر نل۔ اب بھی وہ نل کو راکھ سے ماں بچھ کر ہاتھ دھوتی ہوئی چلی آئی تھی۔ ہاتھ تو لیے سے نہ پوچھے تھے کیونکہ گھر میں ہر آتا جاماً اسی تو لیے کو استعمال کرتا تھا۔ اکر اس نے گیئے ہاتھ بھی جھٹکے تو پانی کے چھینٹے مجھے پڑے۔ یوں لگا جیسے اور ٹکی دھرتی پر برسات کی پہلی بُوندیں پڑی ہوں

اور بھک سے مدد گئی ہوں۔

میں نے مرد کر دیکھا، روپو جا چکی تھی۔ شاید میرے پاس بیٹھ کر اُسے سینڈ لگ رہی تھی۔ یا پھر دُہری اس کی بھید بھری باتیں۔ کبھی پتہ نہ چلا اُنکے دم کیا کرے گی؟ اتفاق سے نظر نیچے گئی، تو وہ اُسی ساعت کے پھانٹ سے باہر کھڑی تھی اور اٹھتی کے جلوس کو دیکھ رہی تھی۔ جبھی وہ لڑکا لمبے لمبے ہاتھ ڈال کر مشکی کے پانی کو باہر گرا رہا تھا۔ پھر وہ ہاتھ مار کر اسے توڑنے لگا۔ مگر وہ مشکی جلنے کس مٹی سے بنی تھی کہ نوٹھتی ہی نہ تھی۔ آخر وہ اُسے مٹکے مارنے لگا۔ جب اس پہ بھی نہ ٹوٹی تو اس نے مشکی میں اپنا سر مارنا شروع کر دیا۔ جانے کیا ہوا؟ میری آنکھیں آپ سے آپ بند ہو گئیں۔ پھر خوراکھلیں تو وہ ابھی تک سر مار رہا تھا۔ اس سے پہلے کہ میں پھر آنکھیں لوٹ لیتی، مشکی بچوٹ چکی تھی اور لوگ شور مچا رہے تھے۔

لڑکے نے چاروں طرف دیکھا۔ اس کے سر کو لگی صز در تھی مگر چہرے سے اس نے کوئی بات ظاہر نہ ہونے دی۔ اس نے جیب سے میلا کچیلا ایک روپال نکالا اور گردن پوچھ لی۔ پھر وہ اپنے آپ مجھک گیا اور ہولے ہولے نیچے اُترنے لگا۔ اس کے پیر کانپ رہتے تھے۔ نیچے کے پرے پھر سخن کے دل کھڑا گیا۔ وہ گرا... میں پکی گربے شار لوگوں نے ہاتھ پھیلا کر اسے بجا لیا۔ دتا نے میری طرف دیکھا اور ہنس دی۔ میں نے تیور چڑھا لیے۔ میں دیہی سمجھتی کی بیٹھی رہ گئی۔ نیچے دیکھا تو وہ لڑکا کہیں بھیڑ میں گم ہو چکا تھا۔ میں یوہی مورکھوں کی طرح اس طرف دیکھتی رہی۔ جی چاہا نیچے لپک جائیں اور اُسے ڈھونڈ دھاٹ کے پوچھوں۔ کہیں بہت نہ ہیں لگی؟ مگر... میں یہاں سے ایک دم کیسے جا سکتی تھی باہر؟ صدیوں کی بنی رسم کو پل بھر میں کیسے توڑ دیتی... من کو ماں کے یہاں بیٹھی اور سوچتی رہی۔

رات آگئی۔ اٹھتی کی رات۔ میری طبیعت جب تک بہت بوجمل ہو چکی تھی۔  
تلکا نور دہرانہ کیا تھا لیکن اتنی تھک گئی تھی کہ بس... آج گھر میں ایک ہی چیز کام  
کی ہوتی اور وہ یہ کہ ارہر کی دال ن پکی تھی اور نہ مڑد، نہ کڑھی۔ میری جیٹھانی نے کھل  
کی دہ پیاری سبزی بنائی تھی کہ زبان سے الگ نہ ہوتی تھی۔ بالکل مانس کا مزا تھا۔  
ہاں، بالو کی ماں! تم سے کیا چھپانا؟ میں نے مانس کھایا ہے۔ چوری چوری کئی بار کھایا  
ہے ...

روپو آگئی۔ دیسہ می بے وجہ نہستی ہوتی۔ بہال بیترز سے آٹھنا دبھر ہو رہا  
تھا لیکن وہ تھی کہ اپنے سبک پاؤں پہ ادھر سے ادھر، ادھر سے ادھر پھیلتی جا رہی تھی۔  
اتنی چہک اس میں کہاں سے چلی آئی؟ میری طرف دیکھ کر وہ شرارت سے مُسکرائی  
اور بولی —————

بھیا کب آنے والے ہیں چھوٹی بھابی؟  
میں نے کہا ————— کیوں؟

رد پا سمجھتی تھی کہ اس کے بھائی کے نام پہ میں شرما جاؤں گی جیسے دوسری  
عورتیں اپنے مرد کے نام پہ شرما جاتی ہیں۔ مگر، ہماری شادی اب کوئی نئی بات نہ تھی  
اور شرمانے کی اتنی بات ہی کہاں رہی تھی؟

رد پابولی ————— پتہ بھی ہے آج ہند دے یہیں؟ وہ جھونٹا دیتی کہ آسکن سے  
جا رکھتی۔

اُد نہہ! ————— میں نے بیزاری سے کہا اور چپ ہو گئی۔

— روپا جنم آشٹی کے دن بھے اور اپنے بھتیا کو ہندو میں بٹھا کر بڑی خوش ہوتی تھی۔ پتہ نہیں اسے کیا سوا دیتا تھا۔ شاید یہ سمجھتی ہو گی رادھے شام کی جوڑی ہے۔ جب کہیں لمبا اور تیز جھوٹا دیتی تو میں ڈر کر ان سے چھٹ جاتی اور روپا دیکھ کر بہت ہنستی۔ یعنی میں میں ایک دوبار گرگئی اور یہ بے تمام بھی نہ سکے میری جیٹھانی کے پھوٹ نے بیر کھا کھا کر گٹھ دیا جگہ جگہ پھینک رکھی تھیں۔ ایک میرے سر میں گھٹھی۔ جب سے میں نے جھوٹے ہندو لے پہ بیٹھنا ہی چھوڑ دیا۔ مشتعل بھی ان کا سہارا لیتے کی بجائے رستہ تمام لیتی جس سے روپا کا سب نمائش ختم ہو گیا۔

روپا بیٹھی رہی اور ہر قسم کی شراری میں کرتی رہی۔ کبھی وہ میرا کے بھجن گانے لگی۔ کبھی بلجے میں فلم کا ریکارڈ لگا دیتی اور تالی بجا بجا کر سانہ ناپنے لگتی۔ آج وہ بہت خوش تھی۔ جب تک ان کے پتا اور بڑے بھائی آگئے تھے۔ میں جانتی تھی دا، ساس اور جیٹھانی ہندو لے دیکھنے کی تیاریاں کر رہے ہیں۔ میں سوچ رہی تھی اب سانول داس کے دیوال جانے کے لیے کہا تو میں کیا بہانہ کر دیں گی؟ جبھی بھے اس لڑکے کا خیال ہجی جس نے ملکی پھوڑی لختی۔ میں نے بڑے پیار سے روپا کو بلا تے ہوئے کہا —

روپا — تو نے دیکھا تھا آج کا جلوس؟

روپو نے ایک دم چونک کر میری طرف دیکھا اور بولی — ہاں، بھائی!

میں نے پوچھا — اور وہ ترپالی دیکھی تھی؟

روپا بولی — ہاں۔

اوہ اوہ لڑکا؟

روپو نے پہلے انکار میں سر ٹلا دیا اور پھر — اقرار میں۔ وہ اتنی جلدی میں تھی کہ کچھ فتحیلہ ہی نہ کر پائی۔ اس نے ایک تیز سی نظر مجھ پر کھینکی اور حُب کھڑی ہو گئی۔

میں کچھ نہ سمجھی۔ آتا میں ہی پوچھنے لگی۔ — کون رٹکا بھلا ہے  
و دپونے منے دسری طرف کرتے ہوئے کہا۔ — مجھے کیا معلوم ہے  
اڑے دہی؟ میں بولی۔ — میں پھر ڈ...

اول صرف روپا کو چھیرنے کے لیے میں نے کہہ دیا۔ کیسے تمہاری طرف دیکھے  
دیکھے کے ہاتھ نہ آتھا۔ اشارے کرتا تھا جیسے اچھی طرح سے جانتا ہو۔ میں چاہتی تھی  
روپا مجھے چھیرے۔ مجھے کہے — وہ تمہیں بلارہا تھا، بھائی! ... مگر روپا  
چیبدار ہی۔

نصرت چُپ... اُس کی ساقی تیز ہو گئی۔ اس نے پھر مجھے دیکھا جیسے میرے  
اندکی کوئی چیز ٹول نہیں ہو۔ ایک پل کے لیے تو میں بھی گھرا گئی۔ پڑیں نے سوچا۔  
میں نے کیا کیا ہے جو خداہ مخدوہ کی چوریں؟ میں نے دلیری سے روپا کو اور بنانا شروع  
کیا۔ جب وہ بہت گھرا تی تو میں سمجھی، اس کی تر عادت ہے؟ ... مجھے کیا پڑتا، آج  
کیا ہونے والا ہے؟ میں نے مسکراتے، سر ہلاتے ہوئے کہا۔ — کیسے سرمار مار کے  
میں پھر ڈیتھی اُس نے؟

روپا اسی طرح اٹھ کھڑی ہوئی اور جانے لگی۔ میں نے دیکھا پہلو سے اس کی  
دھوتی پھٹی ہوئی تھی اور اس سے پرے کچھ خون کے دھستے تھے ... روپا ایک سال  
سے رجبول اتھی۔ میں نے کہا دہ پھر شروع ہو گیا ہے اور یہ پھوڑنہیں جانتی۔  
دھوتی تو بدل کتیا! — میں نے نفظوں کو تھوڑا چباتے ہوئے کہا  
— پھٹی پڑی ہے، اسب لہو لگا ہے۔

روپا کچھ کھڑی اور دھوتی میں پھٹی ہوئی جگہ اندھون کے نشافوں کو چھپاتے ہوئے  
ھڑبرڈا کر باہر نکل گئی۔

میں نے اس دافع کو کوئی خاص دہ نہ سمجھا۔ ایسا تو تربیت تربیت ہر لڑکی نے۔

ساتھ ہوتا ہے 'جب وہ عورت بنتی ہے۔ ہو لے ہو لے وہ اپنا آپ سن جانا یا کہ لیتی ہے۔ کئی جب بھی پھر ہر ہی رہتی ہیں ... میں نے سوچا، یہ بھی پھر ہر ہی رہے گی — روپا!

رات جو کچھ ہوا، اس سے مجھے پتہ چلا یہ سب جادو کٹیا کے تباہ نے جگایا ہے۔ مجھے کیا پتہ بالکل مان؟ تو تو جانتی ہے ہم یونہی پیار سے بھی ایک دسری کو کٹیا کہا کرتی ہیں۔ میرا یہ مطلب تجزی تھا؟ ہم ہندوؤں پر گئے۔ روپیے پیے، سرنے چاندی کی ہمارے دلیں میں کیا کمی؟ کنوس لوگ، پیے پیے کے لیے مرنے والے ... شادی بیاہ، تج تیو ہار پر سب کو نوں کھدر دیں میں پڑی دولت اٹھاتے ہیں اور بیج چوڑا ہے پر کھدیتے ہیں۔ گویا کہہ رہے ہوں۔ دیکھو... دیکھو اور جلو۔ میں کیرتواس ہوں، جس کی دسم باد میں تین کوٹنے کی کائیں ہیں۔ لکلتے میں رہتا اور پلاش کا سب سے بڑا کارخانہ۔ بھئی میں کاٹن گریں کے گودام اپنی رعنی سے بھرے پڑے ہیں ... تو سانول داس کے دبول میں لاکھوں کا چڑھادا چڑھا گیا۔ میرے سُر نے مورتیوں پر سونے کا پتزا جڑدا دیا اور شبام سند رکی آنکھوں میں بڑے بڑے نیلم لگوادیئے۔

میں اگر چھکی ہاری تھی مگر ساتھ چلی گئی تھی۔ یوں ہی ... ایک امید کے راستے اور کچھ نہیں تو روشن دیکھ دوں گی۔ مگر میں کیا رکھا ہے؟ پڑی رہی تو اپنے آپ کو کھ جاؤں گی۔ وہاں بھیڑ میں دو چار دھکوں کے سوا اور کچھ نہ ملا ... اور اس کے بعد تم گھر پلے آئے۔ روپا نہیں آئی تھی۔ سب منت سماجت کرنے رہے مگر روپا نے ایک بھی نہ پکڑ لی۔ سب جانتے تھے یہ ایسا، می کرتی ہے اس لیے ساری پرواکے ہوتے ہوئے بھی کسی نے پرداز کی۔

دوستے سکے اور گھر پہنچ کے میں نے بار بار سوچا۔ یہ ہی آجائیں۔ مگر انہیں کیا پڑی تھی؟ انہیں تو دلیں بھر کی ارنڈی پاہیبیتھی، دنیا بھر کی دولت پیے پیے

اور پیسے کے سوا انہوں نے کچھ سوچا نہ ان کے باپ دادا نے۔ ہماری کتنی خواہش  
ہوتی ہے، بالوکی ماں! ہم اپنے بیوی کے ساتھ باہر جائیں۔ میں تو کہتی ہوں اس بات  
میں پتی پریم بھی اتنا نہیں ہوتا جتنا یہ خیال ہوتا ہے کہ باہر جائیں۔ اپنا آپ  
ذکھا ہیں اور حب کوئی بہت دیکھے تو اپنے ہی مرد کے کندھے پر ہاتھ رکھ لیں اور کہیں  
بھگوان نے سب دیا ہے۔ تم کیا سمجھتے ہو؟! تم بیٹھو، ٹھنڈی ٹھنڈی  
سانسیں لو۔ آپس بھرو، جلو، مرد ...

ماں، ہم اتنا ہمار شنگار، زیور کپڑے کیوں پہننی ہیں؟ اسی لیے ناک کوئی دیکھے  
گھر ہاتھ نہ بڑھائے اور پھر اس سارے انکار میں اقرار چھپا ہوا من کے کسی کو نہیں میں  
ایک چیز پڑی رہتی ہے جو برآتے جلتے من پلے کی ہمت کو لکھاتی ہے ...  
گھر آتے ہی میں سیدھے اپنے کمرے میں چلی گئی۔ اندر سے دروازے بند کر کے  
میں نے اپنے سب کپڑے انارڈیئے اور آئیئے میں اپنا آپا دیکھنے لگی۔ کبھی اونھرے  
کبھی اُدھر سے۔ پھر بھی بجھا کر ایسے ہی بستر میں لیٹ گئی۔ باہر کسی نے ہلکے سے  
دروازہ کھلا کھٹایا —

میں چونک اٹھی — کون؟ — میں نے پوچھا  
آہستہ سے آداز آئی۔ میں — روپا!

میں نے پاس پڑی جادر پیٹ لی اور اٹھ کر دروازہ کھولا۔ روپا اندر آئی۔  
وہ درہی تھی۔ زار زار درہی تھی۔ آتے ہی وہ میرے قدموں پر گر پڑی۔ اور  
جو لی ... میری لاج رکھ لو، بھابی! میں مر جاؤں گی۔ کسی سے کہہ دیا تو میں کہیں  
کی نہ رہ جائیں گے۔

میری سمجھ میں جب تو کوئی بات نہ آئی۔ مگر ہم عورتیں! ... میں  
نہ یوں ہی کہہ دیا۔ نہیں، میں کسی سے نہ کہوں گی۔ اور پھر — یوہنی ...

کیا ہوا؟ روپا بولی۔ تم ٹھیک کہتی ہو بھائی۔ وہ مجھے جانتا تھا۔  
وہ کون؟ — میں نے پوچھا۔

اب نبومت — وہ بولی۔ دہی ٹھکی پھوڑ۔

تیراستیا ناس! میں نے دل میں کہا...

روپا بولی۔ جب بھی رادھا بازار سے گزرتی نا کے پس مجھے مل جاتا، اشائے کرتا، سیٹیاں بجانا۔ لیکن میں پاس سے گزر جاتی، بڑے بڑے منہ بناتی، خالیاں دیتی۔ لیکن آج، پتہ نہیں مجھے کیا ہوا۔ میں بھیریں جعل گئی۔ صرف اس کے انگلی انھلنے پر... اور پھر ہم درقول بھیری سے نکل گئے اور شومندر میں چلنے گئے جہاں مسافروں کے لیے کوٹھریاں بنی ہیں۔ میں کانپتی جا رہی تھی۔ اس خر میں نے سوچا بھی کہ بھاگ کھڑی ہوؤں۔ مگر مجھے کچھ کرتے نہ بنی... اس کے بعد میں اندھی ہو گئی!

میں سچ کہتی ہوں بالوکی ماں۔ میرا سارا بدن کا پسند نہیں لگا۔ پہنچے غصہ آیا، نفرت پیدا ہوتی۔ پھر سب کچھ جانے کیے اپنے آپ دھل گیا۔ میں جی ہی جی میں اپنی مُرکّتائی پہنسی۔ مجھے بھی کیوں نہ پتہ چلا، جب میں نے روپو سے یہ سب کہا تھا؟ ابھی بارہ دن، ہی تو ہوئے تھے جب روپو نہایتی... اور آج... اچھا، اچھا... تو فکرنا کر۔ میں نے روپو سے کہا۔ تو نے کون سا ایسا کام کیا ہے جو کسی ماں کی بیٹی نہیں کیا۔ مگر اب تو اپنا آپا سنبھال۔ ہمینہ بھرا پناحال بتاتی رہنا، مردی۔ کچھ ہو گیا تو کیس کی نرہ جلتے گی۔ صبح میں تجھے میتھرے ابال کر دے دوں گی۔ اب تو سورہ۔ یہیں۔ میرے پاس۔ کہاں جائے گی؟ میں کو کی میں؟ سب سوچیں گے۔ یہ کیا ہو رہا ہے؟  
کون چل رہا ہے۔ اس آدمی رات کے وقت؟ —

— امدُسی! میں تیری شادی کی بات چلاؤں گی۔ تو اُنہیں آں سرت کیجو۔ کرنا ہی ہے تو بس دکھاوے کے یہے۔ اتنا ہی جتنا ہم سمجھی کرتی ہیں۔ میگی پھوڑ یونہی سا

ہے کوئی راج مجوہ۔ اس کا تو سوچ بھی مت... ہاں... جو بات اچھی نہیں ہے، اچھی نہیں ہے اور جو اچھی ہے سوا اچھی ہے۔ بھگوان نے تو مرد عورت کو بنادیا۔ اور جب سے دنیا بنتی ہے وہ ایک دوسرے کے تیجھے بھاگ رہے ہیں اور بھاگنے رہیں گے۔ جیسے چاند سورج بھاگتے ہیں۔ لیکن وہ بھی ایک راستے پر جاتے ہیں۔ یہ نہیں۔ اس گلی، اس بانڈار سے راستہ کامٹا اور پکڑ لیا ایک دوسرے کو۔ ایسا ہوتا ہے دنیا، یہ سنوار، یہ دھرتی، یہ آکاش سب نہ کہ ہو جائیں۔ سال کے دن کتنے ہوتے ہیں؟ ۔۔۔ تین سو پیشہ۔ ان تین سو پیشہ دنوں میں ایک بار چاند سورج کو ادا۔ ایک بار سورج چاند کو پکڑ لینا ہے اور اس... اس لیے انسان نے اس چاند سورج کا بھی راستہ بنادیا ہے اور وہ ہے شادی کا راستہ۔ اس کے سوا کوئی دوسری چیز نہیں شادی ہوتی ہے۔ تباہی بہن خود لڑاکی کا ہاتھ پکڑ کر رڑکے کے ہاتھ میں دے دیتے ہیں۔ پھر تو کوئی راجہ مہاراجہ، نج، دیوان بھی کچھ نہیں کر سکتا... اور میں نے روپا کو چھاتی سے لگایا۔ اس کی بہت کچھ تسلی ہو گئی تھی۔ میرے پاس پڑے پڑے رہیں سو گئی۔۔۔ نیند نہ آئی تو مجھے۔ یوہنی جماں یاں لیتی اور ہر سے اُدھرا اُدھر سے اُدھر پہلو بدلتی رہی۔ کبھی کبھی میرا ہاتھ روپا کے بدن پر پڑ جاتا۔ مگر وہ بے ہوش پڑی تھی۔ سب کچھ کرشن کے ایک سکھ کی نیند لے رہی تھی اور میں۔۔۔

مگر کچھوڑ... روپا کے بھیا... روپا، آئینے میں اپنا بدن۔ یہ سب کچھ آنکھوں کے سامنے گھومتا رہا۔ پھر میں سوچنے لگی، یہ جو روپا سے کہتی رہی ہے۔ سچ بھی ہے اور جھوٹ بھی۔ سچ اس لیے کہ کوئی قانون تو ہونا چاہیے۔ یوں ہی مرد عورت ایک دوسرے سے ملتے پھر میں تو اولاد کو کون سنھا لے؟ کفیل کیسے بنے... اور جھوٹ اس لیے کہ شادی کے ایک دو سال تک سب ٹھیک رہتا ہے۔ پھر ہو لے ہو لے مرد عورت ایک دوسرے کو آتا جان لیتے ہیں کہ پھر جاننے کی بات بھی نہیں رہتی جیسے کوئی

آدمی بہر سال آبوجایا کرے یا سو سرخ تھصیل کے ہزاروں چکر کاٹ ڈالے۔ پھر سوزی کی گھسا ٹیبل ہی پڑھنے کا مزاح ہے۔ نہیں رون سو جاتی ہے اور ہوئے ہوئے جسم بھی مردہ ہو جاتا ہے۔ بھی تا... کسی دمرے کا ہاتھ لگئے تو جسم اور روح دونوں چونک کر جاگ اٹھتے ہیں۔ بیا ہتنا جیون میں یہ سب ہو سکتا ہے اگر عورت ماٹیکے بی جاتی رہے چاہئے وہ سب کا ماٹیکہ ہو یا مرد دورے پر پڑھا رہے۔ کسی ایسی ٹہری میلوے کا گارڈ ہو جو ہمیں بعد گھر لوٹتی ہو۔ جب لھی۔۔۔ تبدیلی قانون ہے قدرت کا... ہمیشہ گرمی نہیں رہتی، نہ سردی رہتی ہے... مشکل کپش کی رات کا اپنا جادو رہے اور کرشن کپش کی رات کا اپنا... سانپ کی کمال بھی اچھی ہے اور مور کے پنکھ بھی۔ پھر رنگ یہیں، خوشبویں یہیں، آوازیں یہیں... ان جانی، ان گنت...

شادی بہت اچھی چیز ہے، باٹوکی ماں، پر کیا سماں نہیں آیا اس میں تھرڈی سی تبدیلی آجائے؟ یہ مرد عورت دونوں سے ایک ہی باستکھے۔ اس چھت کے نئے نئے دنوں رہو گئے۔ یہاں جو بچے پیدا ہوں گے، انسان ہی کے ہوں گے۔ مرد باہر کام پر جایا کرے گا۔ عورت گھر سنبھالے گی اور لبیں... ہے بھگوان! میں کیا کچھ کہہ گئی۔ میرا مر امنہ دیکھو، باٹوکی ماں۔ جوان باتوں میں تے ایک بھی کسی سے کہو یہیں سچ کہتی ہیں، بجھے کئی بار خیال آتا ہے۔ میں بیوی ہرنے کی بجائے ان کی پرتیا ہوتی تو کتنی نوش رہتی۔۔۔!

ساری رات میں نے جاگ کے کاٹی۔ ساری رات میں مولی پڑنگی رہی جب صحیح ہوئی تو یہ چلے آئے۔ میں لپک کر دردازے کی طرف گئی مگر انہیں مجھ سے بات

مختوڑی کرنا نہ تھی۔ میری طرف تو دیکھا بھی نہیں۔ آنکھوں ہی آنکھوں میں اتنا ہی کہہ سبیتے کہ پان بھئی تو بھئی کوئی ہے۔ باہر جانے والے کا کیا ہے؟ ہزار سکل دیکھ کے آتا ہے یہم ہی کھر میں ایک دوسرے کامستہ نکال کرتی ہیں اور پڑپے پڑپے باسی روٹی کی طرح ہو جاتی ہیں۔ ہاتھ لگاؤ تو کھنڈی ٹھار، کھاؤ تو گرمگرم ...

ارندی کا سو داگرا ہو نہیں —۔ چکڑی تو دیکھو۔ کیسے پیچ کے پیچ گلے میں پڑتے ہیں جیسے مار کھا کے آیا ہے اور صند پہا بخن کے کوئے کا بڑا دھکہ کھنڈ کیا ہے ... کوئی جنم دوت سعلوم ہوتا ہے، پینک کا بھوت؟ ... کرے میں اور کسی کے جانے کی بہت نہ تھی۔ دا شے دذا کے ... دذا کی تو اسے بولے —۔ دذا جی۔ اسے کہو۔ پچھی سستی کا گلاس بنادے۔

اس ساری نفرت کے باوجود میں اپنے آپ چل دی۔ لستی بنائے۔ فرمی صدیوں کی عادت۔ پہل بھر میں مختوڑی چلی جاتی ہے؟ میں نے جی میں کہا۔ بڑا آیا ہے، حکم چلانے۔ جیسے میں کوئی لوندی باندی ہوں؟ ہاتھ جوڑے کھڑی ہوں؟ حکم کی دیر ...؟ مگر میں نے جلدی سے پچھی لستی بنادی۔ روز برا بھی جاگی تھی۔ لپک کے باہر جونکی تو گلاس سے مگرائی۔ لستی سے میرے کپڑے تر ہو گئے ... پھر جو پچھی تھی پیچ دی۔

میں تھیں پیچ کہتی ہیں، بالو کی ماں۔ رات تک؛ باپ اور دلوں بیٹھے باہر نہیں نکلے۔ آپس ہی میں کچھ کھڑک پھر کرتے رہے۔ میں نے سوچ لیا۔ باگھر سونے کی بیٹوں سے بھر گیا اور یا پھر سب کچھ پاک گیا۔ یہ اندی پیز ہی ایسی ہے۔ اگر تم اسے دیکھو تو بالکل پڑھنے چلتا، کسی کی قسمت بناسکتی ہے یا بھاڑ مسلکتی ہے۔ ہمارے دلیں کی اندی، تو ریئے موگ۔ پہلی دلیں وہ طاقت ہے، جو کسی دوسرے دلیں کی زدده بالا نہیں۔ کہاں ہل بو تھے یہیں پیچ بو تھے یہیں۔ کار خانوں میں، مجرور محنت کرتے ہیں، لیکن ان کی قسمت کے فیصلے ان کو دل میں بیٹھے، سیپھے لوگ کرڈا لئے ہیں،

جوہل چلانے میں نہیں، بونے میں نہیں، محنت مجبوری کرنے میں نہیں۔

میں چاہتی تھتی باہر آئیں تو آج ذرا ان سے دو باتیں کروں اور کہوں، پیسے کے پنجاریو! ایسی دنیا بھی ہے جو پیسے کے سامنے مانگنا نہیں ٹیکتی۔ جیب سپیسے نکال کر یوں کھینک دیتی ہے مطلب کی چیز خرید لیتی ہے اور پھر جل دیتی ہے آگے — دیکھ رہا تھا میرے گھر دل میں کیا ہوا ہے؟ مہروں سونے چاندی میرے جواہرات کی کھان میں تم نے ہم سب کو قید کر دیا ہے اور ہم بھوکوں مر رہی ہیں۔ ہیرے جواہر تو نہیں کھا سکتیں؟

دد نکلے... باپ اور دنو بیٹے۔ چھرے پر خوشی، نرخ - اور پھر گھر سے باہر چل دیئے۔ ہم عورتیں ہلکا بکا کھڑی رہ گئیں، سوچنے لگیں آج اور ہر میں کچھ کالا کالا ہے۔ دو آٹی اور بولی۔ ارندھی میں دش بارہ لاکھ کا گھانا پڑا ہے اور یہ لوگ دیوالے کے کاغذ لکھنے جا رہے ہیں۔ کل کچھری کھلنے کی تو داخل کر دیں گے...

دیوالہ!... ایسے کیا دیکھ رہی ہو، بالوکی ماں؟ — میرے بیٹے دیوالہ مر جانے کی بات ہے۔ ان سیٹھیوں کے لیے نہیں۔ یہ تو جتنے دیوار نکلیں اتنے ہی امیر سمجھے جاتے ہیں۔ بات یہ ہے ہر دیوالے میں یہ کچھ اور نیچے کر جاتے ہیں، جس سے لاکھ دولاکھ کا ناٹدہ ہی ہوتا ہے، نقصان نہیں۔ اس سے پہلے میرا مسرا اور اس کے بیٹے چار دیوالے نکال چکے تھے اور یہ پانچواں تھا!

رات بھر یہ "مرد لوگ" نہ آئے۔ دن بھر کچھری میں رہے۔ شام کو میں اسی بخار پھے میں بٹھی تھتی۔ سامنے اپنے شسر کو آتے دیکھا۔ کر کی طنابیں دھیلی کرتے ہوئے میرے جیبھ کی موٹے شیشوں والی عینک ناک کی چوچ بے آگئی تھتی اور یہ! — آن کے ممنہ پہ لکھوڑی اور کالک کھنڈ گئی تھتی...

دو سال تک انہوں نے روپا کا کچھ نہ کیا۔ میں نے پہلے اس بیچاری کے خیال سے صاف صاف کچھ نہ کہا۔ اشارے اشارے میں سب کہہ دیا مگر انہوں نے میری ایک سانہ مانی۔ کوئی ایمیر گھرد نہ کہنے میں وقت صنائع کر دیا۔ روپا نے اتنے عرصے میں زمین آسمان تک کر دیا۔ اسے اب ہر آدمی ملکی پھوڑ نظر آتا تھا۔ کب تک گلی محلے کی نظر دل سے یہ بات چھپی رہ سکتی تھی؟ آخر ایک دن تینوں باپ بیٹوں نے مل کر روپا کو خوب چھڑا۔ چھڑانے میں مجھے بھی پڑ گئیں۔ پھر انہوں نے اسے ایک کوٹھڑی میں بند کر دیا۔

روپا کو تو کچھ زیادہ نہ محسوس ہوا۔ میں پا گھل ہو گئی۔ اندر جاتی تو روایتی، باہر آتی تو روایتی۔ میں نے ساس کی منتیں کیں۔ دُو کے سامنے مانھوار کردا اور کہا۔ کیا یہ صفر دی ہے؟ اچھا سالا کا دیکھو جو کھاتا کھاتا ہو۔ باپ سیدھے ہو تو کسی اچھی فوکری میں ہو لیکن یہ کسی ایسے کی تلاش میں تھے جو ان ہی کی جات برادری کا ہو، جن سے یو پار کا رشتہ بھی بڑھے۔ مگر ایسا کوئی نہ تھا۔ تھا بھی تو بڑی ناک دala۔ بہت پیسے مانگتا تھا...  
لاکھ دو لاکھ کی بھی بات نہیں — پانچ لاکھ!

روپا کھل کھلنے لگی۔ اس نے دُن کہہ دیا۔ شادی کر دی گی تو اُسی ملکی پھوڑ سے ملکی پھوڑ کا اصل نام شیتل داس تھا اور وہ آتشبازی کی دکان کا مالک تھا۔ آمد فی کوئی اتنی زیادہ نہ لختی لیکن دیوالی کے ادھر ادھر اتنا پیسہ کمالیتا تھا کہ سال بھر کے لیے کافی ہو۔ خود شیتل داس تھا مگر کام ہوائی پڑنے کا۔ اپنا من شیتل ہو یا نہ ہو لیکن دوسرے کا ضرور کروتا تھا... دیول نگری میں دو چار ہی بنکے تھے جن میں سے ایک وہ بھی تھا ہر کھیل تمثیل

میں آگئے، راس بیلا کا بندوبست اس کے پیرو د۔ وہ مہما بھارت کا کنس تھا تو راماٹی کا راون!

لیکن روپا اب اُسے نہ مل سکتی تھی۔ نہ اسے گوکل اشٹی کے دن سانوال داس کے دیول میں جانے کی، جاہنگیر تھی اور نہ راس بیلا۔ سہرے میں حصہ لینے کی چھٹی... مجھے آسے دیکھ دیکھ کے ترس آتا تھا۔ میرے دل میں جانے کیا کر انکی کی لہرائی۔ شرمند رجل نے کے بہانے میں نے کپڑے دغیرہ پہنے اور چلنکی شیتل کی دکان را دھا بازار اور رہو نامنہ بازار کے سنگم پر تھی جہاں مہما بیر جی کا مندر ہے اور لال رنگ بکھر رہتا ہے، ہر آنے جاتے کو لگتا ہے۔ کار بیوہار پر آنے جلنے والے لوگ وہاں تھوڑی دیر کے لیے کھڑے ہوتے ہیں، ہاتھ جوڑتے ہیں، آنکھیں بند کرتے ہیں اور کچھ دیر کے بعد نجیر دل کے ساتھ لگی ہوئی گھنٹیوں کو بھلتے اور چل دیتے ہیں۔ سامنے واپس ہیں اور پیچے گائیں بیٹھی جھکالی کرتی ہیں؛ دراہیں کوئی نہیں رد کتا۔ کمیٹی بھی کچھ نہیں کر سکی۔ کوئی موڑ نامنگے والا آتا ہے تو رُک جاتا ہے اور پھر گاڑیوں کو ادھر ادھر سے گھٹا کر اپنا راستہ بناتا اور چل دیتا ہے۔

میں جا کر شیتل کی دکان پر کھڑی ہو گئی۔ کئی لڑکے اُس کی دکان پر کام کرتے تھے وہ صرف اپنے بالوں میں نگھمی کرتا اور لڑکوں کو موٹی موٹی گالیاں دیتا تھا۔ سہرے کے ادھر ادھر کے دن تھے اور شیتل داس نے دکان کے سامنے ایک طبیلے میں بانس اور کاغذ کے ہوٹے تھے۔ میگر ناد اور بھجھیش بن چکے تھے اور اب راون بننے جا رہا۔

مجھے سامنے دیکھ کر وہ بولا... کیا چاہیئے، پھل جھڑیاں؟ میں بنے کہا۔ پھل جھڑی لینے نہیں آئی۔ دینے آئی ہوں۔

وہ کچھ نہ سمجھا۔ دکان سے ہیچے اُتر آیا۔ میراثن بدن کا پٹا تھا۔ میں پرے

مہنہ کر کے راون کے ڈھانپخے کی طرف دیکھنے لگی جس نے ٹبیلے کا تین چوتھائی گھیر رکھا تھا۔ دس سر لگنے والے تھے۔ وہ اور ادھر گئے کا سر لگنے سے پورا ٹبیلہ گھر سکتا تھا۔ میں نے جلدی جلدی شیتل داس کے سر کی طرف دیکھا۔ ہر سال سینکڑوں مشکیاں پھوڑنے سے جس پہ چھوٹے ہجھوٹے زخمیں کے نشان پڑ گئے تھے۔ بھر میں نے جو کہنا تھا چپکے سے کہہ دیا۔ شیتل داس کا چہرہ چمک اٹھا اور میں چل دی۔

شام کو بھاٹ چلے آئے جو ہر سال ہمارے گھر میں آلا اُول سنایا کرتے تھے۔ اور جسے مُن کر ہمیں بڑا جوش آتا تھا۔ ان میں سے ایک تھا جو خبری بجاتا تھا اور وہ شیتل تھا۔ چونکہ یہ سب لوگ گھر کے اندر تھے اس لیے رُپا اخفیں دیکھ سکتی تھی۔ شیتل کو دیکھتے ہی وہ کاپنے لگی۔ اس نے بیری طرف دیکھا۔ میں مُنھ بھیجنے کے ہنس دی۔

گھر بھر میں کوئی بھی شیتل کو نہ پہچان سکا۔ پڑوں میں بھی اُسے نہ جان پا یہیں۔ کجھت ایسا بہرہ پیا تھا کہ کسی کو شک بھی نہ ہوا۔ ایک پہچانا تو پہچاننے والی نے جو اس کے ایک ایک بیل سے واقف تھی۔ رُپا اندر بھاگنے لگی۔ میں نے اشارے سے منع کر دیا۔

میں کہتی ہوں بالوکی ماں۔ مجھے اس میں ذرا بھی لاج نہ لگی۔ اور نہ ایسا معلوم ہوا جیسے میں نے کوئی پاپ کیا ہے۔ آٹیاں جان پڑا جیلے کوئی بہت بڑے پیں کا کام کر رہی ہوں۔ ہمارے شاستر اس طرف تھے اور دُو، ساس، جیٹھانی، سُسر، جیٹھی، یہ وہ سب دوسری طرف... میں نے وقت کا ایسا بندوبست کیا تھا کہ ان کے آلا اُول شروع کرنے سے ختم کرنے تک رات ہو جیکی تھی۔ اس کے بعد میں نے دیکھا عورتوں میں سے رُپا غائب ہے اور مردوں سے شیتل۔ باقی کے بھاٹ تُسی جی سے کچھ پڑھتے رہے... جب بہت دیر تک نہ آئے تو میں گھبرا گئی۔ اٹھ کے کئی تو دیکھا۔ رُپا اپنے

کرے میں لیٹی ہوئی چھت کو تک رہی ہے۔ میں نے اشلوے سے پوچھا۔ دو کہاں گیا؟ روپا نے بتایا، پیچھے سڑھیوں کے راستے سے غائب ہو گیا ہے۔ میں سمجھی بس مل لیا دونوں نے، اور کوئی بات نہیں ہوتی... مگر مجھے کیا پتا۔ بات کہاں سے کہاں تک جا پہنچتی ہے۔

گھر کے مردوں پر ڈھی پر سے چلے آئے... میں سمجھ کہتی ہوں۔ اس روز مجھے روپا کے بھیا بڑے نہ لگے۔ انھیں خود بڑی حیرانی ہونی کہ یہ آج اتنا چھٹا لکھیوں رہی ہے؟ میں بڑی خوش نختی، جیسے مجھے پچھلے مل گیا ہے۔ مل بھی جاتا، بالوں کی ماں تو اپنے آدمی کے لیے بہرے دل میں پیار کم ہو جاتا؛ با مکمل نہیں۔ اُٹھا بڑھتا ہی۔ میں سوچتی۔ میں کیا کر آئی ہوں۔ ان بیچاروں کو کیا معلوم؟ جو لوگ عورت کو جنتی نہیں سمجھتے، بیویاں جائیداد کی چیز سمجھتے ہیں، جن کے دماغ میں شادی کا دہی پر انا مہتو گھسنا ہوا ہے جو آج سے ہزار دل سال پہلے تھا۔ انھیں اس بات کی کیا سمجھو؟

رات دو بجے میں ہڑبڑا کے لکھی۔ گھر تکبر میں شور چاہوا تھا... روپاشیتل کے ساتھ مڈرہی نختی کہ لکڑی گئی۔ بہرے ہاتھ پاؤں مٹھنڈے ہو گئے۔ روپا سے ہر طرح کے سوال کئے جا رہے تھے مگر اُس نے ایک ہی چُپ لگا کر کھی نختی۔ وہ ڈھیٹ بن گئی نختی اس کا انداز کچھ ایسا نہ تھا کہ کوچھ میرا کرنے ہے، میں تو دہی کروں گی جو میرے من میں ہے۔ ایک بات اچھی ہوئی جو شیتل نکل چکا تھا۔ اس کے پارے میں کسی کو پتہ نہ چلا۔ وہ ہوتا تو سب کہہ ڈالتا۔ اُسے کیا بڑی نختی؟ وہ تو سیا تھا، باتی رہی روپا کی بات روپا کو کوئی مار بھی دیتا تو میرا نام نہ لیتی۔ وہ اتنی نا شکری نہ نختی!

اب سب کو ہاتھ پیر پڑھنے۔اتفاق سے دوسرے ہی دن مگر کے نائی نے بالا گھٹ میں ایک رشتہ بنادیا۔ ایسے سیچھ کا نام لیا جس کے چھد دیوارے نکل چکے تھے اور جو بزرگوں کا بیویاں کرتا تھا... سب کچھ جلدی سے طے ہو گیا۔ روپا کو مندنے کا کام میرے پسروں کیا

گیا۔ روپا کچھ مانی کچھ نہ مانی اور دنوں ہی میں برات بھی دروازے پر آگئی۔

میں نے لڑکا دیکھا تو سیری طبیعت خوش ہو گئی۔ شیشیں تو اس کے مقابلے میں کچھ نہ تھا۔ یہ جوان، خوبصورت، لمبا جوڑا۔ میں روپا کے پاس بھلگی گئی اور اسے سب بتا دیا۔ روپا مسکرا دی۔ ایک روکھی پھیکی مسکرا ہٹ۔ میں تو ناجھ مٹھی جیسے روپا کی نہیں، میری شادی ہونے جا رہی ہے ...

تم نے تو ود شادی دیکھی ہے، بالو کی ماں؟ — وہ شادی دیول نگری میں بادگار رہے گی۔ ان کے پستانے دہی کیا جو ہماری جات برادری کے لوگ کرتے ہیں۔ ایک لاکھ روپیہ لگا دیا۔ گھر میں کس نے نہیں کھایا؟ کون لگ لے کے نہیں گیا؟ ہمیں دار کرنے، چھیرنے کو پوری برات ملی اور پھر دہ — دو لمبوں کا دو لہا۔ وہ ہنگامہ ہوا دہ شور مچا کے بس ... بینڈ باجھے، گانے، روشنیاں۔ میری جیٹھانی کے پتھے خوش تھے۔ میں نے بلام کو بلایا اور کہا — دیکھ سخھے! تیری گواکی شادی ہو رہی ہے۔ ان بخارے کی کیا پتہ، کیا ہوا اور کیا نہیں ہوا؟ اور کیا ہونے جا رہا ہے؟ وہ خوش تھا۔ با تھہ میں ایک بڑا سماہیسو نھا مے۔ اُس نے صرف آنسا سا کہا۔ میں بھی شادی کروں گا، چاچی!

میں نے کہا — کس سے؟

لو لا — بو اسے۔

ہشت! ... دواؤ بوس کھڑی تھی، بولی —

ڈولی گئی۔ وہ آتشبازی چھٹی کہ رام رام۔ پانچ ہزار کا ٹھیکہ میں نے ان کو کپہ مسن کے شیشیں کو دلواد باتھا اور وہ خود کھڑا اپنے سامنے چکر چلوار پا تھا جس میں سے سات رنگ کے پھول نکلتے تھے ... ڈولی گئی! اب گھر میں وَ دنوں، پتوں، کانڈ سکے پھولوں، بیلوں، پھٹے ہوئے غباروں، چلے ہوئے اناروں، چکر دل کے بانسوں، کانچ کے نکروں، فرنی کی پلیٹوں کے سدا کچھ نہ رہ گیا تھا۔ جتنا شور مچا تھا۔ اتنی ہی چُپ تھی ...

کہیں دو ہمینے کے بعد رُوپا آئی۔ اُس کے پھرے کارنگ ہی اور تھا۔ لیکے نہ اسے اور اُس نے لڑکے کوبے خدپسند کیا تھا۔ رُوپا کے پاؤں زمین پر نہیں ٹکھتھتھے۔ اب میں اس کے سامنے بہل کے ملکی پھوڑ کا نام لیتی تو رُوپا خود ہی مُسٹے پہ ہاتھ رکھ دیتی۔ میں نے رُوپا سے کہا —— رُوپا دیکھا... میں نہ کہتی سمجھتی؟ رُوپ بُری... اور تو کوئی بات نہیں بھائی! —— یہ مجھ سے بہت پیار کرتے ہیں۔ مگر دُبُّ بہتی ہیں مگر میں۔ ملنے والے میرے سُسرہ ہیں اور ان کے بڑے بھائی۔ اس لیے برجھچٹی بڑی بات کے لیے انھیں ان کے سامنے سر جھکانا پڑتا ہے۔ پھر مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے اُس کے گھر کے بڑے ہم سے کچھ اور چاہتے ہیں ...

اور دہ تھارا؟ —— میں نے شرارت سے پُوچھا۔

وہ تو کچھ نہیں چاہتے، بُس... رُوپا نے کہا اور میری طرف دیکھ کے نہیں دی۔ اور بولی —— بہت وہ کرو گی بھائی تو ماروں گی، ہاں!

میں مارے خوستی کے روڈی۔ لیکن مجھے کیا پتہ تھا بھیش کے لئے رُونا پڑ جائے گا۔ ہائے، یہ مرد! ... رُوپا چار ہمینے سے بہیں ہے اور کوئی لینے والا نہیں آیا۔ وہ روپیہ مانگتے ہیں اور یہ دیجئے پہ نیار ہنیں۔ رُوپا نے ٹھیک کہا تھا۔ لڑکا دبوہے۔ بات اتنی ہے کہ اچھی شکل، جوانی سے کچھ نہیں ہوتا۔ جب تک مرد کماو نہ ہو، بیکار ہے!

اہنی چند ہمیزوں میں روپ آدھی رہ گئی ہے۔ وہ سخارچے سے بھی بچے نہیں جھانکتی حالانکہ دوسرے نے قبیر سے روز دیوال نگری کا بانکا مشتیل اور شماز پیار کے گانے کا نامکمل جاتا ہے۔ کل سو دیرے میرے سُسر آئے۔ بہت خفاف معلوم ہوتے تھے۔ اُس نانی کو گالیاں دے رہے تھے جس نے یہ رشتہ کرایا۔ کہہ دے رہے تھے ہم لڑکی کو کبھی نہ بھیجیں گے۔ چاہے ساری عمر گھر بیٹھی رہے۔ ہمارے ساتھ دھوکا ہوا ہے۔ روپ کے سُسر کا تو ایک بھی دیوالہ نہیں نکلا!

---

# یو کلپس

بہت ہی مارا سادن تھا جب کہ نمبر کی دھمکی ہوئی رات پیدا ہو رہی تھی۔  
لمحے دھڑا دھڑا ایک دسرے پر ڈھیر ہو رہے تھے اور مٹی کا وہ ٹیلہ بن رہے تھے جس میں  
سے یو کلپس کا پیڑ پھوٹ کر نکلا تھا۔

کندن ایک اعصاب زدہ ٹیلیفون کے جواب میں گھروٹی تھی۔ ایک ہاتھ میں اس  
نے سائیکل کا ہینڈل تھام رکھا تھا اور دسرے سے کتابیں جو خام چڑے کے فیٹے میں  
کیرری پر ڈھیلی ہو رہی تھیں۔ یہ کتابیں کندن نے اسی شام فلور دلیم اسکول کی لا بھرپری  
سے نکلوائی تھیں جہاں وہ دائس پر پل تھی۔ قاعدے سے کندن کو گولی کی طرح سے بچکے  
میں داخل ہونا پاہے تھا مگر پھاٹک کے اندر آتے ہی دہمہشہ کی طرح سُر جو کے پاس  
ڑک گئی۔

— سُر جو یوکلپیش کے پیر کا نام تھا۔

یہ پیر کنڈن نے تین سو اتنی برس پہلے لگایا تھا جب وہ نئی نئی دلیں کو سن یو نیو رسمی سے شپنگ کا ڈپلوما کر کے آئی تھی۔ جب بہاں کی یقوناں چلپن فادر فشر رہا کرتا تھا اندھیں نے بگٹھ کا آدھا حصہ کماری کنڈن کو دے رکھا تھا۔ پھر برس ایک کے بعد دہمن کا کام پیدا کر کے امریکا چلا کیا اور کنڈن نے تہائی سے گھبرا کر اپنی بوڑھی ماں کو بُلا لیا۔ سائیکل کو جنگل کے سہارے رکھ کر کنڈن سُر جو کے پاس آ کر اور اپر کی طرف دیکھنے لگی جہاں پتے اب تک اندر ہیرت کیانگ میں ہے چکے تھے۔ البتہ نیچے کی سفید ملائم اور برجی چھال ابھی تک دکھائی دے رہی تھی۔ وہ پیار سے اس پر ہاتھ پھیرنے ہی دالی تھی کہ دوسری طرف برآمدے میں اسے اپنی جیلی فش ماں کا ہیوا سانظر آیا۔ اسی دم جھک کر کنڈن نے پیر کے نیچے سے تازہ گرے ہوئے پتے اٹھا لیے اور ہاتھ بیسیل کر انھیں سوچھنے اور لانے لانے سانس لینے لگی جیسے اُسے زکام ہوا اور یوکلپیش کی جو تنفس اندھاں کے رگوں ریشیں کو ایک طرح کا سکون دے رہی ہو۔ پھر ماں کی طرف ہمڑ کرتے ہوئے کنڈن نھوڑا کھسیائی۔ میں تو سُر جو کو بڑھتے دیکھو بھی سکتی ہوں ماں۔“ اور اس نے پیر کی طرف اشارہ کیا۔

ماں کے پھرے میں سے پیسے کے پار یک باریک فطرے رس رہے تھے جیسے کوئے گھٹے میں پانی ڈالنے سے وہ رسنے لگتا ہے۔ ڈوپٹے سے ماں اپنا چہرہ پوچھتے ہوئے بولی ”پورے دن کو نہیں رات کو بڑھتے ہیں، گندنا۔“

”کیوں۔ رات کو کیوں؟“

”اپنی کے سب کام پر ماتھا اندر ہیرے میں کرتے ہیں۔“

اور پھر ماں چپ ہو گئی۔ کنڈن کو ماں سے کسی اور بات کی توقع بھی نہ تھی۔ وہ جانتی تھی ایک پیر کے ساتھ اپنی بیٹی کی بیماری محبت کو دیکھ کر ماں اکثر پر لیشان

ہو لکھتی ہے۔ سائیل کو جنگلے پر سے اٹھا کر کندن برآمدے میں بچپن ہی تھی کہ ماں نے کہنا شروع کیا۔ ”پھر کیا نہ دہی خلنجکن لکھتی نے“

— لکھتی کندن کی کرسچین نو کرانی تھی۔ کندن نے دہیں رکھتے ہوئے کہا ”کیا مطلب؟“  
اور پھر، جیسے اپنے آپ سمجھتی۔۔۔ شروع ہو گیا؟“  
”ہاں“

”کب سے؟“

”جب سے پڑوس کے مالی سے تمہیں ٹیلی فون کرایا۔“

اور ما تھے پرہاتھہ مارتے ہوئے ماں پنجے درش ہی پرمیٹھگئی حالاں کہ پاس ہی برآمدے میں ملاقاً تیوں کے لیے رکھی ہوئی آدھے درجن بید کی کرسیاں پڑی تھیں۔ یہ حرکت عورتیں اس وقت کرتی ہیں جب کوئی مر نے والا ہو، یا مر جکا ہو۔

ادھر لکھتی اپنے کو اڑو میں کراہ رہی تھی۔ ادھر ماں گھالیاں بکے جاربی تھی۔ اس کی آخری گالی تھی۔ ”چمنار“ جبھی لکھتی کی پنج سنائی دی تو ماں اور کندن دونوں منہ اٹھا کر انہیں دیکھنے لگیں جیسے لکھتی سلمنے تڑپتی ہوئی نظر آرہی ہو۔ شاید... زہ کے دند میں مبتلا عیرت کہیں بھی ہو، دوسری سب عورتوں کو دکھائی دینے لگتی ہے۔

کندن نے ایک دم گھبرا کر ماں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”ماں“

”شُن رہی ہوں“ ماں نے اپنے بوڑھے چڑخ چوں لگھنوں پرہاتھ رکھ کر شکل سے اٹھتے ہوئے کہا اور گرتے گرتے بچی۔ ”مجھے بھی کان دیے ہیں پر ماتمانے“ وہ بولی اور سچھ بھا اپنی ہات کر سچھ ثابت کرنے کے لیے دونوں ہاتھ کھنوں کی طرف اٹھا دیے۔ کیا جذبہ تھا کہ دوسری چمنج کے ساتھ بھی مل بھی چلا اٹھی۔ ”مرتی ہے تو مر جائے...“

کیوں نہیں دن کے وقت بتائی سانڈ؟... پار سال بھی ایسے ہی کیا تھا۔

ماں بولے بغیر بھی نہ سکتی تھی۔ ”کہے خوزخون، ہو گئے تھے بیرے ہاتھ پیر،

اوہ کہ پرے جو زچندی میں بزاٹے تھے، تم نے پیسے سمجھے تھے... میں اس کے باپ کی دائی ہوں؟ ” پھر ماں کے پیر کو اڑکی طرف آئی گئے۔ پھر دوٹ بھی آئے۔

چیخ جو تھوڑے تھوڑے دتفنے کے بعد سنائی دے رہی تھی، مسلسل ہو گئی۔

کندن کے پیٹ میں جھی جھیئے کرنی آزار پیدا ہو گیا اور طباہی میں سی کمپنے لگیں۔ سامنے ہاتھ رکھتے ہوئے وہ بولی۔ ” تو سمجھتی کیوں ہنسیں ماں؟ — وہ غریب ہے پیسے داے سودا دکر سکتے ہیں۔ ”

اوہ کندن آپ ہی کو اڑکی طرف چل دی جب ماں نے لپک کر اسے بازو سے تھام لیا اور دھمکی آیز رجھے میں بولی۔ ” کندنا! ” اوہ پھر کو اڑکی طرف جاتے ہوئے کہتے لگی۔ ” یہ کام بیرے ایسی کچی کنواری کا ہے؟ ”

ماں لکھتی کے پاس جانا بھی چاہتی تھی اور اپنی اہمیت کو جانا بھی۔ جاتے ہوئے دمہ ہیں کچھ بکھے جا رسی تھی۔ صرف ایک یہ لفظ کندن کے کان میں پڑا۔ ” چھار... ”

کہیں سے کوئی چمکا دڑا اور درائیگ ردم کے اندر پیرا بولا کی شکل میں پیدا کرتا ہوا سامنے پڑیں کی ہوت کھلنے والی کھڑکی میں سے باہر اڑ گیا جس میں ایک روز پہلے کی بارش کی وجہ سے بھینٹ قطار در قطار اندر آر ہے تھے اور سواد کے بھلی کے بندے سے مٹکا کر زمین پر ڈھیر ہو رہے تھے۔ جب وہ گرتے تو پتہ بھی نہ چلتا صرف دیکھنے سے مپُل لگتا ہے زمین اور پرکی طرف اٹھ رہی ہے... درجن ۵۱ ایک شیلہ بن رہا ہے۔

کندن کھڑکی میں جا کھڑی ہوئی اور انتظار کرنے لگی۔ روشنی میں تو اونچی نیچی سب نظر آتا ہے مگر انہیں ایک عجیب قسم کی بیکسانیت پیدا کرتا ہے۔ صرف اس کے علوی ہو جانے پر صیبوں کے ٹلکے خاکے اور گہرے خاکے دکھائی دیتے ہیں جو اسی بیکسانیت میں

اور بھی تائید کا عالم پیدا کر دیتے ہیں اور آدمی گھبرا کر کھڑکی چھوڑ دیتا ہے اور ایک بے پناہ جس سے نچنے کے لیے کسی کا بھی گریبان پھاڑ دیتا ہے۔

کندن واپس آ کر صوفے میں بیٹھی تو یہ معلوم ہوا جیسے صوفے کے بازو اور پر اٹھے اور ایک حسین لڑکی کو آغوش میں لے لیا ... کندن انتظار کرنے لگی۔

پہلے تو انتظار میک ہب کرتا رہا، پھر دہاں کے کیمپوں کش کے گردھیں لگے ہوئے گھریاں کی طرح بجھنے لگا۔ چھینیں ستم چکی کھتیں۔ شاید ماں کے پہنچ جانے سے لکھتی کا حوصلہ ہو گیا تھا یا شاید بچہ پیدا ہو گیا تھا... نہیں، بچہ اس دنیا میں آتا تو ضرور روتا ...

... شکل ماں کو گرم پانی کی ضرورت پڑتے ... کندن لکھتی کی کھولی تک جا پہنچی۔ میکن سوائے ماں کے بڑھانے کے اور کوئی آواز نہ سن لئی۔ وہ ضرور گالیاں لختیں جھبوں نے اس سانحے کے پیش نظر بے شکل سماصرت اختیار کر لیا تھا یعنی میں کندن کو کھٹکھٹ کی آواز سنائی دی جیسے کوئی لکڑی کو چیرنے کے بجائے زمین پر مار کر توڑ رہا ہو پھر لکھتی کے ہونگے کی آواز، جیسے اس نے افیون کھاتی ہوا دراصل کی تائید اور نقل کی تروید کرنے کا جتن کر رہی ہو۔ کندن نے اپنے بدن میں سے کوئی بھلی جھٹکی اور بھکھے کی طرف مڑ آئی۔ راستے میں سر جو کی طرف دیکھا تو اسے ایک بچہ دکھانی دیا جس سے ڈر کر دہ بھاگتی ہوئی ڈر انگ رومن میں داخل ہو گئی۔

لکھوڑے حواس بجا ہوئے تو کندن تپائی پر پڑی ہوئی کتا میں آٹھنے پلٹئے لگی۔ ان پر کھڑکی میں سے آنے والے بے شمار بھے بھرے پڑتے تھے جن کے پر جھلکتے ہوئے تھے اور بدن مردہ۔ کندن نے اور پر کی کتاب کو صاف کیا جس کا عنوان تھا۔ "مرد" عورتوں کے بغیر۔ ... اس نے کتاب کھولی، پہلی چند سطریں پڑھیں اور پھر بند کرنے ہوئے سوچنے لگی۔ "عورتیں، مردوں کے بغیر!"

فادر دلیم اسکول کی واٹس پر سپل کماری کنڈن ایم اے نی ڈپ کے سنجھے میں تین عوامیں تھیں اور تمیوں ہی مردوں کے بغیر۔ پہلی ماں سُبھاشی، جواب چھیا سٹھ صالح کی ہو چکی تھی اور بے شمار تھے اس پر ڈھیر ہو کر تمیں جما چکے تھے۔ اس کا نام آج کل کی لڑکیوں کا ساتھا لیکن اب تک اس نام کی سب رُدکیاں بُرُھی ہو چکی تھیں۔ نئے نام پڑانے ہو چکے تھے اور نئی طرد کے وضع نہ ہوئے تھے۔ اور لوگ مجبور ہو کر پڑانے والوں پر لوث آئے تھے، جیسے۔۔۔ کنڈن۔۔۔ جو نام کبھی بوڑھا تھا مگر اب جوان ہو چکا تھا۔ پھریں چھبیس برس کا۔ اور خوبصورت اور دلکشا ہوا۔ سُبھاشی بدھوا تھی اور کنڈن میتم۔ اس نے تو پاپ کا مُنْخ بھی نہ دیکھا تھا اور زندگی بھر اس کے لیے تڑپتی رہی تھی۔ ابھی وہ پیٹ ہی میں تھی کہ ماں کے بیان کے مطابق کنڈنی، کا باپ چل بسا تھا۔ اس صدی کے شروع میں جو پلیگ پھیلی تھی اس نے موت میں سمجھ اور جھوٹ کو برابر کر دیا تھا۔ بخوب سی یکسانیت پیدا کر دی تھی۔ اس لیے جب مخفی میں فادر ماں کی آسمانی باپ کے بارے میں باتیں کرتا تو کنڈن ہمیشہ سوچنے لگتی۔ وہ تو مر چکا ہے، کسی زمینی پلیگ میں اور جب اسے کھا جاتا آسمانی باپ لافافی ہے، وہ کسی پلیگ میں نہیں مر سکتا اور وہ اسے ڈھونڈنے کے سلسلے میں قریب کے کسی بھی مرد پر عاشق ہو جاتی چاہے وہ کسی ٹھوک پیشیں ہی کیوں نہ ہو جالانکہ وہ اچھی طرح جانتی تھی کسی ٹھوک پچاری کبھی خدا دی نہیں کر سکتے۔

کئی بار کنڈن نے چھا، تاؤ اور وہ صیال، کے بارے میں پوچھا لیکن ماں نے ہمیشہ دریچے سے باہر دیکھتے ہوئے کہہ دیا۔ سب مر کھپ گئے دوسرا پلیگ میں ۔۔۔ تیسری پلیگ کب آنے والی تھی؟ وہ پھر ایکا ایکی متھس نکاہیں کنڈن پر چینکی ہوتی مال پوچھنے لگتی۔ تو کیوں پوچھتی ہے؟

”ایسے ہی“ کنڈن جواب دیتے اور پھر کہہ ڈھٹتی۔ ”تل! آج ٹھرنا نے مجھے یہ رشمی مال دیا تھا، مجھ سے بہت پیار کرتا ہے۔“

سُجھا سنی نے اپنا رندہ اپا اپنے چھیرے بھائی امولک رام کے ہاں کاٹ دیا تھا۔ جو امر تسلیم لاہول اور تبتت سے آئے ہوئے کئے کئے کا بیو پار کرتا تھا۔ — کئے جو مر تا خود رہے لیکن اس سے پہلے وصیت کر جاتا ہے۔ سُجھا سنی نے کندن کے ساتھ ساتھ اپنی بھتیجیاں اور بھتیجے کھلائے رکھنے اور اس کے عوض روکھے مگر ٹے پانے لئے رکھتے۔ اسی لیے کندن کی لوریاں اس کے لیے بھجن پوشی تھیں — روکھا سوکھا رام کا ہمکڑا، سیٹھا کیا اور سلو نما کیا... وہ بھائی کے پہنچے پڑا نے پہنچتی تھی تو اکثر باہر نکل سکتی تھی۔ کیوں کہ اس کا جسم جوں کا توں بھرا ہوا تھا حالاں کہ بھائی کا خروج کی وجہ سے چاند کی طرح سے گھلتا بڑھتا رہتا تھا۔ بھائی کے کپڑوں میں کچانس کھپنسا کر سُجھا سنی برہنہ معلوم ہوتی تھی۔ وہ ہمیشہ ایک جرم کے احساس اور اذیت پسندی کے جذبے میں نیچے ٹھنڈے فرش پر سوتی تھی اور ایکسا اپسانیت سی اس کے جذبات پر چھائی رہتی۔ جس میں اُداسی بھری ایک تسلی تھی۔ اسے اس حدت کا احساس ہی نہ تھا جو مر کے ساتھ والی چارپائی پر سو لبے سے عورت کے بدن میں اپنے آپ پیدا ہوتی رہتی ہے۔ پھر سوتے میں کبھی تکیہ اور لمحات وغیرہ ہوتے رکھتے اور کبھی نہ ہوتے رکھتے۔ سوائے سردی کے موسم میں ان کی ضرورت ہی کیا تھی؟ پھر سُجھا سنی سوتی ہی کہاں تھی؟ جاگتی بھی کہاں تھی؟ دہ تو خواب اور بیداری کے اعراط میں روتنی سوتی رہتی اور بھجن اس کا سہارا ہوتے۔

جب نین میں سے شیخ زاد گزوائی، تکیہ لمبی بچپونا کیا

آخر — سمجھو وجہ کچھ سوچ پیارے پیار کیا تو ردنا کیا؟

بھائی کی گالیوں کو سُجھا سنی نے 'گھی کی نالیں'، سمجھا اور مار پیٹ، دھکوں کو کھپولوں کی چھڑیاں، اور یوں کندن کو پڑھایا باقی وہ دلخیقوں اور سرکاری گرانٹوں سے آگے بڑھتی بڑھتی امریکا تک جا پہنچی۔ وہ خوب صورت تو تھی ہی، اس پر تعلیم نے اس کے

خُن کو اور بھی صیقل کر دیا تھا۔ آنکھیں بڑی تھیں جن میں میوں شک تھے اور دسوے۔ ایک عجیب سے ارتقا میں اس کی آنکھیں کافون تک کم ج آئی تھیں معلوم ہوتا تھا سامنے جاتی ہے تو پچھے بھی دکھائی دیتا ہو گا۔ یادہ ایسے ہی دمکھتی رہتی تھی جیسے کوئی اس کا بھیجا کر رہا ہے۔ باپ نہ ہونے سے لڑاکہوں کو کیسی کیسی باتوں کا خیال رکھنا پڑتا ہے... اس کے باوجود بارہ بیڑہ، اس بھی کی عمر میں کندن کو ایک ایسے مرد کے سلسلے میں تجربہ ہوا تھا جس کے بارے میں وہ کبھی سوچ بھی نہ سکتی تھی۔ شاید وہ مرجانی مگر کٹھے نے اس کی زمگی بچالی تاکہ وہ بڑی ہو کر یوکلپیس کا پیڑ بو سکے۔ یہ سب ایک طرح سے اچھا ہی جو اورنہ کندن پڑھائی ہی تو شادی نہ سمجھتی۔

تیسرا عورت لکھتی تھی۔ کر سچین۔ وہ تیس ایک برس کی تھی اور محنتی ہونے کی وجہ سے تندرست۔ اس کا اصل نام لکھتھی رام رام دا اس تھا اور اس کے شوہر کا نام سیدھو۔ مگر کمیشی اور مگر جسے کے رجسٹروں میں رام دا اس کچھ یوں چڑھا کہ پھر نہ مٹا اور لکھتی آج نک نہ بتا سکتی تھی کہ رام دا اس اس کے باپ کا نام تھا۔ یا کسی پہلے شوہر کا۔ کبھی وہ اسے شوہر کا نام بتاتی اور کبھی باپ کا۔ اور پھر ایک ابڑی کے عالم میں۔ — ”میرے باپ کا بھی وہی نام تھا جو میرے مرد کا۔“

لکھتھی کا یہ تیسرا مرد۔ سیدھو ادھاں سے اکاون باون میل ڈور کسی کو لئری میں کام کرتا تھا۔ دو سال میں صرف ایک دو بار آتا۔ جب اس کے کپڑے کریے اور اس کی دھول سے اٹے ہوتے اور چہرے پر سیاہیاں کھنڈی ہوتیں۔ کچھ نہ کوئی یہے کی اور کچھ ایسے جرائم کی جن کا وہ بے اختیار مرکب ہوتا۔ ان باتوں کے کارن وہ آپ، ہی اپنا ہمزاد معلوم ہوتا تھا۔ وہ آتا تو نہایت ہی بد صورت دکھائی دیتا اور جب نہ آتا تو اس سے بھی زیادہ پڑھتے ہی ماں سماشنا اور کندن پنجے جھاڑ

سیدھو کا بھرٹ بھلے میں دکھائی پڑتے ہی ماں سماشنا اور کندن پنجے جھاڑ

کر لکھتی کے تیجھے پڑ جاتیں۔

”کیوں تو ہر بار اس کے ساتھ راس رچا ہٹھتی ہے؟“

”جب وہ تیری ذمہ داری لیتا ہے، نہ تیرے پتوں کی، اپنے...“

”سب مرد ایک ہی رستی سے پھانسی دیتے جانے کے قابل ہیں۔“

مرد!... لکھتی پھٹی پھٹی نگاہوں سے دیکھنے لگتی۔ کبھی سب غلط اور کبھی سب ٹھیک معلوم ہرنے لگتا۔... ہاں، ہاں، ٹھیک، ہی تو کہہ دیں یہیں۔ سب مرد اس فابل ہیں کہ... میں ایک اور کروں گی، مگر نہیں... وہ بھی تو۔۔۔ پھر وہ ایکا ایکی خغاہ پر آٹھتی اور اپنا ہاتھ جوڑی کی طرف لے جاتی۔ اس کے بعد سندھو کا ہمزاد اس کی طرف آتا۔ نہ ہنکھیں لیے، ہاتھ بوڑے اور لکھتی کا ہاتھ جوڑی کی طرف جانے لگتا۔ پھر وہ دیکھتی۔ جب تک سندھو کا ہاتھ لکھتی کے بدن پر پڑتا اور لکھتی کی گرنٹ، دھیل ہو جاتی۔ ہنکھیں چڑھنے، بند ہونے لگتیں اور وہ بے دم سی ہو کر گر جاتی۔ اسے جب ہی پہنچتا جب اس کے پیٹ میں کیدار سینگنے لگتا۔۔۔

کر سچیں ہونے کے ناطے لکھتی میں صبر تھا اور سکر بھی۔ نیمن گنڈان نہ کر سچیں لکھتی نہ سلماں اور نہ ہندو۔ وہ ایک تعلیم یافتہ لڑاکی تھی، وہ سوتھی۔۔۔ کیا بکواس ہنے، بچھہ سہیشہ عورت کو اٹھانا پڑتا ہے۔ ایک دن تو آئے گا جب چاند، زحل اور مشتری تک پہنچنے والے عورت کی سوچ، بچار کے افلک پر پہنچیں گے اور مرد کے ہاں بھی بچھہ ہونے کا سامان کریں گے۔ آخر سار اسلام تغلب ہی کا ہے نا... مگر ایسے میں تو دار حی مگر آئے گی...!

مال گرتے پڑتے علی آفی۔ اس کے کالے بخوردے ہاں بھیگنے ہونے پر بھی بکھرے ہوئے تھے۔ پچھے منہ پر، پچھے جسکے جھکے شانوں پر۔ اس نے کس قدر جلدی میں اپنے ہاتھ پر ٹھوکن سے عصاف کیے تھے، اس پر بھی بانات کی قیض پر ایک چھپڑا نگاہ پہاڑھا اس کے

باد سے یہ دہنہ جانتی تھی۔ وہ گالیاں دے رہی تھی ٹیز ٹیز اور بے ربط اُس کی آخری  
گالی تھی — ”ایک اور لڑکی چلی آئی ...“

کنڈن چونکہ کراہی۔ بچہ پیدا کر دیتے ہے کے بعد سنبھالنے کا کام کنڈن کا تھا۔  
جب دہنکتھی کے کوارٹ کی طرف پکی تو ماں کہہ۔ بی تھی۔ ”ایک لائسن (لائنس) لے لو  
لندنا ... اب کے وہ حرامی آیا تو میں اُسے گولی مار دوں گی：“  
ادر ماں سُجاشنی اپنے تخیل میں لاش دیکھ رہی تھی اور وہ بھی ربی تھی جیسے ہر  
غورت اپنے بیٹے کی سرزنش کے بعد خود رونے بیٹھ جاتی ہے ...

مُرخُوجہ راتا رہا۔ پر صبح دشام اسکوں جانے سے پہلے اور دُٹنے کے بعد کنڈن اُس  
کے پاس رکتی اور س کی نرم سی چھال پر ہاتھ پھیرتی پیار کرتی ... اور ماں سُجاشنی دھمکتی  
ٹککارتی۔ ”لندنا! اب آبھی جا۔“

مُرخُوب بیس پچیس نٹ لمبا ہو گیا تھا۔ کہیں سو لستہ نٹ اُد پخا جا کر تو اس کے  
تھنے پھوٹتے تھتے اور پھیلوں اور نتوں کی طرح عموداً لٹکھے رہتے، جس کے کارن  
دو پہر کے سے جب سائے کی ضرورت ہوتی تو مُرخُوجہ بیکار ثابت ہوتا۔ البتہ پہلے اور پچھلے  
پہر جب چھاؤں یوں ہی بدن میں کچکی پیدا کرتی تب یہ بھی لانبے اور کھینزیرے سائے پیدا  
کر لئتا اور لکھتھی کی تینوں چاروں بیٹیاں ریل ریل کھیلتی ہوئی ایک دوسرے کا فرماں  
نکھامے نیچے سے نگی پیڑ کے نیچے چلی آتیں۔ اس کی آخری بیٹی ریوڑی بھی —  
اپنا گول مٹوال اور حستی دار چہرہ لیئے جو پیڑ کے نیچے سے ریت کے لمبے اکٹھے کرنے  
لگتی۔

کنڈن نے ماں کے کہنے پر بن دوق کا لائسن تو نہ لیا تھا البتہ ایک اور بند دلست

کیا تھا جو بندوق سے بھی مٹوڑہ ثابت ہوتا ہے۔ بندوق تورات کے وقت بے فار بھی ثابت ہو سکتی ہے۔ لیکن وہ سہیار کبھی خالی نہیں جاتا۔ اس نے چاکلیٹ کے رنگ کا ایک کتا رکھ لیا تھا جس کا منہ خوفناک تھا اور جبڑے کا لے، جن میں سے ایک فٹ کی زبان ہمیشہ باہر لٹکی رہتی تھی۔ جیگو اور بہت مُودی کتا تھا۔ بندھو کو بیگلے میں آنے دینا تو کچھ، کندن کو بھی اندر آنے کے لیے اس سے اجازت لینا پڑتی تھی۔

بچیوں سے جیگو اور البتہ ماوس ہو چکا تھا کیوں کہ وہ چو میں گھنٹے بیگلے میں رہتی

تھیں۔

ایک دن لکھتی کو ابکائیاں آنے لگیں اور بہت ادھر ادھر کی کرنے کے باوجود ماں کو پتہ چل گیا اس کے پیٹ میں بچہ ہے۔ وہ کیسے ہوا؟ لکھتی اس کا تسلی بخش جواب نہ دے سکتی تھی۔ اس نے بڑی سے بڑی قسمیں کھائیں کہ وہ اپنے مرد کے پاس نہیں گئی مان سمجھا شتی اور کندن جانتی تھیں کہ ریوڑی کے بعد سیدھو بیگلے میں نہیں آیا۔ زیادہ سے زیادہ یہی ہو سکنا تھا کہ لکھتی نے جوری چھپے کوئی اور مرد کر لیا مگر لکھتی انکار کرتی تھی۔ وہ یہ بات بھی "سچ" کہتی تھی کہ اس نے کسی مرد کا منہ بھی نہیں دیکھا نہیں دیکھا تو پھر یہ سب کیسے ہوا؟

بیگلے میں کھرام مجھ گیا۔ لکھتی ایک طرف بیٹھی ہوئی تھی اور ماں یہی آپس میں رُنے لگیں۔ ماں اس کتیا کو باہر پھینکوادینا چاہتی تھی مگر کندن اس بات کی اجازت نہ دیتی تھی۔ اتنے ڈھیر سارے بچے لے کر وہ کہاں جائے؟ ماں نے اپنے بھائی اموکرام کے پاں چلے جانے کی دھمکی دی۔ کندن نے بہت سمجھایا، پیر دل پڑی۔ لیکن جب ماں باپ کی بھائی ہونے کو تیار نہ ہوئی تو کندن نے صاف کہہ دیا — اچھا ماں تم جاؤ تو جاؤ، میں لکھتی کو نہ نکالوں گی۔

اس پر ماں خوب دھاڑیں مار کر ردی۔ یہ بیٹی بیری... ماں کا جانا سکتی ہے۔

لیکن بھتی کا نہیں۔ لیکن اس کی کیا ہوتی ہے؟ جبھی ماں کو بھالی کے ٹالم یاد آئے اور اس نے بیٹی کے پیر دل پر سر رکھ دیا اور سفید بالوں کا واسطہ دے کر معافی مانگ لی۔

لیکن بھر بھتی سے ذہنی پوچھ پوچھ شروع ۔۔۔ ”سچ بتا، کہاں سے لائی ہے؟“  
”کہیں سے نہیں،“ بھتی کہتی۔ ”اگر میں نے پاپ کیا ہو تو خداوند یوسع میری چاروں بیٹیوں کو لے جائیں۔“

”بیٹیوں کا کیا ہے؟“ ماں کہتی۔ ”وہ تو ہر عورت چاہتی ہے：“

کندن ایک جھٹکے کے ساتھ بات کاٹ دیتی۔ ”ماں ۔۔۔“

ماں کندن کی طرف دیکھتی ۔۔۔

”میں بھی تیری بیٹی ہوں ۔۔۔“ کندن آنکھوں میں شکایتیں، حکایتیں لیے ہوئے ماں سے کہتی۔ ”تو چاہتی ہے، پرماتما مجھے لے جائیں؟“

ماں سُبھاشنی کندن کے منہ پر ہاتھ رکھ دیتی تاکہ وہ اس سے زیادہ اُبھرنا اور اوگتے دائی بات نہ کہہ سکے اور پھر اپنی بیٹی سے لپٹ جاتی، کہتی ہوئی ”کندنی“ لند پھر۔ تو میری بات نہیں سمجھتی، میں بھی تو کسی کی بیٹی ہوں میں بھی سوچتی ہوں میں کیوں اس سُنوار میں چلی آئی؟ کیوں نہ پیدا ہوتے ہی مر گئی؟“

اس بات کے ہمینے ڈیڑھ کے بعد صبح کاذب کے قریب جیگوار بہت غرما، بہت بھونکا لیکن وہ لوہے کی ایک موٹی سی زنجیر سے بندھا ہوا تھا۔ برآمد سے کے جس ستون کے ساتھ سے باندھا گیا تھا اپنی چلکے سے ہل گیا مگر زنجیر نہ ٹوٹی۔ اس نے یوں بے تحاشتا بھونکنے سے ماں اور کندن نے یہ پہنچا میں لے کر ایک دوبار باہر جھانکا بھی، مگر کچھ نہ دکھائی دیئے پر خاموش ہو گئیں۔ صرف ماں نے اتنا کہا۔

”یہ جیگوار کو آج ۔۔۔ ہوا کیا ہے؟“

”جانے ۔۔۔ بہت ہی بھونکا ہے：“

”اُدھر ہی بھونکتا ہے، جس طرف تُر جو ہے۔“

گندن نے بھی ایک بار اُدھر بیکھے لیا۔ حالال کہ اندر سی روشنی میں تُر جو کی سفید چھال بھی سیاہ دکھائی دے رہی تھی۔ گندن بولی ۔۔۔ ”ہاں، ماں! جانوروں کو دو سب کھائی دیتا ہے جو ہم انسان نہیں دیکھ سکتے۔“

اور گندن نے پٹے سے گئیستہ ہوئے جیگوار کو اندر ڈر انگ رومن میں باندھ کر دروازہ بند کر دیا۔ ہاں، اب سہ صوٹ آ بھی جاتا تو کیا بگرتا؟

لیکن پوچھئے جب تُنھی میں برش لیے، کانڈھے پر تو لیہ رکھے، نائٹ گون میں بلوس گندن باٹھ رومن سے بغلی کمرے میں داخل ہونے لگی تو اسے اپنی نگاہوں کے سامنے یو کلپٹ کے نیچے کوئی سفیدی چیز دکھائی دی۔ وہ پہلے کٹھکی اور پھر سنہجلتی ہوئی اس کی طرف بڑھی۔ معلوم ہوتا تھا کوئی بیٹھا ہوا ہے اور دعا پڑھ رہا ہے۔ جبھی ایک سفید فرغل پورے قد میں سامنے کھڑا ہو گیا۔ کسی آدمی کا چہرہ دھنڈنا ساد کھائی دے رہا تھا...۔

”کون ہے؟“ گندن نے فرغل سے چند ہاتھ پر رکھتے ہوئے پوچھا۔

فرغل نے کوئی جواب نہ دیا۔ صرف پچھپی سے آنے والی ہوا سے وہ سکھوڑا سا ہلا۔ گندن ایک قدم اور آگے بڑھی اور اپنی نظروں کے کیمرے کا پورا ڈیا فراہم کھولتے ہوئے ایک دم چلائی۔۔۔ ”بابا!“

پھر دو برش، تو لیہ دغیرہ پھیکتے ہوئے دونوں بار دپورے پھیلا کر باب کی طرف پلکی۔

باب جامد و ساکست کھڑا تھا۔ گندن اس سے پیٹ گئی۔۔۔ ”باب... باب... باب...“

باب کے ہاتھ فرغل میں تھے۔ وہ ساکت تھا۔ اس نے کہا بھی لو آتا ”KEEP AWAY“ گندن بھوپلی رہ کر سکھوڑا چھپے سہٹ گئی اور نگاہوں میں سعیے لیے بابی فرش کے چہرے کی طرف دیکھنے لگی۔ دن صاف ہرنے لگا تھا اور سبع مشرق کے پرتو میں اس کی آنکھوں کے

مناک کرنے والی دے رہے تھے اور چہرے پر گناہوں کے احساس جو سب سی غیر فانی چیزوں کی طرح سے کبھی نہیں مرتے۔

کندن نے پوچھا ہی لیا۔ "امریکا سے کب آئے؟"

"رات" بابی فشن نے دمیں سے جواب دیا۔ "پہن ایم سے... پھر میں کی کار میں۔"

کندن ایکا ایکی بھڑک اٹھی۔ غصتے اور رقت میں ڈبلی آداز سے بولی "کیوں؟ کیوں آئے نم؟ کیا صرورت تھی؟... چلے جاؤ یہاں سے؟" بابی فشن جوں کا توں کھڑا رہا۔

کندن نے ہانپتے ہوئے پیچھے کی طرف آداز دی۔ "جیگوار..." جیگوار کندن کے پکارنے سے پہلے ہی بھونک رہا تھا۔ اسے کوئی بوآ گئی تھی۔ اور وہ زنجیر تڑا کر باہر آئے، اس اجنبی کو کچا چبا جانے کے لیے تڑپ رہا تھا۔ کندن سے کھوں کر فادر فشن پر چھوڑ دینے کے لیے پیٹ لیکن پھر توٹ آئی اور سامنے دکھائی دینے والی برف کی بل پر یورش شروع کر دی۔ وہ سلیں توڑ رہی تھی اور چپلارہی تھی "باب، باب، بولو، پچھہ تو بولو..."

کندن کا جسم ساتھ لگتے ہی فادر فشن کی پاکیزگی کے ہمایے اور اس کے دھن کے اینڈیز مگھلنے پہنچنے لگے۔ چند لمحے پہلے سردی میں بھٹھرنے والے دھبھوں پر کوئی لحاف سے چلے آئے، تھیس آتا، ایک طرف پھینک کر باب بولا "پرسے ہٹ جاؤ... تم عورتیں سمجھتی ہو، مردیں کے عصر تھیں نہیں ہوتی؟"

کندن نے تھوڑا پیچھے ہٹ کر بابی کی روح میں جھانکا اور کاپتی ہوئی منت اور آہ دزاری پڑا تھا آئی۔

"میں نے عورت ہو کر تھیں معاف کر دیا، باب... اور تم..."

”میرے اور تھارے درمیان — میں عورت ہوں۔“  
 مبی اپنا آپ چھڑا کر، سینے پر کر اس پیدا کرتا ہوا چل دیا اور کندن بھائیک میگ  
 اس کے پیچے بھاگتی، پکارتی گئی۔ ”باب... باب...“  
 اور جب باب نہ پڑا تو کندن وہیں کھڑی ہو گئی اور اسے جاتے دیکھتی رہی پھر  
 اُسے خیال آیا۔ شاید...“

اور اس نے ایک بار پھر بلند آواز میں پکارا۔ ”فاؤ... واؤ... راؤ...“ اور  
 اس کی آواز بے شمار گھاٹیوں اور ان کی سیاہ تہوں میں گرفت، جذب ہوتی ہوئی رکھائی دی  
 مار، نے باب فشر کونہ دیکھا تھا۔ ”بیٹا! تم کس سے باتیں کر رہی تھیں؟“  
 اس نے پوچھا۔

کنڈن نے اپنی آنکھوں سے مایوسیاں پوچھ دالنے کی بیکار کوشش کی اور نیچے دیکھتی  
 ہر لُبی۔ ”اپنے آپ سے“

مکتھی پر اپ تک سوالوں کی بوچھاڑ ہو رہی تھی۔ ”بچ بتا، کون تھا؟“... یہ  
 اچھیں کی گانٹھ کھائی سے لائی؟“

”تم تو یہ مت پوچھو، ماں۔“

ماں انکا ایکی ڈرگئی۔ اس نے بیٹی کے چہرے پر دیکھا اور کچھ مطلب ڈھونڈنے کی  
 کوشش کی۔

کنڈن نے بالغ صدی چہرے پر ایک معصومیت لاتے ہوئے کہا۔ ”ہم عورتیں ہیں  
 ... ہمیں ایسی باتیں بہنیں کرنی چاہئیں ہاں۔ کیا یہ کافی نہیں کہ وہ بچہ ہے...“

”اگر پھر راڑکی ہو گئی تو؟“

”لڑکی کیا انسان نہیں ہوتی؟“  
”ہوتی ہے، مگر...“

اور پھر سب باتیں ان چند سوالوں میں گم ہو گئیں جو عورت سے ازل سے پوچھے جا رہے ہیں اور ابد تک پوچھے جائیں گے۔ جن کا دہ کبھی جواب دے میں اور کبھی نہ فسے سکے گی اور دے میں گی بھی تو اس پر ہزاروں دباؤ ہوں گے... سماجی، اخلاقی... اور پچھے کو کچھ پتہ نہ ہو گا اور ماں ڈری، سہی رہے گی۔

گرجے میں نکتی نے ”کنفیش“ کیا تو ایک اور ہی صورت پیدا ہو گئی جس نے فادر ماٹیکل، فادر روبلو، سرٹر پیر شیرا ایجاد کو بجلد ڈیں ڈھل دیا۔ باپی فشرابھی میک یہیں تھا اور دم ساد ہے ہوئے ہاتھیں شن رہا تھا۔ نکتی نے کہا —— ”وہ خواب میں آیا تھا“  
اس پر معاملہ اور ابتر ہو گیا۔ ”کون؟“ سرٹر ایجاد نے پوچھا۔

کُندن بھی وجہ نکتی۔ اس نے نکتی کی مدد کرنے کے لئے کوکوشش کی ”سیدھو؟“ اس نے کہا گر نکتی نے نفی میں سر ہلا دیا۔ سب اندھی حیران ہو کر جواب کے منتظر ہو گئے۔ نکتی نے اچھی ہوئی نظر سے سب کی طرف دیکھا اور پھر آنکھیں جھکلتی ہوئی بولی —— ”رام داس“  
کہنی اور گرجے کے رجھڑوں میں رام داس ہی کا نام تھا...  
نکتی قسمیں لے رہی تھی جن پر کوئی یقین کرے تو مرے، نہ کرے تو بھی مرے۔

عشا نے دبائی کی ہاشٹر کت ختم ہوئی۔ حیران دپریشان کُندن نے سرٹر ایجاد کی ایک طرف لے جاتے ہوئے کہا۔ ”خواب میں آیا تھا... کیا یہ ہو سکتا ہے سرٹر؟“ سرٹر ایجاد نے خود بوكھلاہٹ کے عالم میں ایک مٹھل سا جواب دیا۔ ”کیوں نہیں؟“  
اگرچہ کہتی ہے، نکتی رام داس!

فرد افراد، فادر روبلو اور فادر ماٹیکل نے بھی کچھ ایسے ہی جواب دیے۔ گرجے سے باہر سلیٹ سے بنے ہوئے راست پر کُندن نے فادر فشر کو پکڑ لیا اور پوچھا۔ ”کیا یہ ہو سکتا

ہے؟"

فادر فشر نے ادھر اُصرد بھیجا اور پھر کندن سے کہا۔ "نہیں" کندن چونک مگئی اور بولی۔ "فادر... تم ایک کیمتوں کے پادری ہو کر اس بات کو نہیں مانتے؟"

"نہیں"

"کیوں نہیں"

"اس لیے کہ خدا کے بیٹے اور انسان کے بیٹے میں فرق ہے... میرا خیال ہے، کبیس رات کے وقت سید صحو پھپٹے سے چلا آیا ہو گا"

کندن کو ماں کا فقرہ یاد آیا۔ اُپتی کے سب کام پر ماتھا اندھیرے میں کرتے ہیں۔" مگر فادر فشر کو آخر مرد تک پہنچانے کے لیے کندن بولی۔ "سید صحو یار ام داس؟"

"سید صحو"

"رام داس کیوں نہیں؟"

"رام داس کوئی حقیقت نہیں رکھتا... اس کا کوئی وجود نہیں۔ وہ تو صرف نام ہے و جہڑیں"

"ہاں مگر" کندن نے ضریب کی۔ "آیا بھی تو نکھلی کوپتہ نہ چلا ہو گا؟"

"تم تو جانتی ہو" فادر فشر نے کندن کی نگاہوں کو ٹالتے ہوئے کہا۔ "... پھر خواب کتنا گھر اہو جاتا ہے..."

کندن چند بات سے محمود ہرگئی۔ "ہاب" اس نے کہا۔ "تم ایسا سمجھتے ہو تو کیوں نہیں یہ شہزادیتے؟ کیوں نہیں شادی۔"

باب فشر نے کندن کو دھیں روک دیا۔ صرف اتنا کہہ کر۔ "نہیں"

"تم کیوں نہیں سمجھنے کی کوشش کرتے، باب؟ اس ٹہنیا کے سب دھنڈے کرتے ہوئے

آدمی پادری سے بھی بڑا ہو سکتا ہے یہو ع —

باب نے پھر ٹوک دیا۔ ”تم نہیں سمجھ سکتیں...“

ہور فادر فشر ایک ایک قدم سے ددد سلسلیں پھانڈتا ہوا واپس گر جئے میں چلا گیا۔ پھر میری کے حضور میں دعائیں کرنے کی رات کو اپنے مجرد بستر پر سونے اور رو رہومی رات کے وقت اٹھ کر شیو بنانے اور پھر سو جانے۔ اس کے پچھے دن بعد فادر فشر، ہمیشہ کے لیے میدیں دس کو سن چلا گیا۔

اب کے زچلی کے سلسلے میں سختی کو بہت کڑی ہدایات لکھیں بلکہ کندن نے ایک سستی مگر خپٹت چالاک سی دایا طے کر رکھی تھی۔ شہر پانچ میل دور تھا اور وہاں کے اسپیال کی بیڈز بعض وقت ارجمند کیس کے لیے بھی خالی نہ ہوتی تھیں۔ میری ڈنٹ کا خرچ برداشت کرنے کی سختی میں ہر تر نہ تھی۔ کندنی مدد کر سکتی تھی مگر ایک حد تک۔

مگر سختی زچلی کے سلسلے میں کوئی بھی مصارف برداشت کرنے کو تیار نہ تھی۔ میں سُبھاشنی نے سخن پا ہو کر کہا — مر جائے گی، کیسی؟

”ٹھیک ہے“ سختی نے گھر اس سر ملا دیا۔ ”چھپٹی ہو جائے گی؟“

”یہ چھو کر لوں کی لام کون سنبھالے گا؟“

”خدا، جس نے پیدا کیا؟“

”انھیں پیدا کرنے میں تیرا کوئی مانہ نہیں؟“

”نہیں“

اور ناک تک برسے ہے کے کے باوجود اشراحت سے ماں کی طرف دیکھتے ہوئے سختی مسکرا دی۔ اس کا مطلب تھا یہ خدا ہی ہے جو عین دلت بر عقل پھر ادیتا ہے، کسی اپنے

ہی کمیل کے لائچ میں۔

اور تو سب ٹھیک نہ تھا لیکن چتی دار چہرے والی ریوڑی ابھی بہت چھوٹی تھی اور کندن کو اس کی طرف دیکھ دیکھ کر رحم آتا تھا۔ وہ اب تک مکمل طور پر ماں کو اپنا سمجھے ہوئے تھے۔ ماں ہی اس کا اڈ رہنا بچھونا تھی اور ماں ہی اس کی روٹی۔ اسے کیا معلوم چنہمی دن کے بعد تکھی اسے نہ پُرچھے گی۔ اس لیے نہیں کہ وہ پوچھنا نہ چاہے گی بلکہ دوسرے پنجے کے سلسلے میں اجھی ہونے کے کارن اسے وقت ہی نہ ہوگا اور اگر کہیں رہا کا پیدا ہوگیا، تو... نہیں، اس بیٹگلے کا قانون ٹوٹ جائے گا، یہ تکھی جانتی تھی اور سُجھاشنی اور کندن بھی۔

دایا دن میں دو ایک چکر کاٹ جاتی تھی تاکہ تکھی کے چہرے پر شکن بھی دکھائی دے تو ماں کو خبر کر دے۔ اس کے ساتھ اٹے ہی یہ تھا کہ وقت بجا گئی تو تکھی کی تنخواہ سے درود پر کاٹ کر اسے دیے جائیں گے اور یہ صاحب، کندن میں روپے اپنی حبیب سے دے گی۔ اور ساتھ دھوئی بلاڈز یا فراک کا پکڑا گیدرڈ اسکرٹ ...

ایک دن دوپہر کے قریب دایا آئی تو تکھی ہنس ہنس کر اس کے ساتھ باتیں کرنے لگی دایا کو خود بہت اچنپھا ہوا۔ اس نے تو کوئی ایسی بات نہ کی تھی جس پر کوئی ہنس سکے۔ اس کے تھوڑی دیر بعد تکھی پھر کھلا کھلا کر ہنس دی۔ دایا اس کا مسند دیکھنے لگی اور درگھنی۔ اس کے پڑوس میں ایسے ہی ایک کنڑی عورت بیٹھے بیٹھے پا گل ہو گئی تھی مردہ ہنئے کے سوا اور کوئی بات ہی نہ کر سکتی تھی لیکن تکھی — بات بھی کرتی تھی اور ہنستی بھی تھی۔ دایا تکھی کی ہنسی سے ماں ہو گئی اور سوچتی ہوئی چلی گئی۔ ابھی ہنہتہ بھر کوئی خطرہ ہی نہیں۔

دایا کے جاتے ہی تکھی روئے لگی۔ وہ اتنا ہی روئی تڑپی، جتنا وہ ہنسی تھی۔ وہ ایک ایسے جری پین سے جو عورت ہی کا حصہ ہے، اپنے درد کو دباتی رہی تھی اک شام کے سات بجے۔

کندن اسکول سے رٹ کر ایک کتاب پڑھ رہی تھی اور کھانے کے انتظار میں بیٹھی

تھی۔ مال دال سبیتی ہوئی رسول کی طرف سے کوئی ضروری بات کہنے کے لیے آئی کہ ایک دلدوڑ  
چخ سنائی دی۔

”بیہ——؟“ مال نے کہا۔

”لکھتی کی آواز...“ کندن بولی۔ اور پھر یہ دلوں انہیں میں لکھتی کے گھر کی طرف  
دیکھنے لگیں۔

”ہائے سرب ناش“ مال نے ماتھا اور چھاتی پیٹتے ہوئے کہا۔ ”دایہ تو کہہ گئی ہے  
سہنے بھر کوئی خطرہ نہیں...“ اس کے بعد اور ہو ہائے سنائی دیے گئیں۔ مال سُجھا شنی کی  
بے نقط گالیوں کا تانتا بندھنے لگا۔ زیج میں جیگوار کے بے تحاشا بھونکنے کی آواز شامل ہو گئی۔  
لیکن مال سُجھا شنی ہپسکڑا مارے بیٹھی تھی اور اس بات کے استھار میں بھی کب یہ  
آواز ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائے۔ کندنا زندہ تو اس کُتیا کو گھر سے جانے نہ دے گی۔ البتہ  
مردہ نہ رکھ سکے گی۔ اس نے کندن کو بھی روک لیا۔ ”اگر تو جائے تو میرا مرماں دیکھے“  
کندن روک گئی لیکن اس کا اگل اگل پیڑک رہا تھا اور چھینیں مُن کر اس کے قدم  
دد دازے کی طرف اٹھے اور پھر مال کے ڈر سے روک گئے۔ اس نے ملبوچیاں نظر وہ سے  
مال کی طرف دیکھا جو پھر بنی بیٹھی تھی۔ اندر سے وہ کیوں اور کس بات کے خوف سے کاپ  
رہی تھی؟ اس کا کندن کو بھی اندازہ نہ تھا۔ شاید وہ بھی سل بنی بیٹھی رہتی لیکن ایکا بیکی  
کھلے در دازے میں سے ریڑی چلی آئی۔ — روٹی ہوئی، متوجہ اور مادرزاد نگی...  
کندن سے نہ رہا گیا۔ وہ بولی： ”میں جاؤں گی...“

”کندنا“ مال نے آواز دی： ”میں کچھ کھا لوں گی؟“

اس پر بھی کندن نہ رکی اور کوارٹر وہ کی طرف لپک گئی۔ مال کو دہ دن پاد آیا،  
جب اس نے اپنے بھائی امولک رام کے ہاں چلنے کی دھمکی دی تھی اور کندن اسے  
ہمیشہ بکے لیے بھج دینے کے لیے تیار ہو گئی تھی۔ آج اسے مال کے مر جانے کی بھی پروانہ

تھی۔ یہ کیا رشتہ تھا کندن کا ادراکتی کا؟ سُبھاشنی مُٹھی اور اپنی پُچھی کھواری ”بیٹی کو اس کریہ نظر سے بچانے کے لیے روڑی کو دھکا دے کر باہر نکل گئی۔

دو گھنٹے ماں بیٹی کشٹی کرتی رہیں تب کہیں نوساڑ سے نوجھے دلا دت ہوئی ”حرامی،  
بچہ پیدا ہو گیا، لیکن مرا ہوا۔ وہ لڑا کا تھا۔

پیدائش کے فوراً بعد لڑا کے اور لڑا کی توکیا، زندگی اور روت سے بھی بے خبر نکتی ایک  
میٹھی غنیدہ سو گئی ایسی نیند جو اس جانکا ہی کے بعد ہی آتی ہے اور جس کا احساس مرد کو کبھی  
نہیں ہوتا۔ کندن کو یاد آیا۔ نکتی نے ایک بار دعا مانگی تھی... ”خدا یا! ایک بار،

صرف ایک بار میں لڑا کا پیدا کر کے دیکھ لول، چاہے وہ مرا ہوا ہو۔“

رات کے اندر ہیرے میں حقیقت کی راہیں ڈالتی، گرتی پڑتی ہوئی کندن مشن میں ہنپھی چہاں  
مقdes مرکم اور اس کے اور بھی مقdes نچے کا آئیکون تھا جس کے سامنے وہ دراز از ہو گئی۔ وہ  
ہوا ایک کریچن سے بہت بڑی تھی دائیں بائیں طرف دو بڑی سی موم تباہ کا پہنچنے لگیں، جن  
سے آئیکون متحرک ہو گیا اور مقdes ماں، نچے کو گود میں لیئے کندن پُسکرانے اور اس سے بائیں  
کرنے لگی۔ جبھی فاور مائیکل آیا اور کندن کو میخ کی بھیڑوں میں شامل ہونے دیکھ کر مسکرا دیا لیکن  
جبھی اس کے ہونٹ بھیخ گئے اور اس نے نچے کا فاتحہ پڑھنے سے انکار کر دیا کیونکہ وہ  
کریچن ہوئے بغیر مر گیا تھا، شراب اور بانی کے ساتھ اس کا بقیہ نہ ہو سکا تھا...“

صبح کندن کو ایک اور ہی مسئلہ درپیش تھا۔ بچہ کریچن تھا اور نہ مسلمان... نہ ہندو  
... کون اسے اپنے قبرستان میں دفنانے دے گا۔ شہستان میں جلانے دے گا۔ ہر کوئی

ہی پوچھے گا۔ اس کے باپ کا نام کیا ہے؟

ماں نے بنگلے کے ایک کونے میں گڑھا کھو دیا۔ نچے کو دفنانے کے لیے بکھری گھستتی  
ہوئی چلی آئی۔ اس کے ہاتھ میں لکڑی کا ایک کھوکھا تھا جس میں مشریوں کے لیے شراب آٹی  
تھی اور جسے انہوں نے بتتے دیگر کے لیے استعمال کیا تھا اور ہی کھوکھا نچے کا تابوت بنا۔

کھو کئے میں بچے کو دلانے سے پہلے لکھی نے ماں سے کہا ۔۔۔ ماں! ۔۔۔ ایک بار اصرن  
ایک بار مجھے میرا بیٹا دے دے ۔۔۔ ”

ماں نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے بچے کو لکھی کے بڑے ہوئے ہاتھوں میں دے دیا۔ لکھی  
نے بچے کو گرد میں لے لیا۔ اس کی طرف دیکھا اور ایکاں کی جھک کر اس کے لڑکے پن کو چوم لیا۔  
اوہ پھر اسے ماں کو لوٹاتے ہوئے بولی ۔۔۔ ”لے ماں“

تاہوت کو گڑھے میں آتا کر اس پر مٹی ڈال گئی تزوہ بھی لمبواں کا ایک لہیڑا ایک ٹیڈہ بن گیا۔  
کندن ۔۔۔ کندن کہاں تھی؟ تھرڑی ہی دیر میں وہ بچے سے آتی ہوئی دکھائی دی۔ اس کے  
ہاتھ میں سُرخُو کا ایک بُوٹا تھا جسے وہ کہیں سے کھو دلانی تھی۔

”یہ اس پر لگاؤ، ماں“ وہ بولی۔

ماں نے دیکھا اور اس کے ہاتھ سے کھرنپی گر گئی۔ اس نے ایک تیز سی نظر سے  
سُرخُو ۔۔۔ یہ کلپس کے پرڈ کی طرف دیکھا اور پھر ڈبڈ باقی ہوئی آنکھوں میں ایک جست کے  
ساتھ اپنی میٹی سے پٹ گئی۔ ماں میٹی دنوں ایک مشترک غم میں رود رہی تھیں۔  
سب باقتوں سے فارغ ہو کر بیٹلے کے برآمدے میں بیٹھتے ہوئے میں نے گندن سے  
کہا ”بیٹا! جو ہوا سو ہوا، اب تو شادی کرے۔۔۔“

گندن ماں کی آنکھوں میں دھنستے ہوئے بولی ”جب ۔۔۔ جب تم نے کیوں نہ کی ماں؟“  
”تم جو تھیں ۔۔۔ میرا سب کچھ“ ماں نے جواب دیا اور نظریں بچالیں۔  
گندن نے ماں کے چہرے کو دنوں ہاتھوں میں لے لیا اور بولی ”ادھر میری طرف  
دیکھو، ماتی! میں شادی کر دیں گی!“

